علمی، تہذیبی و ادبی مجلّہ
گیسوئے اردو
(حیدر آباد کرناٹک کا ادب: سمینار نمبر)
UQAABI
مدیرِ اعلیٰ
پروفیسر محمد عبد الحمید اکبر
مدیر
ڈاکٹر منظور احمد دکنی
شعبۂ اردو و فارسی، گلبرگہ یونیورسٹی گلبرگہ

علمی، تہذیبی وادبی مجلّہ

گیسوئے اردو

(حیدرآباد کرناٹک کا ادب : سمینار نمبر)

مدیر اعلیٰ

پروفیسر محمد عبدالحمید اکبر

مدیر

ڈاکٹر منظور احمد دکنی

شعبۂ اردو و فارسی ، گلبرگہ یونیورسٹی ، گلبرگہ

۲۰۱۱ء

گیسوئے اردو

(حیدرآباد کرناٹک کا ادب :سمینار نمبر)

(G) محفوظ بحق: مدیر ''گیسوئے اردو'' شعبۂ اردو و فارسی، گلبرگہ یونیورسٹی، گلبرگہ

نام مجلّہ : **گیسوئے اردو**

مدیر اعلیٰ : پروفیسر محمد عبدالحمید اکبر

ڈین فیکلٹی آف آرٹس، صدر شعبۂ اردو و فارسی، گلبرگہ یونیورسٹی، گلبرگہ

مدیر : ڈاکٹر منظور احمد دکنی، م۔ لیکچرار، شعبۂ اردو و فارسی، گلبرگہ یونیورسٹی، گلبرگہ

ماہ و سنہ اشاعت: اپریل ۲۰۱۱ء

کمپوزنگ : حلیم اطہر ، عتیق اجمل

طباعت : ڈیجیٹل آفسیٹ پرنٹنگ پوائنٹ گلبرگہ، 9964709481

ناشر : شعبۂ اردو و فارسی، گلبرگہ یونیورسٹی، گلبرگہ

سرورق : سید عبدالحکیم ساغر، گلبرگہ

تعداد : ۵۰۰

قیمت : ۲۵۰ روپے

کتاب ملنے کے پتے:

شعبۂ اُردو و فارسی، گلبرگہ یونیورسٹی، گلبرگہ

مکتبہ رفاہ عام، روضہ بزرگ، درگاہ حضرت خواجہ بندہ نواز، گلبرگہ۔۵۸۵۱۰۴

برکاتی بک ڈپو، عقب خواجہ بازار، روضۂ خرد، گلبرگہ۔۵۸۵۱۰۴

GESU-E-URDU

Cheif Editor

Prof. M.A Hameed Akber

Editor

Dr. Manzoor Ahmed Deccani

PP:232 Month & Year of Publication:April-2011

Price: Rs. 250/-

Publisher: **Dept. of Urdu & Persian**

Gulbarga University, Gulbarga - 585106

فہرست

پیغامات : پروفیسر ای۔ ٹی۔ پُپیا، وائس چانسلر، گلبرگہ یونیورسٹی، گلبرگہ

: ڈاکٹر سید گیسودراز خسرو حسینی، سجادہ نشین درگاہ حضرت خواجہ بندہ نواز، گلبرگہ

۷۸۶
۶۹۲

روضۂ منوّرہ بزرگ

گلبرگہ، کرناٹک ۵۸۵۱۰۴
فون : ۲۰۰۷۲ - ۲۲۵۱۳ - ۲۰۵۵۸

بخدمت شریف عالی جناب مکرمی ڈاکٹر محمد عبدالحمید اکبر صاحب زاد محبتہ !
صدر شعبۂ اردو و فارسی گلبرگہ یونیورسٹی گلبرگہ

السلام علیکم رحمۃ اللہ وبرکاتہ ۔

آپ کا مرسلہ مکتوب مورخہ ۱۲ر نومبر ۲۰۰۸ء باصرہ افروز ہوا۔ شعبۂ اردو و فارسی گلبرگہ یونیورسٹی گلبرگہ کے زیر اہتمام دو روزہ سمینار بعنوان ''حیدرآباد کرناٹک کا ادب'' انعقاد عمل میں لایا جارہا ہے یہ ہم سب کیلئے ایک خوش آئیند بات ہے جس سے زبان اردو کو مزید فروغ اور عوام الناس میں شعور بیدار ہوگا۔ نیز اس سلسلہ میں یہ میں ضرور کہوں گا کہ اردو صوفیہ کرام کی زبان رہی ہے جس کی ابتداً خانقاہوں سے ہوئی ہے اور ترقی وترویج کیلئے انہوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑا۔

سمینار میں آپ نے مجھے یاد کیا جس کا میں شکریہ ادا کرتا ہوں عرس شریف (۱۵/۱۶/۱۷ ار نومبر ۲۰۰۸ء) حضرت خواجہ گیسودراز بندہ نوازؒ کی مصروفیات کی بناء سمینار میں شرکت سے قاصر ہوں جس کیلئے معذرت خواہ ہوں۔ میری نیک تمنائیں اور دعائیں آپ حضرات کے ساتھ شامل حال رہیں گی۔

حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کے وسیلہ سے میں بارگاہ ایزدی میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اردو زبان کی ترویج اور اس کی خدمت کا ہم سب کو موقع عنایت فرمائے۔ آمین۔

م ۱۳ر نومبر ۲۰۰۸ء

سید شاہ گیسودراز خسرو حسینی
سجادہ نشین درگاہ حضرت خواجہ گیسودراز بندہ نوازؒ
گلبرگہ شریف

ಗುಲಬರ್ಗಾ ವಿಶ್ವವಿದ್ಯಾಲಯ

ಜ್ಞಾನಗಂಗಾ - ಗುಲಬರ್ಗಾ-೫೮೫ ೧೦೬ - ಕರ್ನಾಟಕ
ದೂರವಾಣಿ : ಕ. ೦೮೪೭೨-೨೬೩೨೦೦ - ೦೮೪೭೨-೨೬೩೨೦೧
ನಿ. ೦೮೪೭೨-೨೬೩೨೧೧ - ಫ್ಯಾಕ್ಸ್ : ೦೮೪೭೨-೨೬೩೨೦೫
ಇ-ಮೇಲ್ : profetputtaiah@rediffmail.com - vcgug@rediffmail.com
ವೆಬ್ : www.gulbargauniversity.kar.nic.in - http://stg1.kar.nic.in/newgul

GULBARGA UNIVERSITY

"JNANA GANGA"
GULBARGA-585 106 - KARNATAKA - INDIA
Ph. : Off. 08472-263200 - 263201 - Resi. 263211 - Fax : 263205
Email : profetputtaiah@rediffmail.com - vcgug@rediffmail.com
web: www.gulbargauniversity.kar.nic.in - http://stg1.kar.nic.in/newgul

Professor E. T. PUTTAIAH
M.Sc.,Ph.D.

Vice-Chancellor

MESSAGE

I am glad to know that the Department of Urdu & Persian Gulbarga University Gulbarga is going to publish a cultural, academic & literary magazine entitled " **Gesu-e-Urdu** " under the headship of Prof. M.A. Hameed, Dean Faculty of Arts Gulbarga University Gulbarga.

I am also happy to know that the Department has organized a Two – Day State Level Urdu Conference in November 2008 on the topic "The Contribution of Urdu Language & Literature in Hyderabad Karnatak Region". Hyderabad Karnatak is a region of saints and sufies and the richest cultural heritage, national integrity and the centre of Urdu language & Literature. This magazine consists of the critical & literary articles which were presented in the above conference.

I hope that the modern writers will keep up the literary & cultural tradition of this region. I appreciate and congratulate the faculty members, research scholars and students of the Department for this effort and expect the same in future.

27.6.11

Prof. E.T. PUTTAIAH

اداریہ

شعبۂ اردو و فارسی گلبرگہ یونیورسٹی کے قیام کے ساتھ ہی بصورتِ مجلّہ ادبی صحافت کی ابتداء ہوئی۔ پہلی مرتبہ پروفیسر عبدالرزاق فاروقی کے زیرِ نگرانی مجلّہ ''فکرِ نو'' شائع ہوا۔ اس مجلّہ کی پانچ جلدیں منظرِ عام پر آسکیں۔ اس کے بعد پروفیسر قیوم صادق کی نگرانی میں مجلّہ ''نوائے گلبرگہ'' کے نام سے چند ایک مجلّے شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر لئیق صلاح کے دورِ صدارت میں ''ارمغان'' نامی مجلّہ شائع ہوا۔ پروفیسر قیوم صادق جب ڈین فکلٹی آف آرٹس کی خدمات انجام دے رہے تھے تو اس وقت آخری مرتبہ ۱۹۹۸ء میں ''نوائے گلبرگہ'' (قدیم و جدید ادب نمبر) شائع ہوا تھا۔ تیرہ سال کے طویل عرصے بعد پروفیسر عبدالحمید اکبر ڈین فکلٹی آف آرٹس و صدر شعبۂ اردو و فارسی جن کی ادب اور ادبیات سے والہانہ دلچسپی کے سبب شعبۂ اردو و فارسی کا ترجمان مجلّہ ''گیسوئے اردو'' کا پہلا شمارہ پیش کیا جارہا ہے۔ جس میں شعبۂ اردو و فارسی، گلبرگہ یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام منعقدہ دو روزہ ریاستی اردو کانفرنس بعنوان ''حیدرآباد کرناٹک کا ادب'' (۱۳۔۱۴ نومبر۔ ۲۰۰۸) میں پڑھے گئے مقالے شامل ہیں۔ ریاستوں کی تنظیم جدید کے بعد گلبرگہ کا تعلق کرناٹک سے ہوا اور گلبرگہ، بیدر اور رائچور کے علاقے حیدرآباد کرناٹک کہلائے گئے۔ ۱۹۵۶ کے بعد یہ علاقے اپنی ادبی روشنی کی باعث آسمانِ ادب پر آج بھی جگمگا رہے ہیں۔

شعبۂ اردو و فارسی میں ۲۰۰۳ء سے ''حیدرآباد کرناٹک کا ادب'' ایک مستقل پرچہ کے طور پر شاملِ نصاب ہے طلبہ کو چونکہ اس موضوع کے تحت مواد حاصل کرنے میں دشواریاں پیش آرہی تھیں لہٰذا اس بات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے پروفیسر عبدالحمید اکبر ڈین فکلٹی آف آرٹس و صدر شعبۂ اردو و فارسی، گلبرگہ یونیورسٹی، گلبرگہ نے اس سمینار کا انعقاد کروایا تاکہ اس طریقۂ کار سے نہ صرف طلبہ مستفید ہوسکیں گے بلکہ ہمارے علاقے کی ادبی تاریخ کے اس عظیم

سرمائے کے تحفظ اور تدوین وترتیب میں بھی مدد مل سکے گی اوراس طرف شعبہ اردو کا یہ اقدام مستحسن سمجھا جائے گا۔ان مقالہ جات کے مطالعہ سے ہم اپنے علاقے کے علم وادب اوراس کے احوال وآثار کا باآسانی اندازہ قائم کرسکتے ہیں۔

زیرِ نظر مجلّہ کے بعض مقالوں کو طوالت کی باعث انہیں مختصر کیا گیا ہے اس کے علاوہ، ڈاکٹر طیب انصاری، ڈاکٹر مجتبی حسین اور نثار احمد کلیم، جیسے اس علاقے کے اہم قلم کاروں کے مضامین بھی مجلّہ میں شامل کئے گئے ہیں۔کمپوزنگ کے بعد، ڈاکٹر ماجد داغی، جزووقتی لیکچرار، شعبہ اردووفارسی نے مقالوں کی مسودہ بینی کرتے ہوئے نظرِ ثانی کی ہے۔جس کے لئے ہم ان کے شکرگزار ہیں۔اس کے باوصف اگرکہیں کوئی کمی رہ گئی ہوتو ہم اس کے لئے معذرت خواہ ہیں۔

متذکرہ اردو کانفرنس کے انعقاد کے سلسلہ میں اساتذہ، ریسرچ اسکالرس اور طلبہ ہمارے خصوصی شکریے کے مستحق ہیں جن کی کاوشوں سے کانفرنس کامیاب ہوسکی۔اس مجلّہ میں شامل تمام مقالہ نگاران کے علاوہ مجلسِ ادارت، مجلسِ اشاعت اور دیگر معاونین کے بھی ہم سپاس گزار ہیں۔

مدیر

حیدر آباد کرناٹک کا ادب

کلیدی خطبہ : وہاب عندلیب
ڈائریکٹر آف اسٹڈیز، خواجہ ایجوکیشن سوسائٹی، گلبرگہ

حیدر آباد کرناٹک کے موجودہ اضلاع گلبرگہ، بیدر، رائچور بشمول کپّل سقوط حیدر آباد سپٹمبر 1948ء تک حکومتِ آصفیہ کے زیرِ نگیں رہے۔ نومبر 1956ء کی لسانی تقسیم کی باعث وہ ریاست میسور (کرناٹک) کا حصہ بن گئے۔ سلاطین بہمنیہ نے گلبرگہ میں 1347ء تا 1429ء اور بیدر میں 1429ء تا 1525ء حکومت کی۔ اس دور میں گلبرگہ اور بیدر دکنی ادب کے اہم مرکز رہے۔

بہمنی سلاطین میں فیروز شاہ بہمنی بہ لحاظ علم و دانش بلند درجہ پر فائز تھا۔ وہ کئی زبانیں جانتا تھا۔ فارسی کے علاوہ اُس نے دکنی میں بھی شعر کہے ہیں۔ فارسی میں عروجی اور دکنی میں فیروزی تخلص کرتا تھا۔ بہمنی دور کے جو ادبی نمونے دستیاب ہیں ان کا سرمایہ بہت محدود ہے۔ حضرت خواجہ بندہ نوازؒ، فیروز شاہ بہمنی کے عہد میں 1400ء میں گلبرگہ تشریف لائے۔ حضرت کا شمار دکنی کے اولین شعراء میں ہوتا ہے دکنی میں پہلی نعت ان کی تحریر کردہ ہے۔ انھوں نے راگ راگنیوں، لوریوں، گیتوں اور چکی ناموں کی صورت میں تصوف کے مسائل کو پیش کیا۔ انھوں نے سہیلا یعنی خوشی کے گیت بھی لکھے یہ گیت آج بھی روضہ حضرت بندہ نوازؒ میں بند سماع میں گائے جاتے ہیں۔

دکنی میں بعض نثری رسائل بھی حضرت سے منسوب کئے گئے مگر جدید تحقیق کے مطابق ''معراج العاشقین'' حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کی تصنیف نہیں بلکہ گیارھویں صدی کے اواخر کے ایک صوفی بزرگ مخدوم شاہ حسینی کی کاوش ہے۔ 1429ء میں بہمنی پایۂ تخت گلبرگہ سے بیدر

منتقل ہوا تو زبان و ادب کے شیدائی بیدر میں اکٹھا ہوئے ایرانی شاعر شیخ آذری نے بہمنی خاندان کی منظوم تاریخ ''بہمن نامہ'' دکنی میں لکھی۔ نظامی بیدری بھی سلطان احمد شاہ بہمنی کا درباری شاعر تھا۔ جس نے 1421ء تا 1435ء کے درمیان رومانی موضوع پر ایک مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' لکھی۔ سلطان محمد شاہ اور سلطان محمود شاہ بہمنی کے عہد میں مشتاق اور لطفی جیسے سخن گو قصیدہ گوئی اور غزل گوئی میں امتیاز رکھتے تھے۔ ان دونوں کا ہم عصر فیروز تھا۔ فیروز ابراہیم قطب شاہ کی دعوت پر گولکنڈہ منتقل ہوا۔ گولکنڈہ کے ممتاز شعراء وجہی اور ابن نشاطی نے فیروز کو اپنا اُستاد تسلیم کیا۔ فیروز کی مثنوی ''پرت نامہ'' اہمیت کی حامل ہے۔ شاہ اشرف الدین اشرف بیابانی (پیدائش 1458ء) نے منظوم لغت ''واحد باری'' مرتب کی اور 1503ء میں مثنوی ''نوسرہار'' تصنیف کی اس کا موضوع شہادت امام حسین اور واقعات کربلا ہے۔ بیدر ہی کے ایک اور شاعر قریشی نے مثنوی ''بھوگ بل'' لکھی جو جنسیات کے موضوع پر اُردو کی اولین مثنوی ہے۔

سیوا گلبرگہ کا باشندہ تھا اس نے سترھویں صدی میں فارسی مثنوی روضتہ الشہدا کا اُردو نثر میں ترجمہ کیا تھا۔ اس نے مرثیے بھی لکھے۔ اسی صدی کے ایک اور ممتاز صوفی شاعر حضرت محمود بحری (متوفی 1717ء) گوگی تعلقہ شاہ پور ضلع گلبرگہ کے متوطن تھے۔ دکنی شاعری میں مثنوی ''من لگن'' مثنوی ''بنگاب نامہ'' اور غزلیات کا ایک دیوان اُن کی یادگار ہے۔ حضرات نور دریا (رائچور) اور عشقی (بیدر) کا کلام بھی دستیاب ہے۔

جدوجہد آزادی کے دوران گلبرگہ کے بعض ادباء و شعراء نے ریاست حیدرآباد کی آزادی و استقرار تو بعض نے ملک کی آزادی کی جدوجہد میں حصہ لیا۔ یہ ادبا و شعراء کم و بیش گلبرگہ کلب سے وابستہ تھے۔ جو 1944ء میں قائم ہوا تھا۔ اس ادارہ کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اس ادارہ سے ابراہیم جلیس، فضل گلبرگوی، سلیمان خطیب، شور عابدی، عثمان صحرائی، حسن خان نجمی، سحر قادری وغیرہ وابستہ تھے۔ محبوب حسین جگر، لطیف ساجد اور نظر حیدرآبادی کبھی کبھار کلب کی ادبی محفلوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ محبوب حسین جگر نے ابتداء میں شاعری کی اور افسانے بھی

لکھے مگر انھوں نے جب صحافت کو اپنایا تو وقف برائے روزنامہ ''سیاست حیدآباد'' ہوگئے۔ اور بہ حیثیت نائب مدیر اس سے اپنی آخری سانس تک وابستہ رہے۔ ابراہیم جلیس نے افسانے، انشائیے، خاکے، ڈرامے اور صحافتی کالم لکھے۔ رپورتاژ کے علاوہ ایک ناول (چور بازار) بھی تحریر کیا۔ وہ ملک کی تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے اور لگ بھگ دو درجن کتابیں یادگار چھوڑیں۔ فضل گلبرگوی، نیاز گلبرگوی اور عثمان صحرائی بھی پاکستان منتقل ہوگئے۔ فضل گلبرگوی کا شعری مجموعہ ''روئے گل'' 1982ء میں گلبرگہ ہی سے شائع ہوا۔ نیاز گلبرگوی کی ادبی زندگی کا آغاز بیک وقت شاعری و افسانہ نگاری سے ہوا ان کے افسانے حیدآباد دکن کے روزنامے ''میزان'' میں شائع ہوا کرتے تھے۔ نیاز گلبرگوی کا پہلا شعری مجموعہ ''حرف وفا'' 1983ء میں گلبرگہ ہی سے شائع ہوا اور اسی شہر میں اس کی رسم اجراء انجام پائی۔ ان کا دوسرا شعری مجموعہ ''حرف نیاز'' 1999ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ دکن کے ممتاز و موقر شاعر سلیمان خطیب اور شور عابدی کو اپنی مٹی ہی راس آئی انھوں نے ترک وطن نہیں کیا۔ خطیب صاحب کا شعری مجموعہ ''کیوڑے کا بن'' ان کے جلسہ اعتراف خدمات کے موقع پر 1975ء میں شائع ہوا۔ تاحال سلیمان خطیب یادگار ٹرسٹ سے اُس کے کئی اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ شور عابدی کا مجموعہ کلام ''خم کاکل'' ان کی وفات کے بعد 1975ء میں شائع ہوا۔ عثمان صحرائی نے ابتدا میں شاعری کی پھر صحافت کو اپنایا۔ ان کے ہفت روزہ ''ہمدرد'' کو گلبرگہ کی اردو صحافت کا نقش اول قرار دے سکتے ہیں۔

ملک کی تقسیم کے ساتھ ہی گلبرگہ کلب کا شیرازہ بکھر گیا تاہم انٹرمیڈیٹ کالج گلبرگہ کے اساتذہ و طلبہ کے علاوہ شہر میں منعقدہ ادبی محفلوں و مشاعروں کے باعث ادبی فضا قائم تھی۔ عبدالرزاق چاق گلبرگوی، اسمٰعیل شریف ازل،، تاب سہروردی، عطا کلیانوی، سلیمان خطیب، شور عابدی، خیر بندہ نوازی، غیرت صدیقی، حکیم بزمی، مختار ہاشمی، غلام علی اثر، ڈاکٹر فتح محمد فاتح، حافظ عبدالرشید، منہاج الدین شوکت، حبیب اللہ وفا، رشید بیدری، محمد حسین اختر، وزیر علی سہروردی، فخرالدین ارمان، قمر انصاری، سحر قادری، عبداللہ تمنا، محمود آغوش، بے ڈھب وغیرہ ہم کی وجہ سے

شعری محفلیں آباد تھیں۔ان میں سلیمان خطیب اور شور عابدی کے شعری مجموعوں کا ذکر آ چکا ہے۔ مابا قی شعراء میں مخدوم علی تاب سہروردی کے شعری مجموعے ''طابِ تاب''،''شہابِ تاب''،''خطاب طاب'' شائع ہو چکے ہیں ۔اسی طرح چاق گلبر گوی کا شعری مجموعہ ''باقیات چاق''مختار ہاشمی کا مجموعہ شعلہ رقصاں اور منہاج الدین شوکت کا کلیات شائع ہو چکا ہے۔یہاں محبوب حسین جگر،ابراہیم جلیس اور نیاز گلبر گوی کے بعد نثر نگار خال خال ہی تھے اس جانب غلام حسین ساحل اور ڈاکٹر شکیب انصاری نے توجہ کی۔غلام حسین ساحل نے استعداد کے باوجود بہت کم لکھا۔البتہ شکیب انصاری نے 1955ء میں اپنے تخلیقی افسانوں سے متاثر کیا۔بعدازاں شاہد فریدی نے بھی اس صنف میں طبع آزمائی کی اور بہت جلد ماہنامہ ''بیسویں صدی'' کے قارئین کے مقبول افسانہ نگار بن گئے۔

1956ء کی لسانی تقسیم کے بعد کئی ادباء وشعراء گلبرگہ میں یکجا ہوئے ان میں مبارز الدین رفعت ،عاقل علی خاں،عبدالکریم کاظمی ،غیرت صدیقی ،ڈاکٹر مدنا منظر،عبدالقادر ادیب،حمید الماس ،صابر شاہ آبادی ،سرور مرزائی ،عبدالرحیم آرزو،آعظم اثر،قاضی حسام الدین فاضل ،عبدالستار خاطر، رشید احمد رشید ،رحمٰن جامی وغیرہ قابل ذکر ہیں ۔1955ء میں گلبرگہ ہی سے ایک ادبی ماہنامہ ''گلبرگ'' کا اجراء عمل میں آیا جس کے مدیر حسام صدیقی اور معاون مدیر اکرام صہبائی اور عظیم یوسف زئی تھے۔اس ماہنامے کے صرف چار شمارے ہی شائع ہوئے۔

فبروری 1960ء میں بارگاہ بندہ نواز کا علمی ،ادبی و مذہبی ماہنامہ ''شہباز'' کا اولین شمارہ منظر عام پر آیا۔پروفیسر مبارز الدین رفعت اور حکیم لئیق احمد نعمانی اس کے مجلس ادارت میں شامل تھے۔یہ 15 سال تک ماہنامہ رہا اور اب سالنامہ کی شکل میں شائع ہو رہا ہے۔

عصری تحریکوں اور رجحانات نے بھی حیدرآباد کرناٹک کے ادب کو متاثر کیا آزادی سے چند سال قبل دکن میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا تو اس علاقے کے ادباء وشعراء بھی متاثر ہوئے۔ابراہیم جلیس ،سلیمان خطیب ،شور عابدی ،رشید جاوید،قادر جاوید،سید مجیب الرحمٰن ،

نجم الثاقب شحنہ، مجتبیٰ حسین، وہاب عندلیب، اسمٰعیل بدر، تنہا تماپوری، حمید الماس، صلاح الدین نیر، محسن کمال، قیصر رزاق، رئیس اختر، قیصر رحمٰن، سلام نورس، جلیل تنویر کی تحریروں میں ترقی پسند خیالات کا پرتو ملتا ہے۔ بعدازاں حمید الماس پر حلقۂ ارباب ذوق کا اثر غالب رہا۔

1960ء کے بعد ''شب خون'' کی تحریروں اور احمد ہمیش کے افسانوں کے زیر اثر حیدرآباد کرناٹک کا ادب جدیدیت کی لہر سے متاثر ہوا۔ اکرام باگ، حمید سہروردی، ریاض قاصدار، بشیر باگ، علیم احمد، ناظم خلیلی اور نجم باگ وغیرہ کی افسانوی تحریریں جدید معیاری رسائل میں جگہ پانے لگیں۔ اکرام باگ اور حمید سہروردی کی تجریدی وعلامتی افسانوں نے برصغیر کے نقادوں کو متوجہ کیا۔ لطیف، حکیم شاکر، حامد اکمل اور خالد سعید نے بھی افسانے لکھے مگر افسانہ نویسی اُن کی پہلی ترجیح نہیں رہی۔ سب ہی نے شاعری پر توجہ مرکوز کی ان میں حکیم شاکر اور حامد اکمل نے منفرد شعری اظہار کے ساتھ ساتھ صحافت سے بھی رشتہ استوار کیا۔ حکیم شاکر اور حامد اکمل اپنی ذات میں اُردو کی ایک تحریک اور انجمن ہیں۔ جدیدیت کے علمبردار شمس الرحمٰن فاروقی نے ''نئے نام'' کے عنوان سے جدید شعراء کا جو انتخاب شائع کیا تھا۔ اس میں حیدرآباد کرناٹک سے صرف حمید الماس شامل تھے۔ جدیدیت کو اپنانے میں اس علاقے سے محب کوثر، خمار قریشی، جبار جمیل، تنہا تماپوری، رشید ارومانی، وحید واجد، نصیر احمد نصیر، حکیم شاکر، حامد اکمل اور صابر فخر الدین پیش پیش تھے۔ خمار قریشی تخلیقی تہہ داری اور نئے لب ولہجہ کے باعث ممتاز تھے۔ جبار جمیل نے منفرد نظم گو اور کھرے نقاد و مبصر کی حیثیت سے اپنی پہچان بنائی۔ خالد سعید نے اپنی فطری ذہانت اور جودتِ طبع سے متاثر کیا۔

1980ء کے آس پاس فکشن و شاعری میں جو نام اُبھرے ان میں صبیح حیدر صبیح، وحید انجم، ماجد داغی، امجد جاوید، کوثر پروین، میر شاہ نواز شاہین، خالدہ بیگم، منظور وقار، نورالدین نور، رزاق اثر، خلیل مجاہد، مظہر مبارک، حشمت فاتحہ خوانی، ماجد شمیم، اکرم نقاش، خورشید وحید، ظہیر بابیار، فضل افضل، قاضی انور، وقار ریاض، صادق کرمانی، امجد علی فیض، فاروق نشتر، مختار احمد منو، عبید اللہ،

سعید عارف اور حنیف قمر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

خواتین شعراء میں حمیدہ بانو مخفی، سعیدہ، راحت النساء، راحت کے بعد صغریٰ عالم ایک منفرد شاعرہ کے روپ میں ابھریں ان کی شاعری کے نصف درجن مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ جدیدیت کے دور میں ترسیل کے المیے کے بعد جس رجحان کو تقویت پہنچی اُسے مابعد جدیدیت یا جدیدیت کا دوسرا روپ کہہ سکتے ہیں۔ جن سے ادب میں بے ماجرائی اور بے سمتی کا دور ختم ہو گیا ہے۔ اس تناظر میں حیدرآباد کرناٹک کے ادب کا ایک سرسری جائزہ لیں تو مجھے یہ کہتے ہوئے مسرت ہوتی ہے کہ اس علاقے میں ادب کی مختلف اصناف کی آبیاری کی وجہ سے ہمارے فنکار نہ صرف کرناٹک بلکہ سارے ملک اور بیرون ملک اپنی خاص پہچان رکھتے ہیں۔ شکیب انصاری، شاہد فریدی،، اکرام باگ، ریاض قاصدار، حمید سہروردی، جلیل تنویر، کے بعد کوثر پروین، وحید انجم، اعظم عرفان، ناظم خلیلی اور میر احیدر وغیرہ کے نام فکشن میں نمایاں ہیں۔ شعر گوئی میں شور عابدی، رشید احمد رشید بیدری، حمید الماس،، راہی قریشی، وحید واجد، صلاح الدین نیر، رئیس اختر، صابر شاہ آبادی، وقار خلیل، عبدالقادر ادیب، تنہا تماپوری، ، خمار قریشی، نصیر احمد نصیر، جبار جمیل، محب کوثر، صابر فخرالدین، رزاق اثر، حامد اکمل، خالد سعید، صغریٰ عالم، ماجد داغی، اکرم نقاش، وغیرہ امتیاز رکھتے ہیں۔ مزاحیہ شاعری میں سلیمان خطیب کے علاوہ دیسی بخاری، ڈھکن رائچوری، بگڑ رائچوری اور پرویز دھروری وغیرہ کو خصوصیت حاصل ہے۔

جہاں تک فکاہیہ نثر نگاری کا تعلق ہے ابراہیم جلیس، سلیمان خطیب، عاقل علی خاں، زینت ساجدہ، ڈاکٹر لئیق صلاح، مجتبیٰ حسین، حلیمہ فردوس، روف خوشتر، ڈاکٹر شمیم ثریا، خالدہ بیگم، منظور وقار اور فاروق نشتر وغیرہ نے اپنے جوہر دکھائے۔

تحقیق و تنقید کے شعبہ میں سید مبارز الدین رفعت، پروفیسر محمد ہاشم علی، ڈاکٹر قیوم صادق، طیب انصاری، ڈاکٹر لئیق صلاح، شہناز سلطانہ، پروفیسر رزاق فاروقی، نثار احمد کلیم، پروفیسر خالد سعید، ڈاکٹر اکرام باگ، سید شاہ خسرو حسینی، ڈاکٹر حمید سہروردی، پروفیسر عبدالحمید اکبر، ڈاکٹر حشمت فاتحہ خوانی،

ملنسار اطہر احمد، ضیا، مجاہد، عزیز اللہ سرمست، وہاب عندلیب، فضل الرحمٰن شعلہ، ڈاکٹر انیس صدیقی، ڈاکٹر ماجد داغی، ڈاکٹر منظور احمد دکنی، اور عبدالرب استاد وغیرہ امتیاز رکھتے ہیں۔

خاکہ نگاری میں مجتبیٰ حسین، ڈاکٹر طیب انصاری، وہاب عندلیب، امجد علی فیض اور فوزیہ چودھری کے علاوہ ڈاکٹر انیس صدیقی، جلیل تنویر اور مختار احمد منو کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

جاریہ صدی کے پہلے دہے میں گلبرگہ کے قلمکاروں کے دو انتخاب منظرِ عام پر آئے۔ پہلا ''افلاک'' (2003) مرتبین اکرم نقاش، ڈاکٹر انیس صدیقی، دوسرا ''آفاق'' (2005) ترتیب و جائزہ ڈاکٹر وحید انجم، واجد اختر صدیقی۔ یقیناً ''افلاک'' کڑا انتخاب ہے۔ مگر اس میں ایک دو اور نام شامل کئے جا سکتے تھے۔ دوسرا انتخاب ''آفاق'' سے ایک دو نام آسانی سے خارج کئے جا سکتے ہیں۔ بہر حال ان دونوں کے منظرِ عام پر آنے سے اس علاقے کی ادبی سرگرمیوں اور ان کے معیار و رفتار کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

ہماری نئی نسل بھی پُر عزم و حوصلے کے ساتھ میدان ادب میں وارد ہوئی ہے اور نہایت تیز رفتاری کے ساتھ اپنا مقام بنا رہی ہے۔ ان میں فضل افضل، جوہر تماپوری، یوسف رحیم بیدری، عبدالقدیر قدیر (کپل) مقبول احمد مقبول، شمس الدین حکیم، ڈاکٹر غضنفر اقبال، اطہر معز، واجد اختر صدیقی، ڈاکٹر رفیق سوداگر، حسن محمود، راشد ریاض، عتیق اجمل، ناصر عظیم، عارف مرشد، سلطان فرحت وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

مجھے اُمید ہے کہ وقت کی رفتار کے ساتھ قدم بہ قدم ہمارا یہ کاروانِ ادب منزل کی جانب رواں دواں رہے گا۔ حیدر آباد کرناٹک کا یہ علاقہ ریاستی۔ ملکی اور عالمی سطح پر فکر و خیال کی نئی شمعیں جلائے گا۔ آخر میں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ علاقائی ادب کی اپنی اہمیت و انفرادیت ہوتی ہے۔ جس سے انکار ممکن نہیں۔ ان دنوں ملک کی ہر ریاست اور ریاست کے مختلف علاقوں میں تخلیق پانے والے ادب اور ان کی اصناف کا محاسبہ و محاکمہ کیا جا رہا ہے۔ کیا جانا ضروری بھی ہے۔ اس طرح کے تجربوں اور محاکموں سے نہ صرف ادب فروغ پا رہا ہے بلکہ وہ علاقائی سرحدوں

کو بھی پھلانگ رہا ہے۔ پروفیسر عبدالحمید اکبر صدر شعبہ اُردو و فارسی و ڈین فکلٹی آف آرٹس، جامعہ گلبرگہ اور اُن کے معاونین مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس جانب پہل کی اور اس علاقے کے مختلف اصنافِ ادب کا جائزہ لیا۔

(۱۳ر نومبر ۲۰۰۸ء)

حیدر آباد کرناٹک میں اردو ادب

(آزادی سے پہلے)

ڈاکٹر طیب انصاری (مرحوم)

موظف پرنسپال، گورنمنٹ فرسٹ گریڈ کالج، کملاپور، ضلع گلبرگہ

سنہ 1347 عیسوی میں جب علاوالدین حسن نے گلبرگہ کی بنیاد ڈالی تو زبان، ادب اور تہذیب اپنی انفرادیت کو منوانے لگے تھے۔ مگر اس کے یہ معنیٰ نہیں کہ سلطنت بہمنیہ سے قبل دکن اور خصوصاً گلبرگہ اسلامی تہذیب سے آشنا تھا۔ ایسا نہیں ہے! جس طرح سندھ اور پھر پورے ہندوستان میں تُرک سپاہیوں کی آمد سے قبل صوفیہ کرام نے اپنی تعلیمات سے انسانی اقدار کا پرچار کرنا شروع کر دیا تھا، اسی طرح دکن میں علاءالدین خلجی اور ملک کافور سے قبل اولیاء اللہ دینِ حق کی تبلیغ اور چھوت چھات کے خلاف وحدت انسانی کے تصور کو عام کر رہے تھے۔ چنانچہ حضرت صوفی سرمست (سگر ضلع گلبرگہ) حضرت شیخ منہاج الدین انصاری تمیمیؒ (گلبرگہ) حضرت شیخ علاءالدین جنیدیؒ (کرچی) بلگام، حضرت رومیؒ (دولت آباد) شاہ جلال الدین گنج رواںؒ دولت آباد حضرت دادا حیات قلندرؒ (چکمگلور) اور حضرت قادر ولیؒ (ناگور) نے اپنے قول و عمل سے سلامتی و اُخوت کا پیام دیا۔ اصل میں ہم تہذیب و تمدن اور زبان و ادب کا رشتہ بادشاہوں کے ناموں سے نتھی کرتے ہیں، حالانکہ تہذیب، تمدن اور ادب کی داستان ہندوستان میں اُن بزرگانِ دین کی خانقاہوں سے جڑی ہوئی ہے لیکن جن کی گنبدوں کے کلس آج بھی سر بلند ہیں، اور عظمت الٰہی کی گواہی دے رہے ہیں۔ گلبرگہ، میرے اس دعوے کی سب سے اچھی دلیل ہے۔ ایک طرف شاہان گلبرگہ کی بے آب و رنگ گنبدیں ہیں اور دوسری طرف خواجۂ دکنؒ کی اجلی گنبد روشنی و نور کا سرچشمہ ہے۔ خود سلطنتِ بہمنیہ کا قیام بوریا نشینوں کی دعا اور ان کی پیشن گوئی کا مظہر ہے۔

حضرت نظام الدین اولیاؒ ، نے پیش گوئی فرمائی اور حضرت جنیدیؒ نے اپنے دست مبارک سے حَسن کے سر پر تاج شاہی رکھا اور دعا دی حضرت جنیدیؒ ضعیف ہو چکے تھے۔ جب ملکُ المشائخ ،قطبِ دکن حضرت شیخ مخدوم علاء الدین انصاری قدس سرۃ العزیز (۷۶۱ھ) میں گلبرگہ اور پھر الند تشریف لائے۔ ملک سیف الدین غوری وکیل مطلق مرید وخلیفہ اور شہزادہ محمود شاہ (جو بعد میں پانچویں بہمنی حکمران کی حیثیت سے تخت نشین ہوا) آپ کے حلقۂ ادارت میں داخل ہوئے۔ اس زمانے میں خانقاہ الند سیاست و معاشرت اور مذہب وادب کا بڑا مرکز بن گئی تھی۔ مگر گلبرگہ کی تہذیب و سیاست کو جس ذات عالی مرتبت نے زیادہ متاثر کیا اور بساطِ سیاست اُلٹ کر رکھدی وہ حضرت بندہ نواز گیسودرازؒ کی ذاتِ مبارک تھی (گلبرگہ میں آمد: ۸۰۳ھ) ان کے خانوادے کے بزرگ خصوصاً سید اکبر حسینیؒ اور حضرت سید شاہ من اللہ حسینیؒ صاحبِ تصنیف بزرگ گذرے ہیں۔ حضرت بندہ نواز گیسودرازؒ مشائخ چشت میں ''سلطانُ القلم'' کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپؒ عربی وفارسی میں حد درجہ کمال رکھتے تھے۔ جہاں تک اردو یا دکنی کا تعلق ہے، یہ خیال عام ہے کہ آپؒ دکن کے اولین نثر نگار اور شاعر ہیں۔

بارہویں صدی ہجری کے بزرگ اور راقم الحروف کے جد حضرت رشید الدین انصاریؒ (۱۱۸۷ھ) نے اپنے وصیت نامے میں حضرت قطبِ دکنؒ کی کوئی بارہ تصانیف کا ذکر کیا ہے جو فارسی وعربی میں تسوید وتحریر کیے گئے ہیں۔ البتہ راقم الحروف کے جدِ امجد حضرت شیخ کلمۃ اللہ انصاری، المعروف بہ حضرت میاں محمود انصاریؒ کی تقریباً دس تصانیف ہیں جن میں پانچ کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ دکنی کے کارنامے ہیں۔ حضرت دادا پیر (دادے پیرؒ) کی تصانیف ''شرحِ آدابُ المریدین'' اور ''سیرۃ النبی ﷺ'' کا آپ نے ہندی اور دکنی میں ترجمہ فرمایا۔ آپ نے مہا گرو لاڈلے مشائخ کی کتابوں اور سوامی لنگیا کی تاریخ چالوکیہ کا کنڑی اور مرہٹی سے فارسی ودکنی میں ترجمہ کیا تھا۔ شرحِ فارسی و دکنی صرف ونحو بھی آپکی تصانیف ہیں۔ اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت میاں محمود انصاریؒ دکنی ہندی، فارسی اور عربی کے علاوہ کنڑی اور مرہٹی کے بھی ماہر

تھے اور یہ کہ انہیں دکنی کے اوّلین نثر نگاروں میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ حضرت رشید انصاریؒ کی تحریر کی روشنی میں درجِ ذیل نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں:

☆ جس طرح اردو بقول ڈاکٹر مسعود حسین خان، حضرتِ دہلی کی دین ہے۔ اسی طرح، میرے خیال میں دکنی امیرانِ صدہ کا عطیہ ہے۔

☆ سلطنت بہمنیہ کے قیام سے پہلے ہی دکنی زبان کی صورت اختیار کر چکی تھی اور اس میں تصنیف و تالیف کا کام شروع ہو چکا تھا۔ چنانچہ خانِ خان، مولف ''منتخب اللباب'' کا یہ کہنا صحیح نہیں کہ بہمنی سلطنت کی زبان ہندوی تھی ڈاکٹر جمیل جالبی کے خیال سے ہم متفق نہیں ہیں کہ ''بھوگ بل'' (سنہ ۱۰۲۳، مطابق ۱۶۱۴ء) کا مصنف قریشی پہلا شخص ہے جس نے اس زبان کو دکنی کے نام سے یاد کیا۔ (تاریخ ادب اردو ص ۵۶)

☆ یہ بات غلط ہے کہ اس زمانے میں ہندی اور ہندوی دو نام ایک ہی زبان کے ہیں غالباً حضرت امیر خسرو کے حینِ حیات ہی ہندی اور ہندوی نے جداگانہ حیثیت اختیار کر لی تھی۔

☆ تاریخ چالوکیہ، سیرۃ النبی ﷺ اور صرف ونحو کے پیش نظر یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ بہمنی سلطنت کے زمانے ہی میں مذہب کے علاوہ دوسرے موضوعات پر تصنیف و تالیف کا کام ہو رہا تھا۔

☆ عہد بہمنی کے گلبرگہ دور میں جن اکابر اہل قلم کا ذکر ملتا ہے ان میں حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودرازؒ حضرت میاں محمود انصاریؒ اور حضرت عین الدین گنج العلومؒ کے علاوہ فیروز شاہ بہمنی کا نام بھی شامل ہے۔ گمان غالب ہے کہ دکنی زبان عہد بہمنیہ میں ارتقائی منازل طے کر چکی تھی اور اس قابل بن چکی تھی کہ اس میں تخلیقی صلاحیتوں کا مظاہرہ ہو۔ شبہ اس امر میں بھی ہے کہ فیروز شاہ اور محمود شاہ سلاطین بہمنی کے دورِ حکومت میں گلبرگہ رشکِ بغداد بن چکا تھا اور یہاں کی مذہبی، علمی و ادبی سرگرمیاں ایران و عرب کو شرمارہی تھیں محمد شاہ دوم (۱۳۷۸ء تا ۱۳۹۷ء) نے حافظ شیرازی کو گلبرگہ آنے کی دعوت دی۔

احمد شاہ ولی بہمنی کے عہد میں پایۂ تخت بیدر منتقل ہو جانے کے بعد بیدر سیاست اور ادب کا مرکز بن گیا تھا۔ اور یہاں غیر ملکیوں کے ساتھ ساتھ غیر ملکی زبان' فارسی' کے خلاف بھی باضابطہ محاذ آرائی شروع ہو گئی تھی۔ فخر الدین نظامی نے اردو ادب کی تاریخ میں پہلی بار لسانی معرکہ آرائی کا آغاز کیا اور اپنے دکنی ہونے پر اصرار کرتے ہوئے کہا کہ تو دکنی ہے' اس لیے دکنی بول۔ دراصل اس تحریک کے پیچھے دکن دوستی اور دکنی زبان سے محبت کا جذبہ کارفرما تھا۔ چنانچہ اس آواز کی گونج ہم کو تقریباً دوسو سال کے بعد ملا نصرتی کے یہاں بھی ملتی ہے۔

ع دکنی کا کیا شعر جیوں فارسی

بیدر کے جن شعرا نے دکنی زبان و ادب کو خونِ جگر دیا ہے' ان میں محمود بیدری اور فیروز نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر مسعود حسین خاں' دونوں اپنے عہد کے بڑے اساتذہ تھے۔ پروفیسر ہارون خان شیروانی نے بیدر کے لسانیاتی رجحان کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "دکنی میں سنسکرت الفاظ کی بہتات کا رجحان بڑی حد تک نظامی بیدری کی تصنیف "مثنوی کدم راؤ پدم راؤ" میں نظر آتا ہے جو پندرھویں صدی کے آخر میں لکھی گئی تھی۔ یہ ایک ضخیم تصنیف ہے جس میں تقریباً دو ہزار اشعار ملتے ہیں' اور سم اور تت بھو، دونوں قسم کے بہ کثرت الفاظ شامل ہیں۔ سخاوت مرزا کا خیال ہے کہ سنہ ۱۴۳۴ء کے درمیان علاء الدین احمد دوم کے عہد میں یہ مثنوی تکمیل کو پہنچی تھی۔ اس عہد کے دوسرے شعرا میں ملّا داودی' مشتاق' لطفی' محمود اور فیروز اہمیت رکھتے ہیں۔

بہمنیوں کے عہد میں جو آخری کتاب دکنی میں لکھی گئی وہ اشرف کی "نوسرہار" ہے لیکن کوئی اونچے درجے کی تصنیف نہیں ہے"۔ (دکن کے بہمنی سلاطین صفحہ ۳۲۷) گو بیدر دکنی اور غیر ملکیوں یعنی آفاقیوں کا میدان جنگ بن چکا تھا جس کا نقطۂ عروج محمود گاوان کے قتل پر منتج ہوا تھا، بایں ہمہ علمی اور ادبی حیثیت سے بیدر، اس پورے بہمنی عہد میں' ہندوستان بھر میں سب سے بڑا مرکز بن گیا تھا۔

محمود شاہ بہمنی نے خواجہ حافظ شیرازی کو اور محمد شاہ سوم نے جامی کو گلبرگہ تشریف لانے

کی دعوت دی تھی۔ صوفیہ کرام میں حضرت سید شاہ من اللہ حسینی کا مرتبہ بڑا ہے حضرت سید برہان الدین شاہ خلیل اللہ بت شکنؒ اور ان کے خاندان کے بزرگوں میں شاہ خلیل اللہ اور شاہ حبیب اللہ حضرت نور سمنانیؒ اور ملتانی پا شاہؒ ممتاز تھے۔ راجہ بھیم سین کی بیٹی دمینتی کے رومانی شہر کے بارے میں محمد قاسم فرشتہ لکھتا ہے کہ

''میں نے ہندوستان کے اکثر شہر دیکھے ہیں لیکن بیدر کی سی لطافت کہیں کم دیکھی عہد وسطیٰ کا یہ ہمکتا' چہکتا شہر بہ عہد کلیم اللہ شاہ بہمنی ۱۵۲۷ء میں زوال سے ہم کنار ہوا۔ برید شاہوں نے گو چند برس یہاں حکومت کی لیکن علم' ادب اور تہذیب کو جو عروج یہاں حاصل ہو چکا تھا' وہ سب داستانِ پارینہ بن کر رہ گیا۔ فخر الدین نظامی نے دکنی زبان کی جو تحریک شروع کی تھی وہ سقوطِ بیدر کے ساتھ ختم ہو کر رہ گئی''۔

اورنگ زیب عالمگیر کے دور میں چند دن بہار کے گزرے، مدرسہ محمود گاواں کے بیتے دن پھر لوٹ آئے۔ عالمگیر نے محمد حسین ناطقی جیسے عالم دین اور فقیر منش کی قدر افزائی کی اور انہیں مدرسہ محمود گاواں کا امام المدرسین مقرر کیا۔ ۱۱۰۷ء میں بجلی کے گرنے سے امام المدرسین دوران نماز مسجد میں شہید ہو گئے ان کے دور تدریس میں مدرسہ گاوان پھر ایک بار فارسی زبان اور علوم شرقیہ کا بڑا مرکز بن گیا تھا۔

گلبرگہ، بیدر اور رائچور ۱۶۸۶ء تک مملکت بیجاپور میں شامل رہے۔ عہد عالمگیر میں ان کا تعلق شالی ہند سے پھر ایک بار جڑ گیا۔

آصف جاہ اول نے جب 1724ء میں اپنی نئی حکومت بنائی اور، اورنگ آباد پایہ تخت ٹھہرا تو مختصر سے عرصے کے لیے گلبرگہ، بیدر، رائچور اور اورنگ آباد کا اور میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے دورِ حکومت میں ریاست حیدر آباد کا حصہ بن گئے۔ آصف جاہ ثانی نے 1770ء میں اپنا پایہ تخت حیدر آباد منتقل کر دیا تھا۔

حیدرآباد کے تینوں اضلاع، گلبرگہ، بیدر، رائچور، سقوطِ حیدرآباد تک، یعنی 1770ء سے سنہ 1948ء تک ریاست حیدرآباد میں شامل رہے۔ سنہ 1956ء میں فضل حق کمیشن کی سفارشات کے بعد لسانی صوبوں کی تنظیم جدید عمل میں آئی تو یہ ضلعے ریاستِ میسور میں ضم کردیے گئے۔ میسور کی ریاست اب کرناٹک بن گئی ہے اور گلبرگہ، بیدر، رائچور کے تینوں ضلعے مجموعی طور پر حیدرآباد کرناٹک کہلاتے ہیں۔

حیدرآباد کرناٹک کے یہ تینوں ضلعے آزادی سے قبل لسانی، و ادبی نقطۂ نظر سے کافی اہمیت کے حامل رہے ہیں عہد آصفیہ میں 1883ء تک دکنی گلی کوچوں کی زبان رہی البتہ سنہ 1883ء میں پہلے پہل اردو کو عدالتی کاروائیوں کے لیے پھر سنہ 1886ء میں مکمل طور پر سرکاری زبان قرار دیا گیا۔ یہ میر محبوب علی خان آصف جاہ ششم کا عہد زرین ہے۔ آصف جاہی بادشاہوں نے مغل تہذیب کو فروغ دیا۔ ان کے دورِ حکمرانی میں دکنی زبان کے بجائے اردوئے جدید کو عروج حاصل ہوا۔ خصوصاً میر عثمان علی خان آصف جاہ ہفتم کے عہد میں جب دارلترجمہ قائم ہوا اور سنہ 1916ء میں جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آیا تو اردو سرکار و دربار کی زبان ہونے کے ساتھ ساتھ عوام کی زبان بھی بن گئی۔ کیونکہ اب جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل نوجوان اپنی کج کلاہی کے ساتھ لکھنو اور دلّی کی ٹکسالی اردو بولنے لگے تھے۔ یہ کیفیت اضلاع میں بھی پیدا ہو چلی تھی۔ چنانچہ عہد محبوبی میں تعلیمی نظام کا آغاز 1884ء میں ہوا۔ گلبرگہ میں 86-1885ء کے تعلیمی سال کے دوران میں ہائی اسکول مدرسہ فوقانیہ قائم ہوا۔ اسی برس بیدر اور رائچور میں بھی ڈل اسکول (مدرسۂ وسطانیہ) قائم ہو چکے تھے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں پوری ریاست میں مدرسوں کا جال سا بچھ گیا تھا۔ 32-1931ء میں گلبرگہ میں عثمانیہ انٹرمیڈیٹ کالج (کلیہ عثمانیہ) قائم ہوا۔ تعلیمی بیداری پیدا ہوئی اور اس کا سب سے بڑا فائدہ اردو زبان کو پہنچا کیونکہ اب اس کو فارسی کے بجائے سرکاری حیثیت حاصل ہو چکی تھی، پھر وہ ذریعہ تعلیم بھی بن چکی تھی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ 1537 سے 1686ء تک اور 1686ء سے 1883ء تک

فارسی زبان کا دور دورہ رہا اور اس بیچ تینوں اضلاع میں اردو شعر و ادب کی تاریخ مغرا ہے۔ میں نہیں کہتا کہ اس طویل عرصے میں کوئی شاعر یا ادیب پیدا نہیں ہوا لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ وہ گوشۂ گم نامی میں ہیں اور ظلمت کا پردہ ان پر پڑا ہوا ہے۔ کوئی قلم کا دھنی ہمارے درمیان میں ہی سے اٹھے گا جو ہاتھ میں تحقیق و تجسس کی شمع لیے تاریکی کے دھندلکوں میں چھپے ہوئے رخانِ زیبا کو تلاش کر ہی لے گا۔ یہ اس لیے بھی کہ کوئی دور دانش وروں سے خالی نہیں ہوتا!

بیدر اپنی عظمت دیرینہ کے لئے تاریخ ہند میں ممتاز ہے۔ قلعہ بیدر جب کھنڈر بنا تو اس کے نوحہ خواں کچھ کم نہ تھے۔ بہت سے مورخوں نے بیدر کی تاریخ لکھی اور بیدر کے بہت سے ادیبوں نے مقالہ نگاری اور تاریخ نویسی کو اپنا فن بنایا۔ بیدر نے اردو ادب اور تاریخ کو جو مورخ دیے ہیں ان میں غلام قادر خان، جوہر بیدری 'خواجہ غلام حسین خاں' محمد قادر خاں بیدری' مانک راؤ وٹھل راؤ اور سید محمد بیدری نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔ ان کی تحریر کردہ تواریخ دکن کی اہم ماخذ ہیں اور ان کے مطالعے کے بغیر عہد ماضی کو پڑھا جا سکتا ہے نہ سمجھا جا سکتا ہے۔

آزادی سے پہلے جن ادیبوں نے اردو زبان کی خدمت انجام دی، ان میں ابوالحمید محمد رفیع الدین رفعت (نالۂ رفعت) پروفیسر میر محمود علی (گلدستۂ تاریخ) بہت ممتاز ہیں۔ میر مسعود علی صحافی تھے اور اخبار ''خورشید'' کے جوائنٹ ایڈیٹر تھے۔ انہوں نے رسالہ ''رہبر زراعت'' بھی جاری کیا تھا۔ مانک راؤ وٹھل راؤ (بستان آصفی) سید محمد جمال الدین خان (کلیانی کا محرم) آغاز داؤد (دفتر رحمت) سید اسد اللہ (تاریخ مختار الاخیار) محمد ظہیر الدین (سلطان احمد شاہ بہمنی) شاہ زین الدین کنج نشین (تاریخ بیدر) حکیم احمد اکرام الدین صدیقی (رستۂ ضروریہ) ان کے علاوہ برادرم سید اسد اللہ صاحب علوی نے اپنی فراہم کردہ فہرست میں ادیبوں کا بھی ذکر کیا ہے جو بہ سلسلۂ ملازمت بیدر میں مقیم رہے ہیں۔ مثلاً میر ولایت حسین مہتمم پولیس (حالاتِ اقوامِ جرائم پیشہ) 'بشیر الدین' تعلقدار و صوبے دار (تاریخ واقعات مملکتِ بیجاپور) خواجہ احمد' مددگار ناظم انجمن ہائے امداد باہمی (محمود گاواں)' سخاوت مرزا (حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت)

محمد سلطان سر شتے دار تعلیمات (مرقع دکن' سیر گلبرگہ' آئینہ بیدر) دیگر صاحب قلم حضرات میں محمد اکبر حسین' میر تراب علی خان' محمد مزمل صدیقی' محمد شفیع الدین وکیل' شیخ سعید الدین' محمد عبد الغفار ظفر اور عبد الستار ادیب شامل ہیں۔

جہاں تک بیدر کے شعرا کا تعلق ہے' بقول علوی' یہ ایک الگ موضوع ہے جس پر تحقیق کی جا سکتی ہے۔ علوی صاحب نے تقریباً اٹھاون 58 شاعروں کی فہرست مرتب کی ہے جو بقول ان کے نامکمل ہے۔ ان تمام شاعروں کا تعلق ماقبلِ آزادی بیدر سے ہے۔ ان میں سے چند ایسے ہیں جن کے سر پر زمانے نے شہرت کا تاج رکھا ہے۔ مثلاً حضرت شاہ خاموش' حضرت عشقی' رفیع الدین رفعت' حبیب اللہ وفا' عبد الحمید شوق' دامودر پنت ذکی' شبیر پاشا شبیر' سید حسین آزاد' سید حسین سیفی سبحانی' عبد الشکور طپش' الیاس احمد سلیم' جلاد ظفر' دیسی بخاری' سعید' حری' اعجاز' عطا کلیانوی' ادیب' خاک' قدرت' جہانگیر خلیل' انور' ذکا' مصفا' ید اللہ' فطرت میر محفوظ علی آتش' غلام محی الدین کیف' فاضل' فنا' سیف' چندا بزم' فیاض' سجادہ' پروانہ' امید شاہ ابو الفیض' اور حضرت فقیر اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کے ذریعہ اس شمع کو روشن رکھا جسے ابو الفیض نے نویں صدی ہجری کے بیدر میں جلایا تھا۔ ماجد شمیم نے بیدر کے شاعروں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> ''.......سلطنتِ بہمنیہ کے دانا و علم دوست وزیر اعظم خواجہ عماد الدین محمود گاواں نے جو خود بھی شاعر تھے اس شہر نگاراں میں مشاعروں کا اہتمام کیا۔ ''دیوان اشعار'' آپ کے کلام کا مجموعہ ہے۔ فیروز بیدری جسے اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر ہونے کا اعزاز حاصل ہے' مشاعروں کی جان ہوا کرتا تھا''۔
>
> (''شہر غزل'' مرتب: محسن کمال' ص 21)

عہد آصف جاہی میں مشاعرے کی محفلیں اکثر عبد الحمید شوق کے یہاں منعقد ہوتی تھیں۔ حضرت خواجہ ابو الفیض کے سماع خانے میں اکثر سالانہ مشاعرے ہوا کرتے تھے جن کے

روح رواں حضرت خواجہ معین الدین حسینی سجادہ نشین ہوا کرتے تھے۔ ان کے علاوہ ناظم ضلع عباس بیگ محمودی رمزؔ نے اپنے ''صحن مسیحا'' میں اس روایت کو جاری رکھا۔ آزادی کے بعد اردو زبان کی سرکاری حیثیت ختم ہو گئی ہے۔ اردو ادب صرف عوامی سطح پر زندہ رہ سکتی ہے اور وہ زندہ ہے۔ یہ اہل بیدر کا کام ہے کہ وہ اردو زبان کو ایک نئی زندگی دیں مجھے یقین ہے، بیدر کے اس ''صحنِ مسیحا'' میں اردو زبان اور تہذیب کو حیاتِ نو ملے گی۔

رائچور، عہد ماضی میں ہمیشہ جنگ و جدال کا میدان بنا رہا ہے۔ سلطنت بہمنیہ کے قیام ہی سے کرشنا اور تنگ بھدرا کا یہ دوآبہ وجیانگر اور گلبرگہ کے تاجداروں کا میدان جنگ تھا۔ چنانچہ بہمنی سلطنت کے خاتمے اور دکن کی پانچ نئی سلطنتوں کے قیام کے بعد بھی یہاں معرکہ آرائی ہوتی رہی۔ ایسی صورت میں یہاں تہذیب و ادب کا پنپنا دردشوار تھا۔ تاہم سقوطِ بیجاپور کے زمانے میں حضرت سید محمد نوردریاؔ ایسے بلند پایہ صوفی اور صاحب تصانیف بزرگ گذرے ہیں جن کے نام اور کام نے تاریخ ادب اردو میں رائچور کو ایک منفرد مقام دلایا ہے۔ ان کے بعد ائچور پر تاریکی چھا جاتی ہے۔ تاایں کہ عہد محبوبی اور عہد عثمانی میں اس کا نام سطح آب پر تیرنے اور ہمکنے لگتا ہے اور جان پڑتا ہے کہ تنگ بھدرا اور کرشنا کے پانیوں سے اجڑی ہوئی دھرتی پھر سے سرسبز ہونے لگی ہے۔ اس دور میں جن ادیبوں اور شاعروں نے رائچور میں شعر و ادب کے باغ ارم کو اپنا خونِ جگر دیا ہے، ان میں محمد عبدالرحمٰن واحدؔ، زندہ علی شاربؔ، عبدالکریم مشتاقؔ، عبدالصمد پرویزؔ، عبدالستار شاطرؔ، عبدالمجید امینؔ، محی الدین محیؔ، غلام رسول دل گیرؔ، عبدالشکور واجدؔ، اور عبدالقادر مجازؔ شامل ہیں۔ انجم علوی اور حضرت راگھویندر راؤ جذبؔ عالم پوری بھی ضلع رائچور سے تعلق رکھتے ہیں واحدؔ، شاربؔ اور مشتاق نے اپنے دوسرے معاصر شعرا کے ساتھ مل کر ''بزم اردو'' کی بنیاد ڈالی، جسے آزادی کے بعد عبدالقادر مجازؔ نے حیاتِ نو دینے کی کوشش کی۔ راگھویندر اراؤ جذب عالم پوری اب باقیات الصالحات میں سے ہیں۔ آپ کو شہرت گو آزادی کے بعد ملی، لیکن آپ نے آزادی سے قبل اپنے زمانۂ طالب علم ہی سے لکھنا اور شعری محفلوں میں سنانا شروع کر دیا تھا۔

قاسم القادری نے اپنے خط میں لکھا ہے:

''اردو ادب کی مجاز صاحب نے بے حد خدمت کی ہے۔ اکثر ان کے مکان پر محفلیں سجائی جاتی تھیں اور شعرا کے سامنے شمع رکھی جاتی تھی۔ شعرا بیٹھ کر کلام سنایا کرتے تھے۔ اور سامعین باادب رہتے ہوے داد تحسین کے نعرے شائستہ انداز میں بلند کرتے تھے اور ہم (خاکسار) شعرا کی خدمت کرتے تھے''۔

اہلِ رائچور آزادی کے بعد بھی جو اردو زبان وشعر کی شمع جلائے رکھی ہے وہ روشن مستقبل کی ضمانت ہے۔ تاہم یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ حیدرآباد کرناٹک کے اضلاع میں رائچور ہی ایسا ضلع ہے جہاں اردو زبان سسکتی اور دم توڑتی نظر آتی ہے۔ تعلیمی اداروں، خصوصاً کالجوں میں اردو طلبہ کی تعداد افسوس ناک حد تک کم ہے۔ مجھے یقین ہے کہ رائچور میں اردو زبان وتہذیب کی تحریک کے ارباب مجاز اردو زبان اور تہذیب کے تحفظ وترقی کے کام کی طرف توجہ دیں گے! ورنہ ڈر ہے کہ کہیں کرشنا کا پانی سوکھ نہ جائے اور تنگ بھدرا کی تہہ میں دراڑیں پڑ جائیں۔

انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر کا گلبرگہ محبوب شاہی ملز سے فراہم کردہ بجلی کی روشنی میں جھلمل کر رہا ہے۔ بقول وزیر علی (یادگل برگ) جناب مکرم اکرام اللہ خان صاحب، صوبے دار نے اس ویرانے کو پھر ایک بار گل وگلزار بنانے کا قصد کیا۔ معشوق یار جنگ، صوبے دار، نے گلبرگہ کی ہمہ جہت ترقی کے ساتھ ساتھ علم وادب کی خدمت بھی کی۔

مولوی ولی محمد کسمنڈوی مہتمم مجلس، مولوی قمرالدین حسین مہتمم پولیس، حضرت گل محمد شورؔ اکبر آبادی میر منشی اول تعلقداری، مولوی عبدالسلام ناظر تعلیمات، مولوی حافظ یسٰین مدراسی (نواب یسین جنگ) صوبے دار، مولوی محمد علی نقشبندی محترم رجسٹرار آفس، مولوی تمکین کاظمی محکمۂ اوّل تعلقداری، جناب تجلی خزانے دار اور محمد سلطان محکمۂ تعلیمات، اور ان سے ذرا آگے چل کر جناب فرحت اللہ بیگ سیشن جج نے گلبرگہ کے ادبی ماحول کو خوب گرمایا۔

گلبرگہ میں پہلی بار گل محمد شورؔ اور ان کے شاگرد معظم علی سہروردی شباب نے مشاعرے

کا اہتمام کیا۔ یہ مشاعرہ ہر ماہ محرم و ہر ماہ ربیع الاول کو محلّہ بٹلی الاوے میں منعقد ہوا کرتا تھا۔ اسکی پیروی میں مخدوم علی تابؔ نے بھی اسی مقام پر مشاعرے کی بناڈالی۔ ہر ماہ بروز جمعہ یہ مشاعرہ منعقد کرنے لگے۔ ان مشاعروں میں ممتاز حسینؔ، ریحان، خوشتر جائسیؔ، قادرؔ، اسماعیل حافظؔ، شاربؔ، جادوؔ، چاقؔ، ندیمؔ، شوخیؔ اور ذوقیؔ، کلام پڑھا کرتے تھے۔ شاہ پور سے حضرت نامیؔ کوہ سوار نے کافی نام پیدا کیا۔ ملک کے مختلف جرائد میں ان کا کلام چھپتا رہا۔ حافظ عبدالرشید خود بھی اچھے شاعر تھے، حافظؔ تخلص کرتے تھے۔ ان کے کلام کا مجموعہ ''نوائے رشید'' 1968ء میں شائع ہوا ہے۔ ان سے راقم الحروف کے مراسم تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ شعرائے گلبرگہ کا تذکرہ ترتیب دیں۔ شعرا کی فہرست بھی تیار کرلی تھی۔ ان کے مختصر حالات زندگی بھی لکھ لیے تھے۔ ان کا یہ اُدھورا کام خاکسار کے پاس محفوظ ہے۔

حافظ عبدالرشید کے غیر مطبوعہ تذکرۂ شعرائے گلبرگہ وزیر علی کی کتاب ''یادِ گلبرگ'' اور مخدوم علیؔ کی کتاب ''طابِ تاب'' کی مدد سے راقم الحروف نے اس دور کے شعرائے گلبرگہ کی فہرست یوں ترتیب دی ہے:

اسماعیل شریف ازلؔ، غلام علی آثرؔ، حکیم بزمیؔ، مخدوم علی تابؔ، عبدالرزاق چاقؔ، سید محمد دلبازؔ، عبدالحفیظ اندیؔ، شورؔ عابدی، گل محمد شورؔ، منہاج الدین شوکت، ممتاز انصاری، عبدالرحمن صابرؔ، احمد حسین تابؔ، عبدالرسول عبرتؔ، فتح محمد فاتحؔ، حسن محی الدین غیرتؔ، سید احمد حسین قادری سحرؔ، مختار ہاشمیؔ، قمرالدین انصاری قمرؔ، اسماعیل بیگ مرزا، عبدالرحمان لطفیؔ، سید شاہ حسین خیر بندہ نوازیؔ، جہاں گیر علی قدسیؔ، نیاز گلبرگوی، فضل گلبرگوی، الطاف منیرؔ، زبیرؔ، عبدالرحیم سیفیؔ، شیخ علی دائمؔ اور عبدالباقی رنگینؔ وغیرہم۔

بٹلی الاوے، آغا بنگلے، دیوڑھی روضۂ بزرگ، دیوڑھی روضۂ خرد اور گورنمنٹ ہاؤس کے مشاعروں سے شہر میں ایک ماحول سا بن گیا تھا۔ اس ادبی ماحول کو نکھارنے سنوارنے میں حیدرآباد کے جریدوں کے علاوہ خود گلبرگہ سے نکلنے والے رسالوں نے بھی اہم رول ادا کیا ہے

چنانچہ یہاں کے رسائل میں سب سے قدیم ''گلبرگہ سماچار'' ہے جو سنہ 1300ء میں جاری ہوا تھا۔ 1948ء میں عثمان صحرائی نے ''ہمدرد'' جاری کیا تھا اور 1956ء میں اکرام صہبائی اور حسام الدین نے ''گلبرگ'' 1956ء میں نجم الثاقب شحنہ نے حیدرآباد سے دو ماہی رسالہ ''گجر'' کے نام سے نکالا اس کی ادارت میں جناب حسینی شاہد' جناب سری نواس لاہوٹی' اور جناب نعمت انور بھی شامل تھے ''گجر'' کے موسس و مدیر نجم الثاقب شحنہ یادگیر ضلع گلبرگہ کے متوطن ہیں۔ حکیم لئیق احمد نعمانی کا رسالہ ''شہباز'' بھی اس دور کا اہم رسالہ ہے۔

گلبرگہ میں باضابطہ تعلیمی تحریک کے آغاز کے ساتھ اردو کا چلن عام ہونے لگا۔ اور بقول نیاز گلبرگوی' گلبرگہ کلب (CLUB) ایک عجیب و غریب ادارہ تھا''۔ اس ادارے کے علاوہ ''پیام برادری'' بھی قائم تھی۔ اس برادری کے تحت ادبی محافل منعقد ہوتیں اور ڈرامے اسٹیج ہوا کرتے تھے۔ اس برادری کی وجہ سے حیدرآباد کے بہت سے شعرا مثلاً ادیب، میکش' شاہد صدیقی اور مخدوم محی الدین سے اہل گلبرگہ کے مراسم بڑھ گئے۔ اسی زمانے میں نوجوانوں نے بھی بال و پر نکالے۔ ان میں ابرہیم جلیس سب سے ممتاز رہے۔ ان کے علاوہ نوجوانوں کی اس انجمن رنگ و بو میں حسب ذیل خواتین و حضرات بھی شامل تھے۔

شور عابدی، فضل گلبرگوی' حسن خان نجمی' احمد حسین' غلام علی اثر' احمد حسین قادری سحر' عثمان صحرائی' نورالحسن انوار' عزیز الحسن محشر' شاہد رزاقی' محمود حسین کاشمیری' محبوب حسین جگر' سلیمان خطیب' روشن محمد علی' غلام علی چغتائی' عبدالرزاق ا' حسین سہروردی' سرور مرزائی' احمد الدین قریشی' شہاب الدین ثاقب' سعیدہ بیگم' راحت النساء راحت' سید محمود شورش اور مشہور سائیکل اور تلوار چمپین قیوم گلبرگوی۔

گلبرگہ کلب کی کیبنیٹ (Cabinet) میں محمد نواز خان' ڈاکٹر محمود الحسن' سید محمود شورش' احمد حسین سحر' محمود علی سرفراز علی' محمد حسین خان نجمی' محمد باقر نشتر، عبدالودود' عبدالغفور سہروردی شامل تھے۔ نئی نسل میں سید محمود' سوداگر' نظام الدین' عبدالرحیم آرزو' غلام حسین ساحل' جمیل اور

حفیظ کا تعلق بھی گلبر گہ کلب سے تھا۔ 1848ء کے بعد گلبر گہ کلب کا شیرزہ بکھر گیا۔ نیاز نے اس کلب کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ گلبر گہ کے نوجوانوں کا دھڑکتا ہوا' فعال' صحت مند دل تھا۔ یہ دل جب دھڑکتا تو پورے گلبر گے کی زندگی' حیاتِ تازہ سے لہلانے لگتی تھی۔ اس کی آواز پورے گلبر گے کی آواز تھی۔

ایک دن' یہ آواز فضاؤں میں گم ہوگئی' جیسے زبان اردو کا دم گھٹ گیا ہو۔ ☐☐

گلبرگہ میں اُردو نعت گوئی

(اجمالی خاکہ)

پروفیسر عبدالحمید اکبر
ڈین فکلٹی آف آرٹس، وصدر شعبہ اردو وفارسی، گلبرگہ یونیورسٹی، گلبرگہ

اصطلاح شعر میں ''نعت'' حضور اکرم ﷺ کے اوصاف جمیلہ اور اخلاق عظیمہ کو ادب اور احترام کے ساتھ شعر کے پیکر میں ڈھالنا ہے۔ نعت کی معنوی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر ''نعت'' کو ایک مکمل صنف کا درجہ دیا گیا ہے۔ دیگر اصناف نظم کے مقابلے میں ''نعت'' محض صنف ادب ہی نہیں بلکہ وہ پاکیزگیٔ قلب وفکر کے اظہار کا بہترین موقع بھی ہے۔ اس صنف کو صدیوں کا تواتر بھی حاصل رہا ہے، اگر چہ ہر دور' دورِ نعت اور ہر صدی نعت کی صدی رہی ہے، تاہم دورِ حاضر کے شعراء تیزی اور رغبت کے ساتھ نعت کی جانب متوجہ ہوئے اور ہورہے ہیں۔ خدائے کریم اس سعادت کے طفیل ان کے اذہان وقلوب کو نعتِ رسول ﷺ کا حقیقی عرفان عطا کرے تاکہ بارگاہِ رسول ﷺ میں کتاب وسنت کے مطابق ادب واحترام ملحوظِ خاطر رہ سکے۔

تاریخ نعت گوئی میں وہی شخصیات ممتاز وسرفراز ہوئی ہیں جنھوں نے عشق وعقیدت کی انتہا میں بھی شریعت کا دامن نہیں چھوڑا۔ امام نعت گویاں حضرتِ رضا بریلوی نے کیا ہی خوب فرمایا ہے۔

قرآن سے میں نے نعت گوئی سیکھی　　　　یعنی رہے احکام شریعت ملحوظ

ہمارے ملک ہندوستان میں بھی نعت کی روایت مختلف زبانوں میں خاص طور پر عربی، فارسی اور اردو وغیرہ میں مستحکم ہے، اُردو کے معروف نعت گوشعراء میں محسن کاکوری، امیر مینائی، الطاف حسین حالی، شاد عظیم آبادی، رضا بریلوی، اقبال جلیل مانک پوری، حسرت موہانی، سیماب اکبرآبادی، حفیظ جالندھری، امجد حیدرآبادی، بہزاد لکھنوی، حفیظ میرٹھی، بیکل اتساہی، خمار بارہ بنکوی، مرزا

شکور بیگ، عبدالقدیر صدیقی حسرت، اوج یعقوبی، صابر شاہ آبادی، جمیل الدین شرفی، سرور مرزائی وغیرہ خصوصیت کے حامل ہیں۔ غیر مسلم شعراء نے بھی نعت گوئی میں کمال حاصل کیا ہے، مثلاً پنڈت دیا شنکر نسیم، کشن پرشاد، ہری چند اختر، تلوک چند محروم، جگن ناتھ آزاد، دامودر ذکی ٹھاکور، کنول پرشاد کنول، گلزار دہلوی، مدنا منظر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

جہاں تک گلبرگہ میں اُردو نعت گوئی کا تعلق ہے یہاں بھی مسلم وغیرہ شعراء نے بھی بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں نذرانہ عقیدت پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ اگرچہ گلبرگہ عہد قدیم کے بیشتر حکمرانوں کے عہد حکومت میں اُردو زبان وادب کی سرپرستی سے محروم رہا، تاہم، دورِ بہمنیہ کے بعد اس علاقے کے علم وادب کو تاریخی اہمیت حاصل رہی۔ سلطنتِ بہمنیہ کے آٹھویں حکمران فیروز شاہ بہمنی علم وفضل سے آراستہ اور صوفیہ کا عقیدت مند تھا چنانچہ اسی فیروز شاہ کے عہد میں حضرت خواجہ بندہ نوازؒ دہلی سے گلبرگہ تشریف لائے جنھوں نے دکنی زبان میں بھی نظم و نثر میں کچھ رسالے املا کروائے۔ دیگر محققین کے علاوہ ڈاکٹر جمال شریف اور ڈاکٹر محمد علی اثر کی تحقیق کے بموجب حضرت خواجہ بندہ نوازؒ گلبرگہ دکن کے پہلے اُردو شاعر ہیں۔ جاوید وشسشٹ نے اپنی تالیف ''دکھنی درپن'' میں لکھا ہے کہ سرور کائنات صاحبِ لولاک حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی عظمت وفضیلت کا حضرت بندہ نوازؒ نے ان الفاظ میں ذکر کیا ہے۔

؎ واحد اپنی آپ تھا اپیں آپ انجھایا	پرکہ جلوے کارنے الف میم ہو آیا
مشتوں جلوہ دینے کو کاف نون بسایا	لولاک لما خلقت الافلاک خالق پالائے
فاضل افضل جتنے مرسل ساجد سجود ہو آئے	امت رحمت بخشش، ہدایت تشریف لائے

ڈاکٹر جمال شریف نے اس سے پہلے ایک شعر لکھا ہے جو دوسری کتابوں میں بھی مرقوم ومشہور ہے۔

؎ اے محمد ھجلو جم جم جلوہ تیرا	ذات تجلی ہوئے گی سیر سپور نہ سہرا

حضرت بندہ نوازؒ کے وصال کے ۷ سال بعد ہی بہمنی سلطنت کا پایہ تخت ۱۴۲۹ء، بیدر منتقل ہوا۔ ہارون خاں شیروانی کے بقول ''بہمنی سلطنت کے پایہ تخت کی تبدیلی گلبرگہ کی علمی اور

ادبی مرکزیت کا زوال ہے، کیونکہ اس شہر سے علم وادب کی شمع کو بیدر منتقل کر دیا گیا تھا'' چنانچہ احمد شاہ بہمنی کی پذیرائی سے شعراء، وادباء بیدر میں جمع ہونے لگے۔

حضرت بندہ نواز کے خانوادے میں آپ کے فرزند سید اکبر حسینی اور پوتے سید عبداللہ حسینی نے نظم ونثر دونوں میں طبع آزمائی کی ہے، سید محمد حسینی شہباز بھی شاعر تھے جو ابراہیم عادل شاہ کے دور میں ۱۷ اویں صدی عیسوی میں بیجاپور تشریف لے گئے اس کے بعد ''سیوا'' سے متعلق ڈاکٹر زور نے لکھا ہے کہ ''سیوا'' گلبرگہ کا باشندہ تھا اور علی عادل شاہ کے زمانے میں بیجاپور پہنچا ۔۱۶۸۰ء میں اس نے فارسی ''روضتہ الشھداء'' کا اردو میں ترجمہ کیا۔ ڈاکٹر جمال شریف نے اپنی کتاب ''دکن میں اردو شاعری ولی سے پہلے'' میں لکھا ہے کہ ''دورانِ تحقیق مقالہ نگار کو ایک اردو نظم ملی ہے، جس کی سرخی ''من کلام سیوا'' ہے۔اس نظم کے منتخب اشعار میں نعت کے شعر ملاحظہ ہوں:

صلی حسب محمدی سو کھ ہیں آکھونٹ	خاصا بندا سا جھا سر مترا ہوں مت
محمد من تو ں من کتابوں چار	من خدائی رسول کون سانچا ہی دربار

قاضی محمود بحری (متوفی ۱۷۱۰ء) جن کا تعلق گوگی، تعلقہ شاہ پور گلبرگہ ضلع سے ہے، من لگن، عروسِ سخن، کلیاتِ بحری، بنگاب نامہ آپ کی شہرۂ آفاق تصانیف ہیں جن میں نعت کے شعر بھی شامل ہیں ۔ قاضی محمود بحری کے وصال کے تقریباً دوسو سال تک گلبرگہ میں شعری وادبی سرگرمیوں کا پتہ نہیں چل سکا، اس پر اہل علم و تحقیق متوجہ ہو رہے ہیں۔

آزادیٔ ہند کے ۹ سال بعد ۱۹۵۶ء میں لسانی بنیاد پر گلبرگہ ریاست کرناٹک سے متعلق ہوا۔ جو اس سے قبل آصف جاہی دور ۱۷۷۰ء تا ۱۹۴۷ء میں گلبرگہ حیدرآباد کی ریاست میں شامل تھا، اس دوران گلبرگہ کے جن شعراء نے طرحی مشاعروں میں نعتیہ کلام پیش کیا ہے، ان میں قابل ذکر چاق گلبرگوی، نامی کوہ سواری، ذوقی اور بعدہ مخدوم علی تاب، مولوی اسمٰعیل شریف ازل، حافظ عبدالرشید، حسن احمد طالب، مختار ہاشمی، منہاج الدین شوکت، خیر بندہ نوازی، عثمان صحرائی، فضل گلبرگوی، نیاز گلبرگوی، سید محمود دلباز، غلام علی اثر، احمد حسین سحر قادری، شور عابدی،

سلیمان خطیب، حسن محی الدین غیرت وغیرہ ہیں۔

آزادی کے بعد شہر گلبرگہ میں جن شعراء نے نذرانۂ نعت رقم کرنے کی سعادت حاصل کی ہے ان میں فتح محمد فاتح، عبدالقادر ادیب، سرور مرزائی، قمرالدین انصاری قمر، راہی قریشی، عبدالرحیم آرزو، حمید الماس، حکمت جنیدی، مدنا منظر، محبؔ کوثر، صغریٰ عالم، خمار قریشی، حکیم شاکر، نصیر احمد نصیر، معین محمود، صابر شاہ آبادی، رزاق اثر، صبیح حیدر صبیح، بدر مہدی، حیرت نظامی، جبار جمیل، سراج وجیہہ، حامد اکمل، خالد سعید، صابر فخر الدین، فضل افضل، فضل الرحمٰن شعلہ، پرویز دھمڑی، وقار خلیل، اعظم اثر، سید شاہ خسرو حسینی، وحید انجم، اکرم نقاش، نورالدین نور، وقار ریاض، ثنا بھنڈاری، سعید عارف، خلیل مجاہد، ماجد داغی، قاضی انور، معین منظر، چندا حسینی اکبر، سید یوسف حسینی، تخی سرمست، اطہر معز، باسط فگار، رفیق سوداگر، اظہر خادم، عتیق اجمل، راشد ریاض، حسن محمود، ناصر عظیم وغیرہ شامل ہیں۔ گلبرگہ کے اکثر شعراء نے نعتیہ شاعری کے فروغ میں حصہ لیا، اس طرح گلبرگہ میں نعت گوئی کی روایت ادب واحترام کے ساتھ نشو ونما پاتی رہی۔ بطور مثال منتخب شعراء کے شعر ملاحظہ ہوں:

جشنِ میلادِ مصطفیٰ ہے آج
عرش اعظم پہ جوش خدا ہے آج

مغفرت مانگ لو خدا سے چاقؔ
باب غفراں جو کھلا ہے آج

(چاقؔ گلبرگوی)

محمد شفیع الوری بن کے آئے
محمد رسول خدا بن کے آئے

ہوا ابر رحمت جو فاراں پہ ظاہر
محمد شمس الضحیٰ بن کے آئے

(نامی کوہ سواری)

یہ کس کا آج دنیا میں کہو یوم ولادت ہے
جدھر دیکھو اُدھر مسلم کا دل وقفِ مسرت ہے

بلالو اپنے در تک تابؔ کو بھی یا رسول اللہ
پڑا ہے ہند میں بے کس ستاتی اس کو فرقت ہے

(تاب سہروردی)

کیا لکھے کوئی حسن محمد کی داستاں
پہلے قلم کو دھولوں میں عطر و گلاب میں
مضموں ہے ایسا دل میں نہ عنواں نظر میں ہے
پھر نعت لکھوں شانِ رسالت مآب میں
(حافظ عبدالرشید)

شیتل کومل بول تمہارے
دیکھیں آقا کیا دیتے ہیں
او بطحا کے راج دلارے
فضل کھڑا ہے ہاتھ پسارے
(فضل گلبرگوی)

زباں دی ہے خدا نے مدحتِ سرکار کی خاطر
سرورؔ اُن کے کرم سے مرے دل پر یہ کھلا عقدہ
بصارت دی ہے، دیدارِ احمد مختار کی خاطر
کہ دل، دلدار کی خاطر ہے اور سردار کی خاطر
(سرور مرزائی)

سفر ہو حسبِ ہجرت گر ہمارا یا رسول اللہ
نہ ہوتے تم تو ہم اپنے خدا سے بے خبر ہوتے
ابھر سکتا ہے کشتی میں کنارہ یا رسول اللہ
غرض تم سے ہے سر اونچا ہمارا یا رسول اللہ
(صابر شاہ آبادی)

جانِ انبیا تم ہو، شانِ کبریا تم ہو
رازِ رہروِ اسریٰ اور مقامِ او ادنیٰ
ابتداء بھی تم سے تھی اور انتہا تم ہو
نطق گنگ ہے آقا کیا کہیں کہ کیا تم ہو
(نیاز گلبرگوی)

جو عظمت و رفعت ہے تیری بے حد ہے
ہے ربِ دو عالم کا یہ ارشادِ عظیم
اے فرش نشیں، عرش تیری مسند ہے
تخلیقِ دو عالم کا تو ہی مقصد ہے
(راہی قریشی)

مرے مولا کے روضہ پر مری شام و سحر صدقے
خدا جو بخش دے مجھ کو کروں شمس و قمر صدقے
حیات مختصر کیا ہے یہ دل صدقے نظر صدقے
نہیں میری مگر یہ کائنات بحر و بر صدقے
(صغریٰ عالم)

اس شہرِ مقدس کو جب بادِ صبا جانا
فریادِ دکھے دل کی سرکار کو پہنچانا

ہے میری تمنا یہ مر مر کے ہوں پھر پیدا
جل جل کے مروں اُن پر بن بن کے میں پروانہ

(رزاق اثر)

حاصل بہت خوشی ہوئی عشق رسول میں
راحت سدا مجھے ملی عشق رسول میں

ہر لمحہ میں خدا سے دعا مانگتا رہوں
کٹ جائے میری زندگی عشق رسول میں

(صبیح حیدر صبیح)

عرب کے دشت میں غنچے کھلانے مصطفیٰ آئے
کہ بن کے نورِ ظلمت کو مٹانے مصطفیٰ آئے

زمانہ دور کرتا تھا غریبوں اور یتیموں کو
محبت سے گلے ان کو لگانے مصطفیٰ آئے

(وحید انجم)

جگہ دے دیجئے قدموں میں اپنے ہم غلاموں کو
نہیں ہے اور کوئی بھی ہمارا یا رسول اللہ

خدا عشق محمدؐ میں یہی معراج ہو خسرو
جدھر دیکھو محمدؐ کا نظارہ ہو تو ایسا ہو

(سید خسرو حسینی)

روشنی یوں تو فلک پر چاند سورج کی بھی ہے
گنبد خضریٰ کی مجھ کو روشنی اچھی لگی

مدحت و نعتؐ اور یہ نظم اور غزل
زندگی میں مجھ کو خاطرؔ شاعری اچھی لگی

(عبدالستار خاطر)

اپنے مکاں سے نکلے، مکانوں کی سیر کی
اپنے زماں سے پہلے زمانوں کی سیر کی

(محب کوثر)

گھر ہے خدا کا اور نگہ باں ہیں مصطفیٰ
جاں ہے کسی کی اور رگِ جاں ہیں مصطفیٰ

(خمار قریشی)

محشر میں گنہگاروں پہ ہو گا ترا سایہ
دنیا میں کسی نے ترا سایہ نہیں دیکھا

(حامد اکمل)

زمیں وزماں آسماں آپ کا ہے　　مکین ومکاں لامکاں آپ کا ہے

(اکرم نقاش)

سانس مہکی ہے ذکر اقدس سے　　ایک خوشبو جو بس گئی ان کی

(قاضی انور)

عارف رسول پاک کی معراج کیا کہوں　　سب کو بھلا نصیب کہاں ایسی رات ہے

(سعید عارف)

جس کو رسولِ پاک کا دیدار ہو گیا　　وہ خوش نصیب واقفِ اسرار ہو گیا

(ماجد داغی)

شعرائے گلبرگہ کے درج ذیل مجموعے (حمد، نعت، منقبت) شائع ہو کر منظر عام پر آچکے ہیں، سرور مرزائی (شیون احمدی)، صابر شاہ آبادی (رحمت تمام، سلسلہ انوار ، ضامن نجات، تہذیب منورہ)، صغریٰ عالم (محراب دعا ، بابِ جبریل)، رزاق اثر (بیاض ثناء)، سید شاہ خسرو حسینی (ورفعنا لک ذکرک)، صبیح حیدر صبیح (پہلی ضیاء)، وحید انجم (ابر رحمت)، عبدالستار خاطر (نشاط نور)۔

الغرض گلبرگہ میں نعت گوئی کے عہد بہ عہد ارتقاء کو پیش کرنے کے لیے یہ مقالہ ایک اشاریہ ہو سکتا ہے اور ہر دور کے تمام شعراء کے احوال و آثار، فنی لوازم، موضوعات و اسلوب کی تفصیل کا اس مختصر میں احاطہ ممکن نہیں ہے۔ □□

قصہ ہمارے ڈاکٹر بننے کا

ڈاکٹر مجتبیٰ حسین، حیدرآباد

پچھلے ہفتہ ہم نے اُڑتے اُڑتے ''ڈاکٹریٹ'' کی ڈگریوں کے بارے میں اظہارِ خیال کیا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ ہمیں بھی ڈی۔لٹ کی ایک اعزازی ڈگری ملنے والی ہے۔ یہ نہیں بتا سکے تھے کہ ہمیں یہ ڈگری کس طرح اور کن حالات میں ملی۔ 4 فروری کو ہم گلبرگہ میں کسی قدر لمبے قیام کے ارادے سے گئے تھے تا کہ اس قیام کے سب سے آخر میں ہمارے دیرینہ دوست وہاب عندلیب کے جلسہ اعتراف خدمات میں شرکت کے بعد 16 فروری حیدرآباد کے ہوائی اڈے سے دہلی چلے جائیں گے جہاں اپنے پرانے دفتر کی ایک میٹنگ میں ہماری شرکت نہایت ضروری تھی۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ آدمی سوچتا کچھ ہے اور ہو کچھ اور جاتا ہے۔ پھر ہم جیسے ادنیٰ مزاح نگار پر قدرت کچھ زیادہ ہی مہربان رہتی ہے۔ چنانچہ وقفہ وقفہ سے ہمارے ساتھ کوئی نہ کوئی عملی مذاق ضرور کرتی ہے۔ چنانچہ ابھی ہم حالت سفر میں تھے بلکہ آندھرا پردیش کی سرحد کو عبور کر کے کرناٹک میں داخل ہوئے ہی تھے کہ وہاب عندلیب کا فون آیا۔ ''آپ آتے ہوئے اپنے ساتھ اپنا بائیوڈاٹا BIODATA ضرور لیتے آئیں''۔ ہم نے کہا ''اب تو ہم کرناٹک کی سرحد میں داخل ہو گئے ہیں۔ یوں بھی ہمارا بائیوڈاٹا زندہ طلسمات کی شیشی تو ہے نہیں کہ اسے ہمیشہ سفر میں حفظ ماتقدم کے طور پر اپنے ساتھ رکھیں۔ مگر اب آپ کو اس کی ضرورت کیوں لاحق ہوگئی۔ آپ تو ہمارے بارے میں ہمارے بائیوڈاٹا سے کہیں زیادہ جانتے ہیں''۔ بولے ''گلبرگہ یونیورسٹی سے ایک فون آیا تھا۔ وہ آپ کا بائیوڈاٹا مانگ رہے ہیں''۔ ہم نے کہا ''یقین مانئے ہمارا بائیوڈاٹا کبھی ہمارے پاس نہیں ہوتا۔ ہمارے ٹیلیفونی دوست عزیزی محمد تقی کے پاس ہوتا ہے جو اس میں حسب ضرورت اضافہ اور ترمیم وغیرہ کرتے رہتے ہیں۔ ہم ابھی تقی صاحب کو فون کئے دیتے ہیں۔ وہ

آپ کو ہمارا رائج الوقت بائیوڈاٹا بھیج دیں گے''۔ وہاب عندلیب سے بات کرنے کے بعد ہمارا ذہن اس عجیب وغریب نکتہ کی طرف گیا کہ پچھلے چالیس برسوں میں قدرت نے ہمیں کئی ٹیلی فونی دوست (Telephonic Friends) کی صحبت سے نوازا ہے جن کے محکمہ ٹیلی فون میں کام کرنے کی وجہ سے تازہ اطلاعات کے معاملہ میں ہماری اولیت اور انفرادیت ہمیشہ برقرار رہی ۔اب اگر ہم ان دوستوں کی فہرست مرتب کرنے بیٹھ جائیں تو ایک لمبا چوڑا شجرہ تیار ہو جائے گا۔ تاہم ان دنوں ہمارے رائج الوقت ٹیلی فونی دوست صرف دو ہیں ۔محمد تقی اور محمد ضمیر الدین ۔ یہ الگ بات ہے کہ محمد ضمیر الدین ہمارے ادب سے اور محمد تقی ادیب سے یعنی خود ہم سے زیادہ واقف ہیں ۔الغرض وہاب عندلیب سے بات چیت کے بعد ہم نے اپنے دوست محمد تقی سے بات کی اور مدعا بیان کر دیا اور ابھی ہم گلبرگہ کے نواح میں داخل ہو ہی رہے تھے کہ وہاب عندلیب کا فون آ گیا کہ اُنھیں ہمارا بائیوڈاٹا مل گیا۔ گلبرگہ پہنچنے کے بعد وہاب عندلیب نے بتایا کہ گلبرگہ یونیورسٹی والے غالباً تمھیں کوئی اعزازی ڈگری دینے کا ارادہ رکھتے ہیں ۔اس پر ہم نے زوردار قہقہہ لگا کر کہا۔''وہاب صاحب! آپ واقعی بڑے معصوم آدمی ہیں ۔آپ ڈگری ملنے کی بات کر رہے ہیں اور ہمیں یہ خدشہ لگا ہوا ہے کہ کہیں یونیورسٹی کے ارباب اقتدار ہم سے انٹرمیڈیٹ کی وہ ڈگری بھی نہ چھین لیں جسے ہم نے نصف صدی پہلے گلبرگہ انٹرمیڈیٹ کالج سے حاصل کیا تھا''۔غرض ہم نے اس بات کو یونہی لیا جیسے ہم دوستوں کے ساتھ مذاق کرتے ہیں ۔تاہم چار پانچ دن بعد ہم نے اپنی دو اگلی کتابوں کے مسودوں کو قطعی شکل دے ہی رہے تھے کہ پھر وہاب عندلیب کا فون آیا''اب کی بار یونیورسٹی والوں کا فون آیا ہے کہ تمہارے بارے میں اگر انگریزی میں کچھ لکھا ہوا ہو تو وہ بھی فوراً روانہ کریں''۔ہم نے اُنھیں ٹالنے کی غرض سے کہہ دیا کہ وہ اس معاملہ میں بھی محمد تقی سے ربط پیدا کریں اور ہمیں اس معاملہ سے دور رکھیں ۔ دوسرے دن وہاب عندلیب نے بتایا کہ محمد تقی نے انگریزی میں اتنا سارا مواد روانہ کر دیا ہے کہ اب کی بار یونیورسٹی والے خود حیران ہیں کہ تم اتنے دنوں تک کہاں چھپے بیٹھے رہے۔ہم نے تب بھی اس بات کو مذاق میں ہی لیا لیکن یونیورسٹی کے

تعلق سے وہاب عندلیب کی گہری سنجیدگی کو دیکھ کر گمان ہوا کہ کہیں یونیورسٹی اس معاملہ میں واقعی سنجیدہ نہ ہو اور اگر خدانخواستہ ایسی ڈگری ہمیں مل گئی تو پھر کیا ہوگا۔ الغرض 12 فروری کو دوپہر میں ہم معمول کے مطابق قیلولہ میں مصروف تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سے انگریزی میں آواز آئی ''کیا میں ڈاکٹر مجتبیٰ حسین سے بات کرسکتا ہوں؟'' ہم رانگ نمبر کہہ کر ریسیورر کھنے ہی والے تھے کہ خیال آیا ذرا دیکھیں تو سہی کہ دوسری طرف کون مذاق کر رہا ہے۔ ہم نے کہا ''میں مجتبیٰ حسین تو ہوں ڈاکٹر نہیں ہوں''۔ اس پہ دوسری طرف سے جواب آیا ''سر! میں گلبرگہ یونیورسٹی کا رجسٹرار ہیرے مٹھ بول رہا ہوں۔ آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ گلبرگہ یونیورسٹی نے آپ کو ڈاکٹریٹ کی باوقار اعزازی ڈگری دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ ابھی ابھی گورنر کرناٹک ہز ایکسیلنسی ہنس راج بھاردواج نے، جو ہمارے یونیورسٹی کے چانسلر بھی ہیں، اس ڈگری کے لئے آپ کے نام کی منظوری دیدی۔ 17 فروری کو ہمارے جلسہ تقسیم اسناد میں آپ کو یہ ڈگری دی جائے گی جس میں آپ کی شرکت ضروری ہے''۔ اس فون کے بعد ہمیں وہ مشہور شعر یاد آ گیا۔

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں، پیمبری مل جائے

گلبرگہ ہم اس ارادے سے گئے تھے کہ ہمدم دیرینہ وہاب عندلیب کے جلسۂ اعتراف خدمات میں شرکت کریں گے اور واپسی میں اپنی جھولی پرانی یادوں سے بھر کر لے آئیں گے۔ مگر اب اس میں ایک اور اعزاز کا اضافہ ہوگیا۔ وہاب عندلیب کے جشن سے صرف ایک دن پہلے اس اعزاز کے اعلان پر ہمیں وہ لطیفہ بھی یاد آیا کہ ایک شخص کے سیدھے ہاتھ کی پانچوں اُنگلیاں غائب تھیں۔ کسی نے اس شخص سے پانچوں اُنگلیوں کے غائب ہونے کا سبب پوچھا تو اُس نے دست بستہ عرض کیا ''حضور! ایک دن میں نے یہ جاننے کے لئے گھوڑے کے منہ میں کتنے دانت ہیں اپنا ہاتھ گھوڑے کے منہ میں ڈالا ہی تھا کہ گھوڑے نے غالباً یہ جاننے کے لئے کہ میرے ہاتھ میں کتنی اُنگلیاں ہوتی ہیں اچانک اپنا منہ مری اُنگلیوں پر بند کردیا اور یوں اُس نے میری اُنگلیاں گن لیں''۔

ہم اس حُسن اتفاق پر غور کر ہی رہے تھے کہ پھر فون کی گھنٹی بجی۔ آواز آئی ''میں گلبرگہ یونیورسٹی سے پروفیسر عبدالحمید اکبر بول رہا ہوں، آپ کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری مبارک ہو''۔ پروفیسر عبدالحمید اکبر گلبرگہ یونیورسٹی میں صدر شعبہ اُردو ہونے کے علاوہ ان دنوں یونیورسٹی کے ڈین بھی ہیں۔ یوں ہمیں فوراً پتہ چل گیا کہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے ''پردۂ زنگاری'' میں کون معشوق چھپا بیٹھا ہے۔ پھر بھی ہم نے انجان بنتے ہوئے پروفیسر عبدالحمید اکبر سے شکایتاً کہا ''جناب! کمال ہے ہم پچھلے بارہ تیرہ دنوں سے گلبرگہ میں ہیں اور آپ سے اب بات ہو رہی ہے۔ رہا ڈاکٹریٹ کی مبارکباد کا معاملہ تو کچھ دیر پہلے آپ کے رجسٹرار صاحب نے ہمیں یہ مبارکباد دیدی ہے۔ آپ کو غالباً اُنہوں نے ہی یہ اطلاع دی ہوگی''۔ کسی قدر جھینپ کر بولے ''بالکل بجا فرمایا آپ نے۔ جب ہمارے رجسٹرار آپ سے بات کر رہے تھے تو میں اُن ہی کے کمرے میں موجود تھا۔ بہر حال اس وقت تو میں آپ کو ایک اور اعزاز کی اطلاع دینا چاہتا ہوں۔ 1940ء میں جب آپ کے والد گلبرگہ کی تحصیلداری سے ریٹائر ہونے والے تھے تو اُنھیں ایک ایسے عربی اُستاد کی خدمات کی ضرورت تھی جو اُنھیں تجوید سے قرآن خوانی کا درس دے سکیں۔ اُس وقت اُنھوں نے میرے والد قاری محمد عبدالعزیز کی خدمات سے استفادہ کیا تھا جن کی عمر اُس وقت چوبیس برس تھی اور اب اُن کی عمر پچانوے (95) برس کی ہو چکی ہے۔ وہ آج شام میں آپ کو مبارکباد کے لئے وہاب عندلیب کے گھر آنا چاہتے ہیں'' سچ تو یہ ہے کہ ہم خود اُن کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتے تھے لیکن پروفیسر عبدالحمید اکبر نے یہ کہہ کر ہمیں ٹال دیا کہ وہ اپنے والد کی خواہش کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے۔ پروفیسر عبدالحمید اکبر کی یہ ادا ہمیں بہت پسند آئی کہ یونیورسٹی کے ارباب مجاز کے سامنے ظاہر ہے کہ اُنھوں نے ہی اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لئے ہمارا نام تجویز کیا تھا لیکن اس کا ہم سے کوئی ذکر تک نہیں کیا۔ ہمیں یہ بات اُردو کلچر کے خلاف نظر آئی۔ بعد میں خیال آیا کہ پروفیسر عبدالحمید اکبر اصل میں عربی کے اُستاد اور عالم بھی تو ہیں۔ غرض شام کو اُن کے والد الحاج قاری محمد عبدالعزیز سے ملاقات ہوئی۔ بڑی محبت اور شفقت سے ہمیں مبارکباد دی، ہار پہنایا اور شال اوڑھائی۔

یہ پہلی مبارکباد تھی جو ڈاکٹر بننے کے بعد ہمیں حاصل ہوئی تھی۔ اس عمر میں بھی اُن کا حافظہ غضب کا ہے۔ عینک کے بغیر پڑھتے ہیں۔ جب ہمارے والد اُن کے شاگرد ہوا کرتے تھے تو ہم پانچ چھ برس کے ہونگے۔ محبوب حسین جگر اور ابراہیم جلیس کے بارے میں اُنھیں کئی باتیں یاد ہیں۔ اُن سے مل کر ہمارا سات دہائی پہلے کا ماضی یاد آ گیا۔ اُن سے ملاقات خود ہمارے لئے ایک اعزاز سے کم نہ تھی۔ دوسرے دن اُنھوں نے وہاب عندلیب کے جلسہ اعتراف خدمات میں بھی شرکت کی اور بڑی دیر تک تقریب میں موجود رہے۔

بہر حال ہم گلبرگہ گئے تھے اپنے پرانے دوست فرزند گلبرگہ وہاب عندلیب کی تہنیتی تقریب میں شرکت کے لئے جو نہایت شاندار اور پروقار تھی مگر دوسرے ہی دن گلبرگہ یونیورسٹی نے ہمیں بھی فرزند گلبرگہ کے کھاتے میں ڈال کر ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری پکڑا دی۔ گلبرگہ والوں کی بے لوث محبت پر ہنسی بھی آئی کہ اُن کے فرزندان گلبرگہ، جواب ماشاللہ چھتر سال کی عمر گذار کر "بابائے گلبرگہ" کہلائے جانے کے مستحق ہو گئے ہیں مگر انھیں وہ اب تک اپنے فرزندوں میں شمار کرتے ہیں۔ اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا۔ گلبرگہ میں اس بار ہمارے ساتھ جو کچھ ہوا وہ اس قدر آنا فانا ہوا کہ ہمیں اب تک یقین نہیں آ رہا ہے کہ ہم واقعی ڈاکٹر بن گئے ہیں۔ تاہم جلسہ تقسیم اسناد میں شرکت کے نتیجہ میں ہمیں یہ اندازہ ہو گیا کہ اعزاز کو حاصل کرنے کے لئے ہمیں کتنی دور تک جلوس کی شکل میں پیدل چل کر جانا پڑے گا۔ مانگے کا گاؤن پہننے کے کیا آداب ہیں۔ حوائج ضروریہ کو کتنی دیر تک اپنے قابو میں رکھنا پڑے گا۔ آدمی جب تک عملی تجربات سے نہ گذرے اُسے کسی بات کی نزاکتوں اور باریکیوں کا پتہ نہیں چل سکتا۔ انشاء اللہ ہمارا یہ تجربہ اگلی اعزازی ڈگریوں کے وقت کام آئیگا۔ ضائع تھوڑی ہی جائے گا۔ سب کچھ اچانک ہو جانے کی وجہ سے ہمارے بعض مخلص حیدرآبادی دوست جیسے محمد میاں، علی ظہیر، محمد تقی اور محمد ضمیر الدین جلسہ تقسیم اسناد میں یوں بھاگم بھاگ پہنچے جس طرح ہماری فلموں میں ہیرو، عین ہیروئن کی شادی کے وقت آ کر اچانک اعلان کرتا ہے ٹھہرو یہ شادی نہیں ہو سکتی۔ آخر میں ہم اس اچنبھے کے لئے گلبرگہ یونیورسٹی

کے ارباب مجاز کے علاوہ گلبرگہ میں اپنے سارے بہی خواہوں اور ہمدردوں کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں ۔ کبھی کبھی واقعی خیال آتا ہے کہ اتنا پیار لے کر ہم کیا کریں گے؟ کہاں رکھیں گے اسے، کدھر رکھیں گے، کیسے رکھیں گے اور کب تک رکھیں گے؟ حضرت شیخ سعدی ایسے ہی موقع کے لئے کہہ گئے ہیں۔

سپُردم بتو مایہء خویش را   تو دانی حساب کم و بیش را

□□

گلبرگہ میں نعت گوئی ما بعد آزادی

ڈاکٹر وحید انجم

صدر شعبۂ اردو، گورنمنٹ پری یونیورسٹی کالج ،الند ،ضلع گلبرگہ

گلبرگہ صدیوں سلطنت بہمنی کا پائے تخت رہا ہے۔ حسن گنگو بہمنی بانی سلطنت اور اسی خاندان کے سپوت فیروز شاہ بہمنی نے گلبرگہ کو اپنے عہد میں ادبی اور روحانی مرکز بنایا۔ فیروز شاہ ایک علم پرور اور بلند پایہ شاعر تھا فیروز تخلص کیا کرتا۔ اس نے علم وادب کو فروغ دیا اس کے عہد میں زبان وادب کا رشتہ اولیاء اور صوفیہ کی خانقاہوں سے جڑا رہا۔ اس کا دور علم وادب کا سنہرا دور کہلاتا ہے۔ حضرت خواجہ بندہ نوازؒ نے اسی عہد میں کئی شعری ونثری تصانیف بطور یادگار چھوڑی ہیں۔ اس طرح نظم ونثر دونوں میں گلبرگہ کو اولیت حاصل رہی ہے۔

1429ء میں جب احمد شاہ بہمنی نے اپنا پایہ تخت گلبرگہ سے بیدر منتقل کیا تو گلبرگہ کی ساری بہاریں جاتی رہیں۔ 1250ء تا 1490ء گلبرگہ اور بیدر دکنی ادب کے اہم مراکز رہے۔ جب بہمنی سلطنت پانچ حصوں میں بٹ گئی تو گولکنڈہ اور بیجاپور دکن کے ادبی مرکز بن گئے۔ 1770ء تا 1947ء گلبرگہ ریاست حیدرآباد میں شامل رہا۔ عہد آصف جاہی میں گلبرگہ دکن کا ایک اہم صوبہ رہا ہے۔ 1883ء میں سلطنتِ آصفیہ نے اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت دی تو گلبرگہ میں علم وادب کی لہر چل پڑی۔ مولوی عبداللہ احمد شہاب نے ماہانہ طرحی مشاعروں کی بنیاد ڈالی۔ جس میں چاقؔ گلبرگوی۔ شوخیؔ ذوقیؔ سلطان شاہ قادری، اور شمش الدین جادوؔ شامل رہے۔ بعد ازاں نواب مبین یار جنگ کے دور میں مولوی مخدوم علی تابؔ، خواجہ عبدالوارثیؔ، عبدالرحیم سیفیؔ ادبی منظرنامے پر جلوہ گر رہے۔ اس دور کے دیگر شعرا میں تمکینؔ کاظمی، مرزا فرحت

اللہ بیگ' بالا سبرامنیم، جنار دھن وکیلؔ اور احمد حسین علویؔ وغیرہ شامل ہیں۔

1940ء میں آستانہ بندہ نواز دیوڑھی روضۂ خرد میں مشاعرے منعقد کئے جانے لگے ۔جس میں حمیدہ بانو مخفیؔ مولوی اسماعیل شریفؔ ازل ۔مولوی سید محمود دلبازؔ ،مولوی عباس حسین لطفیؔ ۔عبرتؔ ، حافظ عبدالرشید، مختار ہاشمیؔ ،منہاج الدین شوکتؔ ،اور خیرؔ بندہ نوازی کے علاوہ اس عہد کے نوجوان شعرا میں احمد حسین سحرؔ قادری، قیومؔ گلبرگوی' شورؔ عابدی' سلیمان خطیبؔ ،حسن خان نجمیؔ ، عثمان صحرائی ، وزیر علی سہروردی ، نیاز گلبرگوی' فضل گلبرگوی' 'حسن محی الدین غیرتؔ' اختر رضوی شوقؔ' معین محمودؔ اور محمود آغوشؔ وغیرہ شامل رہا کرتے تھے۔

1948ء کے پولیس ایکشن نے ملک کا شیرازہ بکھر دیا۔ کئی قلم کاروں نے ترک وطن کیا۔ 1956ء میں لسانی بنیادوں پر گلبرگہ کا تعلق وسیع تر ریاست کرناٹک سے ہو گیا۔ تا حال گلبرگہ ریاست کرناٹک کا ایک اہم ضلع ہے۔ آزادی کے بعد ایک نئی نسل ابھر کر شعری منظر نامے پر نمودار ہوئی۔ جن میں قابل ذکر 'سرورؔ مرزائی' ڈاکٹر فتح محمد فاتحؔ' قمرالدین انصاری قمرؔ' ڈاکٹر راہیؔ قریشی' حمید الماسؔ' 'عبدالرحیم آرزوؔ' سید مجیب الرحمٰن' سید شاہ خسرو حسینی بندہ نوازی' ' عبدالقادر ادیبؔ' خمارؔ قریشی' حکیم شاکرؔ' نصیر احمد نصیرؔ' لطیف حزیںؔ' 'حمید سہروردی' اکرام باگؔ' ' جبار جمیلؔ' محبؔ کوثرؔ' (متوطن کوڑنگل) صابر شاہ آبادی ، رزاق اثرؔ ،صبیح حیدر صبیحؔ (رائچور) معین محمودؔ' ریاضؔ قاصدار سمیع قتیلؔ' حامد اکملؔ ، خالد سعیدؔ' بدرؔ مہدی' مظہر مبارک' ارشاد انجم اور رضیا مجاہد وغیرہ شامل ہیں۔

1970ء کے بعد کی نسل میں ڈاکٹر جلیل تنویرؔ' ڈاکٹر وحید انجم، ڈاکٹر ماجد داغیؔ 'ڈاکٹر صغریؔ عالم' منظور وقارؔ' نورالدین نورؔ'' وغیرہ نے نام کمایا۔ 1980ء اور 1990ء کے درمیان ابھرنے والے شعراء میں 'خلیل مجاہدؔ' وقار ریاض' اکرم نقاشؔ' سعید عارف' خورشید وحید' رخسانہ جبین لاہوری' ڈاکٹر چندا حسینی اکبرؔ' معین منظر' دیدار حسین قادری' قاضی انورؔ' 'سید عتیق اجملؔ وزیرؔ' اطہر معزؔ' باسط فگار، ناصر عظیم، راشد ریاض اور حسن محمود وغیرہ اہم رہے ہیں۔

گلبرگہ میں نعت گوئی کی روایت بہت قدیم ہے۔ جس کے نمونے یہاں کے ادب پاروں میں دستیاب ہیں۔ طوالت کے خوف سے صرف مابعد آزادی کے اہم شعراء کے نام اور نمونے کلام پیش کئے جارہے ہیں۔ جنہوں نے فنِ نعت کے ارتقاء میں اہم رول ادا کیا ہے۔ آزادی سے قبل اور بعد بھی گلبرگہ میں محلّہ ''بٹلی الاوہ''جشن میلا نبیﷺ کے موقع پر نعتیہ مشاعروں کا اہتمام اعلیٰ پیمانے پر کیا جاتا تھا۔ ان مشاعروں میں شرکت کرنے والے چند اہم شعراکے اسمائے گرامی' شکیل بدایونی' مجروح سلطان پوری' شکیلہ بانو بھوپالی، ملک الشعرا حضرت اوجؔ یعقوبی' صلاح الدین نیرؔ مخدوم محی الدین، سکندر علی وجد' سلیمان اریب، مغنی تبسم، وحید اخترؔ، عزیز قیسیؔ' سعید شہیدی' راہی قریشی' افتخار امامؔ وغیرہ ہیں۔ دراصل انہیں شاعروں نے گلبرگہ میں فن نعت گوئی کو فروغ دیا۔ اسکے علاوہ شہر کے آستانوں میں سالانہ عرس شریف کے موقعوں پر نعتیہ مشاعروں کا اہتمام کیا جاتا ہے اسطرح گلبرگہ میں ابتداء ہی سے روحانی فضا اور نعتیہ ماحول رہا ہے۔ قوت گویائی شعور انسان کا امتیاز ہے۔ شاعری اس شعوری قوت کا نام ہے ہندوستانی شعرا عموماً اپنے مجموعہ کلام یا دیوان کا آغاز حمد ونعت سے کیا کرتے ہیں۔ اسی مناسبت سے شعرانے حمد ونعت گوئی کو امتیاز وافتخار سمجھا۔ تاریخ کے ہر دور میں حمد ونعت ومنقبت لکھی گئی اور آج کی صدی تو نعت کی صدی ہے۔ ساری دنیا میں الیکٹرانک میڈیا کے ذریعہ حمد'نعت کی پذیرائی ہورہی ہے۔

گلبرگہ کے بیشتر شعرا نے فن نعت گوئی کی روایت کو برقرار رکھا اور اسکو فروغ دیا۔ یہاں کے بیشتر شعرا نے نعت میں حضورﷺ کے محامد ومحاسن اور معجزات کو قلم بند کیا۔ جو محض الفاظ کی مرصع سازی نہیں۔ بلکہ عشقِ رسول کی سچی ترجمانی ہے اس کے علاوہ دیگر موضوعات' معراج رسولﷺ۔ ولادت نبویﷺ نور محمدی، کردار صورت سیرت، جنگ وجدل ہجرت اور جود وسخا پر مبنی ہیں۔ حضورﷺ سے فراق کا تذکرہ بھی ہر دور میں نعت کا اہم موضوع رہا ہے۔ دیگر شعرا کی طرح گلبرگہ کے شعر کو بھی حضورﷺ سے سچی محبت وعقیدت ہے وہ بھی نعت گوئی کو اپنے مقدر کے سنورنے کا وسیلہ گردانتے ہیں۔ بیشتر نے ''عشق نبی'' کو ہی ایمان کا جز ٹھہرایا ہے۔ چند نمونے پیش ہیں۔

محمد عبدالرزاق چاق:

جشن میلا د مصطفے ہے آ ج ! | عرش آعظم پہ خوش خدا ہے آج
بز م میلا د پر ضیا ہے آ ج ! | جلو ہ گر نو ر کبر یا ہے آ ج

محمد چندا حسینی نامی کوہ سواری:

محمدؐ حبیب خدا بن کے آئے | محمدؐ ہی حق کی رضا بن کے آئے
محمدؐ شفیع الوریٰ بن کے آئے | محمدؐ رسولِ خدا بن کے آ ئے

محمد مخدوم علی تاب :

محمد مصطفیٰ سا کوئی پیدا ہو نہیں سکتا | یہ ہے وہ پیکرِ قدسی کہ ایسا ہو نہیں سکتا
ہے زبان اللہ کی بے شک زبانِ مصطفیٰ | ہے بیان اللہ کا بے شک بیانِ مصطفیٰ

حسن احمد طالبؔ سہروردی :

چہرے سے محمد کے عیاں شانِ خدا ہے | یہ شانِ خدا ہے بخدا جانِ خدا ہے
ثناخوانِ نبیؐ محشر میں بخشے جائیں گے طالبؔ | اگر کچھ نامہ اعمال میں بدعملیاں نکلیں

سید منہاج الدین شوکتؔ:

جب سے ہے ہمیں مصحف عارض سے محبت | ہر روز تلاوت میں ہے قرآن محمدؐ
تاریک ہے کاشانہ اے چاند مدینہ کے | روشن اسے فرمانا اے چاند مدینہ کے

سید شاہ احمد علی۔ مختار ہاشمی :

اس کی ہستی کا سب اجالا ہے | نام حق ، کا بلند و بالا ہے
آئینہ دارِ رسولم آئینہ دارِ خدا | جز خدا و مصطفیٰ مختار شیدا تسیم

حافظ محمد عبدالرشید گلبرگوی :

میں حافظِ قرآن رشیدؔ انکا گدا ہوں | جو مجھ کو ملا ہے وہ محمد سے ملا ہے
کیا لکھے کوئی حُسنِ محمد کی داستاں | مضموں ہے ایسا دل میں نہ عنواں نظر میں ہے

مولوی قمرالدین انصاری قمر :

رحمتیں ظاہر ہوئیں نیرالورٰی کے واسطے
جس نے قرباں کردیا سب کچھ خدا کے واسطے

دوگز زمین مدینے میں عطا ہو یارب
ہو سایۂ گنبد خضریٰ کا سائباں اپنا

عبدالرحیم فضل گلبرگوی :

شیتل کومل بول تمہارے
او بطحا کے راج دلارے

دیکھیں آقا کیا دیتے ہیں
فضل کھڑا ہے ہاتھ پسارے

شورؔ عابدی گلبرگوی :

گنہگارو مبارک اب تو رحمت کا یقیں آیا
شفاعت کی سند لے کر شفیع المذنبین آیا

حبیب حق بنے گا آمنہؓ کی گود کا پالا
امانت فخر کرتی ہے کہ بطحا کا امیں آیا

سرورؔ مرزائی:

چاہنے والے خدا کے ہیں بہت تم ہو حبیب
بخدا ختم ہر اک شانِ وفا ہے تم پرؐ

بطونِ مصطفیٰ نورِ خدا ہے
دو عالم میں جمالِ مصطفیٰ ہے

پروفیسر راہیؔ قریشی:

جو عظمت و رفعت ہے تیری بے حد ہے
اے فرش نشیں عرش تری مسند ہے

ہے رب دو عالم کا یہ ارشادِ عظیم
تخلیق دو عالم کا تو ہی مقصد ہے

ڈاکٹر صغریٰ عالم:

مجھکو خاکِ مدینہ میں تر کیجئے
مرے دونوں جہاں باثمر کیجئے

سردار انبیاء ہیں سردار دو جہاں
کیا کیا بیاں کروں فضیلت رسولؐ پاکؐ

خمارؔ قریشی:

گھر ہے خدا کا اور نگہ باں ہیں مصطفیٰ
جاں ہے کسی کی اور رگ جاں ہیں مصطفیٰ

نقطے سے دائرے کا افق پھیلتا گیا
دونوں جہاں کے مہر درخشاں ہیں مصطفیٰ

صابر شاہ آبادی:

راہِ نبیؐ میں صابر یہ بھوک پیاس کیسی
باہوش ہو جو اتنا وہ ان کا یار کیسا؟
قربِ نبیؐ سے بڑھ کر کیا چاہیے گزارہ
ساقی کے ساتھ رہ کر غمِ روزگار کیسا

حسن محی الدین غیرتؔ:

لہرائے گیسوئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم
پھیل گئی خوشبوئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم
میں کیا جانوں قبلہ کیا ہے کیا جانوں کعبہ کیا
میرا رخ ہے سوئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم

نیاز علی خان نیازؔ گلبرگوی:

مدینہ بندگی کا آئینہ ہے
حرم شانِ ہستی کا آئینہ ہے
جسے کہتے ہیں فردوس بریں
مدینے کی گلی کا آئینہ ہے

عبدالستار خاطر:

روضہ نظر آیا نہ گناہوں کی یہ دولت
میں کب سے مدینے کی طرف دیکھ رہا ہوں
تنہا ہوں مرے ساتھ نہیں کوئی مسافر
ہمراہ ہے عشق، مدینے کو چلا ہوں

ارشاد انجم:

پایا جو کل کلمے کی ہے جاویداں ابد
کھولے گرہ جو ''لا'' کی مسلمان ہے صحیح
دیکھو عرب کی عین میں ہو دیکھنا نصیب
اللہ بھی تو گھر میرے مہمان ہے

رزاق اثرؔ شاہ آبادی:

یاد احمد رہے جب تک یہ میری جان رہے
دل کرے ذکر تو کیوں روح نہ قربان رہے
نہ کوئی عکس نہ سایہ دکھائی دیتا ہے
بس ایک نور سا چلتا دکھائی دیتا ہے

نصیر احمد نصیرؔ گلبرگوی:

تنفس میں بسی ہے بو نبیؐ کی
مجھے ہر پل ہے جستجو نبیؐ کی
سجا نا زندگی کو آیتوں سے
دل و جاں میں بسے خوشبو نبیؐ کی

محبؔ کوثر:

سرکار ہر جہاں میں خدا کے رسول ہیں	جتنے جہاں ہیں آپکے قدموں کی دھول ہیں
سارے عرب میں دین کا ڈنکا بجادیا	جینے کا جاہلوں کو سلیقہ سکھا دیا

حامد اکمل:

داتا کوئی تجھ ساشہؔ والا نہیں دیکھا	دریائے کرم پہ کوئی پیاسا نہیں دیکھا
مداح ہے اللہ بھی، ملک اور بشر بھی	محبوب دو عالم کوئی تجھ سا نہیں دیکھا

ڈاکٹر وحید انجم:

محمد مصطفیٰ پر گر نہ بھیجیں ہم درود انجم	منور نور آسا اپنا چہرہ ہو نہیں سکتا
آپ کی ذاتِ مقدس ہے سراپا رحمت	آپ کے پاس نہیں ہے کوئی میرا تیرا

ڈاکٹر ماجد داغی:

جس کو رسولِ پاک کا دیدار ہو گیا	وہ خوش نصیب واقفِ اسرار ہو گیا
اے نبی میرا وطن ہند ہے جس کے حق میں	آپ کہتے تھے مجھے ٹھنڈی ہوا آتی ہے

صبیح حیدر صبیح:

حسن ازل کے نور کی پہلی ضیا ہیں آپ	سب حسن جس پہ ختم وہ انتہا ہیں آپ
سب ہیں تجلیات رسولِ کریم سے	روشن ہے کائنات رسولِ کریم سے

نورالدین نور گلبرگوی:

تمہارا ذکر ہے ذکر معظم یارسول اللہ	خدا کے بعد تم ہی ہو مکرم یارسول اللہ
رفعتیں تم سے وسعتیں تم سے	بال و پر میں اڑان تم سے ہے

وقارؔ ریاض:

شمس و قمر سے دور بہت آسماں سے دور	عرشِ بریں تلک بھی محمد کی بات ہے
یہ بھی خدا کا فضل و کرم ہے کہ اے وقارؔ	عشقِ محمدی میں لکھی میں نے نعت ہے

قاضی انور:

دنیاداری سے مبرا ہے قبیلہ ان کا — باعثِ رحمتِ حق صرف وسیلہ ان کا
ہم گناہ گار بھلا ان کا علو کیا جانیں — صرف اللہ کو معلوم ہے رتبہ ان کا

حکیم محمد دیدار حسین قادری:

تمہاری دید کی دل میں تمنا یا رسول اللہ — کرے اقرار میرا دل تمہارا یا رسول اللہ
رخ زیبا کو دیکھ کر اس کے — ایک مصور کی یاد آتی ہے

رخسانہ جبین لاہوری:

بے شک ہیں آپ دستگیر سن لیجے میری پکار — صدقے میں جاوں آپ کے کردوں دل و جگر نثار
امت بڑی دکھی ہے اب سرکار کچھ تو ہو کرم — دورِ خزاں یہ ختم ہو بن جائے زندگی بہار

آج بھی شہر گلبرگہ میں نعت گو شعرا کا کارواں رواں دواں ہے۔اس شہر سے بے شمار **نعتیہ مجموعے** شائع ہو چکے ہیں۔جن میں **کلام قمر** بحر اب دعا، **شیون احمدی**، ورفعنا لک ذکرک، **پہلی ضیاء**، **ابر رحمت**، **ابر کرم**، **بیاضِ ثنا**، **رحمت تمام** وغیرہ بے حد مقبول ہوئے۔

گلبرگہ کی فضا ہمیشہ سے **حمد و نعت** کے لئے سازگار رہی ہے۔**گلبرگہ** میں آئے دن محفل نعت اور نعتیہ مشاعروں کا اہتمام ہوتا رہتا ہے۔علاوہ ازیں اولیا کی بارگاہوں پر محفل نعت اور نعتیہ مشاعرے بھی اکثر و بیشتر منعقد ہوا کرتے ہیں۔دراصل یہی ماحول نعت گوئی کی ارتقاء میں ممد و معاون رہا ہے۔

اس شہر سخن وراں کے تقریباً شعرا نے نعت کہی ہے۔یہاں کی خواتین شاعرات بھی نعت گوئی میں اپنا مقام رکھتی ہیں۔دراصل شاعر جب حضور ﷺ کی محبت میں بے خودی کے عالم میں پہنچ جاتا ہے تو دلی جذبات سے سرشار ہو کر آپ ﷺ کے محاسن کو الفاظ کے موتی میں پروتا ہے۔نعت اسی وقت لکھی جا سکتی ہے۔جب حضور ﷺ سے قلبی لگاؤ اور محبت ہو۔اور اسی عقیدت کے اظہار کا نام نعت ہے۔

نعت گوئی کو اکثر لوگوں نے سعادت اور عبادت کہا ہے۔ یہ سعادت گلبرگہ کے تقریباً شعرا کو حاصل رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں روحانی فیوض و برکات سے فیض یاب کرے ان کی نعتیں بے چین قلوب کے لئے تسکین کا موجب ہوں۔ اور بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں یہ نذرانہ نعت مقبول ہو۔ اللہ نعت گو شعرا کو اعلیٰ و ارفع مقام عنایت فرمائے۔ (آمین) □□

بیدر میں اردو شاعری کا ارتقائی سفر

نثار احمد کلیم

موظف شعبۂ تعلیمات ،بیدر

بیدر (کرناٹک) کے مردم خیز اور تاریخ ساز خطے کی عظمت رفتہ کی بازیافت عہد حاضر میں اس کی حیثیت ،اہمیت اور معنویت کی تلاش ونیز مستقبل میں ان شاندار روایات کے احیاء کی جستجو کی غرض سے تاریخی شہر بیدر میں انجمن ترقی اردو اور ہند شاخ بیدر اور یارانِ ادب و دیگر مختلف تنظیموں نے ممتاز اہل قلم و مشاہیر ادب کی خدمات سے استفادہ کرتے ہوئے بیدر میں اردو شاعری اور ادب کا ارتقائی سفر جاری رکھا ہے۔

یہ امر مسلّم ہے کہ بہت شخصیتیں تاریخ کی مرہون منت ہوتی ہیں ۔اگر تاریخ موجود نہ ہوتو ان کے کارنامے آنے والی نسلیں بھول جائیں گی ۔تاریخ شاہد ہے کہ زمانۂ قدیم سے بیدر میں تاریخ ساز شخصیتیں جنم لیتی رہی ہیں۔

بیدر بہمنی دور میں تعلیمی گلشن تھا ۔کئی بلبلا ن ادب نے صفحہ روزگار پر اپنے سر سبز د شادات علمی گلشن اور رنگ برنگ علمی گل بوٹوں کی یادگار چھوڑی ہیں ۔سلطنت بہمنیہ کے دور کا مشہو ر جامعہ اب تک اپنے بانی خواجہ عمادالدین محمود گاوان کی یاد تازہ کرنے کیلئے ایک مینار پر اپنے علم دوست بانی کی زبان حال سے گویا ہے۔

مینارِ مدرسہ ہے کہ ماضی ہے سر بلند	خواجہ جہاں کا جیسے ہے جھنڈا گڑا ہوا
ایک مشعل ادب ہے کہ روشن ہے شہر میں	یا ایک طویل سوچ میں عالم کھڑا ہوا

(سلیمان خطیبؔ)

بیدر میں اردو شاعری کے ابتدائی دور میں سب سے پہلے شیخ آذری کا ذکر اس لئے ضروری ہے کہ آذری فارسی اور دکنی کا شاعر تھا۔ ''بہمن نامہ دکنی'' دکن کی منظوم تاریخ ہے۔ آذری نے ''بہمن نامہ فارسی'' اور اس کا کچھ حصہ دکنی میں نظم کیا ہے۔ اب یہ ناپید ہے آذری کا انتقال ۸۶۶ھ میں ۸۲ سال کی عمر میں ہوا۔

دکن میں مثنوی کا آغاز مذہبی حیثیت سے ہوا۔ نظامی سلطان احمد شاہ ثالث بہمنی ۸۶۷ھ کے دربار کا ملک الشعراء تھا۔ اس کی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کئی حیثیتوں سے اولیت کا شرف رکھتی ہے۔ یہ دکنی زبان کا پہلا خالص ادبی کارنامہ ہے۔ یہ اردو کی طبع زاد مثنوی ہے۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ کا قول ہے کہ یہ اردو میں کسی بادشاہ کی پہلی مدح ہے۔

فیروزؔ بیدری۔ بیدر کا با کمال استاد تھا۔ اس کی مثنوی پیرت نامہ جو تو صیف نامہ میراں محی الدین کے نام سے بھی مشہور ہے۔ اردو منظوم سوانح نگاری میں اولیت کا افتخار رکھتی ہے۔ نصیر الدین ہاشمی اور ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے فیروز کو بیدر کا نامور شاعر تسلیم کیا ہے۔ اسطرح مشتاق بیدری' لطفی بیدری' ملا نظیری فارسی اور دکنی دونوں زبانوں کے شاعر تھے۔ ملا سامعیؔ۔ ملا نظیری کا ہم عصر دکنی و فارسی کا مشہور شاعر و نیز ملاؔ محمود ابراہیم بھی بیدر کا مشہور شاعر تھا۔

بہمنی سلطنت کے خاتمے کے بعد بریدیہ، قطب شاہیہ، عادل شاہیہ وغیرہ سلطنتیں وجود میں آئیں جو آخر میں سلطنت مغلیہ میں ضم ہوگئیں بعد ازاں سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد خود مختار سلطنت آصفیہ قائم ہوئی حیدرآباد پایۂ تخت قرار پایا۔ شاہان آصفیہ نے اردو کی خوب سرپرستی کی۔ حکومت آصفیہ کے زمانے میں بیدر علمی وتہذیبی سرگرمیوں کا مرکز بنا رہا۔ بیدر کی کئی شخصیتیں اردو ادب کی خدمات انجام دیتے رہے۔ بیدر میں شاعری کے ارتقائی دور میں حضرت سید شاہ معین الدین حسینی خاموشؔ جن کا دیوان ''دیوانِ شاہ خاموش'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ آپ کا سن ولادت ۱۲۰۴ھ اور وصال ۴؍ ذی قعدہ ۱۲۸۸ھ کو ہوا۔ وہ نواب افضل الدولہ کا دور تھا۔ آپ صوفی منش بزرگ تھے۔ بیدر سے حیدرآباد منتقل ہوئے اور وہیں وفات پائی۔

ابو الکلام محمد غلام مصطفیٰ عشقی کا مشہور سلام یا شفیع الوریٰ بیرون ہند احترام وعقیدت سے پڑھا جاتا ہے۔اس کے علاوہ وہ اردو میں سلام وحمد ونعت لکھتے ہیں۔

سید حسین سیفی سبحانی بھی صاحب دیوان شاعر گذرے ہیں۔رفیع الدین رفعتؔ کا مجموعہ کلام ''نالہ رفعت'' حبیب اللہ وفا،ولادت حیدرآباد میں ہوئی طویل عرصہ تک بیدر میں رہنے کی وجہ سے شاعر بیدر کہلاتے ہیں۔ان کی مشہور تصانیف شمیم وفا،آصف نامہ منظوم تفسیر پارہ عم مشہور ہیں۔ان کے علاوہ عبدالحمید شوق،دامودھر پنت ذکیؔ،شبیر پاشاہ صاحب قادری شبیرؔ، ابونعیم سید حسین آرزو،عبدالشکور طپشؔ،الیاس احمد سلیم،اکبر علی خاں جلادؔ،عبدالغفار ظفرؔ،میر محفوظ علی آتشؔ،غلام محی الدین کیفؔ،مجموعہ کلام کیف وسرور،ولا اکیڈمی حیدرآباد سے شائع ہوا ہے۔

احمد سعید دیبیؔ بخاری،سلیمان خطیب بھی ضلع بیدر کے شاعر تھے۔ان کے علاوہ شعری ارتقائی سفر کے ہم رکاب شعراء الیاس احمد سعیدؔ،عبدالرحمان جریؔ،عبدالکریم صباؔ،یعقوب خاں اعجاز، عطاؔ کلیانوی،عبدالستار ادیبؔ،عبدالغفور خاکؔ صاحب دیوان شاعر،اللہ بخش بخشیؔ،سید اللہ منتظم پولیس،سردار خان تفضیلؔ،عبدالقادر صوفی رازؔ،محبوب خاں جنوؔ وکیل،محمد بدیع الزماں خاں وکیل نادرؔ،محمد جہانگیر خان جہانگیرؔ،شاہ ابراہیم قادری خلیلؔ،خواجہ نظام الدین،ذکاء اللہ صاحب ذکا، غلام مصطفیٰ خاں مصفاؔ،دوار کاداس خاکیؔ،غلام رسول مجرمؔ،غلام محی الدین فطرت (مخدوم محی الدین کے دادا)،چنداشاہ چنداؔ(شاگرد داغؔ،ظفر جنگ کے مرشد)،سید شفیع الدین سیفؔ،ملتانی بیگ ابوالفیض فیاضؔ،شاہ زین الدین گنج نشینؔ،ضیاء الدین پروانہؔ،بیدر کے ایک اور صوفی منش شاعر حضرت فقیرؔ گذرے ہیں (بحوالہ نذر بیدر'قیوم صادق اور دارلمطالعہ عام بیدر) بعض شعراء دوران ملازمت بیدر میں رہے بیدر ہی کے کہلائے۔

عہد آصفی اور سقوط حیدرآباد کے بعد مشاعروں کی محفلیں خانقاہ حضرت ابوالفیض جس کے روح رواں حضرت سید معین الدین حسینی سجادہ نشین ہوا کرتے تھے۔ان کے علاوہ ناظم ضلع عباس بیگ اور عباس علی خاں بزمؔ بھی مشاعروں کا اہتمام کرتے تھے۔اسی سلسلے کو حکیم محمد بیگ

محمودی رمزؔ نے ''صحنِ مسیحا'' میں اس روایت کو جاری رکھا۔ جناب ایس آئی قادری ایڈیٹر'' ادبی عکاس'' مشاعروں کا اہتمام کیا کرتے تھے۔ بیدر میں اردو شاعری کے ارتقائی سفر میں رشید احمد رشیدؔ کا اہم حصہ ہے جن کے دو دیوان ''خمِ ابرو'' اور ''الہام ویقین'' شائع ہو چکے ہیں۔ محسنؔ کمال، عبدالستار ادیبؔ، ظہیرؔ عظمت اور قیصر رحمٰن بیدر کے آسمانِ شاعری کے نمائندہ شاعر ہیں۔ محسنؔ کمال ایم ایل سی صاحب دیوان شاعر گذرے ہیں جن کی دو شعری تصانیف اور شہر غزل، منظوم تخلیق'' ''اندراج'' اور ''حرف حرف لہولہو'' شائع ہو چکی ہیں۔ ''حرف حرف لہولہو'' موصوف کے انتقال سے چند مہینوں قبل شائع ہو چکی تھی۔ جس کی رسم اجرائی انجمن ترقی اردو ہند شاخ بیدر جناب سید عبدالماجد شمیم ایڈوکیٹ صدر انجمن کی سرپرستی میں عمل میں آئی تھی۔ اس تقریب میں جناب زاہد علی خان ایڈیٹر روزنامہ سیاست حیدر آباد اور جناب عبدالوہاب عندلیب گلبرگہ سابق صدر اردو اکاڈمی بنگلور نے شرکت فرما کر تقریب رسم اجرائی کو رونق بخشا۔ اس موقع پر ایک مشاعرہ کا انعقاد بھی عمل میں آیا تھا۔ شعراء میں صلاح الدین نیرؔ، رئیس اختر اور مسعود عابد قابل ذکر ہیں۔ ونیز صبا رشیدی بھی بیدر کی اردو شاعری کے ارتقائی سفر کے ہم سفر رہے ہیں۔ محمد غوث سحر اور عبداللطیف بگدلیؔ بھی اس ارتقائی سفر میں مدد ومعاون رہے۔ جن شعراء نے نمایاں خدمات انجام دی ہیں ان میں جناب مظہر محی الدین لکچرار بیدر متوطن ہبلی اور جناب ڈاکٹر خالد سعید لکچرار بیدر متوطن گلبرگہ موجودہ صدر شعبۂ اردو مولانا ابوالکلام آزاد اردو نیشنل یونیورسٹی حیدر آباد ونیز ڈاکٹر حشمت فاتحہ خوانی لکچرر صدر شعبۂ اردو کرناٹک کالج بیدر متوطن گلبرگہ اور جناب ظہیر احمد خان لکچرار بیدر بھی قابل ذکر ہیں۔

بیدر کے جدید صاحب دیوان شعراء میں مسز ریحانہ بیگم جن کے تین شعری مجموعے پہلی کرن، آنگن آنگن پھول اور دامن دامن میری خوشبو، فضل الرحمٰن ہادی کا شعری مجموعہ ''عکس احساس''، عبدالغفور خاکؔ کا شعری مجموعہ ''تنویر خاک' بھی شائع ہو چکا ہے۔ اور باسط خان صوفیؔ کا نعتیہ دیوان ''گنجینۂ گوہر'' شائع ہو چکے ہیں۔ ونیز علیم الدین چندا کا کلام بھی شائع ہو چکا ہے۔

جناب قیصر رحمٰن، نثار احمد کلیم، امیر الدین امیرؔ، میرؔ بیدری، اور جناب مرزا محمود علی بیگ چشتی نظامی کے شعری مجموعوں کی اشاعت کے روشن امکانات ہیں۔ آج کل بیدر میں شعری محفلوں کے روح رواں شعراء میں امیر الدین امیرؔ، سخاوت علی سخاوت، باسط خان صوفیؔ، سید جمیل احمد ہاشمیؔ، انجینئر احمدؔ بیدری، وحید مرادؔ، ڈاکٹر عبدالوحید بہارؔ، لطیف خلشؔ، دیویندر کملؔ، مقصود احمد مقصود، عبدالمقتدر تاجؔ، سید منصور احمد قادری طالبؔ، قیصر رحمٰنؔ، نثار احمد کلیمؔ اور میرؔ بیدری ہیں۔

انجمن ترقی اردو ہند شاخ بیدر، یاران ادب، ادارۂ ادب اسلامی بالترتیب نثار احمد کلیم، میر بیدری، سید جمیل احمد ہاشمی کی سرپرستی میں ماہانہ مشاعروں کا انعقاد و نیز دیگر ادبی انجمنوں میں جن میں عبدالمقتدر تاجؔ کی سرپرستی میں مشاعرے کا انعقاد بھی اردو شاعری کے ارتقائی سفر میں خاص مقام رکھتا ہے۔

جناب عبدالقدیر سکریٹری علامہ اقبال ایجوکیشن سوسائٹی شاہین ادارہ جات کی سرپرستی میں مشاعروں اور ادبی محفلوں کا انعقاد عمل میں لایا جاتا ہے۔ و نیز بیدر اتسو میں بھی مشاعرے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ بیدر کی اردو شاعری کے ارتقائی سفر میں اگر ان محفلوں کا تذکرہ نہ کیا جائے تو بڑی ناانصافی ہوگی۔ جناب مرزا محمود علی بیگ چشتی نظامی کی سرپرستی میں ہر ہفتہ محفل نعت و شعری نشستوں کا انعقاد عمل میں آتا ہے۔ ہر ہفتہ یہ محفلیں اردو شاعری کے ارتقا کی روح رواں ہیں۔ جناب سید شاہ فرید اللہ علوی عرف سالار پاشاہ صاحب، سید عمر (کرناٹک لیڈر) سید شاہ اسد اللہ علوی موظف پرنسپال، سید منصور احمد قادری طالبؔ اور نثار احمد کلیمؔ کی قیام گاہوں پر منعقد ہوا کرتی ہیں، جو سرزمین بیدر کے لئے قابل فخر ہیں۔ ان محفلوں میں مرزا محبوب پر جوش ترنم سے اردو غزل و نعت کی محفلوں کو گرماتے ہیں۔ ان محفلوں کے انعقاد میں جناب افروز پاشاہ صاحب لکچرار کا بھرپور تعاون رہا کرتا ہے۔

اردو شعر و ادب کی محفلوں سے بیدر کے شعر و ادب کی آبرو قائم ہے بلکہ فزوں تر ہوتی جارہی ہے۔ مستقبل مایوس نہیں ہے۔ بیدر میں نثر نگار بھی ہیں اور شاعر بھی ڈاکٹر مقبول احمد لکچرار

اود گیر سے مشاعروں میں حصہ لیا کرتے ہیں۔

مخفی مبادا کہ وہ شعراء جنہوں نے انہی تخلیقات کو اپنا سرمایۂ حیات جانا ہے وہ یقیناً پورے اعتماد کے ساتھ اپنے سرمایہ کو آئندہ نسلوں کے لئے محفوظ رکھنا چاہے گا۔ اس اعتماد کو برقرار رکھتے ہوئے میر بیدری نے جس کاوش اور جستجوئے پیہم کے ساتھ بیدر کے شعراء کے کلام کا مجموعہ ''باقہ'' شائع کرنے کا جواقدام کیا ہے وہ قابل تحسین ہے جو بیدر کی اردو شاعری اور شعراء کے کلام کی ایک دستاویز ہے۔ آج سے پندرہ سال قبل جناب ماجد داغی کا ایک مضمون بیدر کی ادبی تاریخ سے متعلق انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی کے ترجمان ''ہماری زبان'' میں شائع ہو چکا ہے جس میں موصوف نے بیدر کے ادیب وشعراء کا تذکرہ کیا ہے جن میں دیگر ادیب وشعراء کے ساتھ محسن کمال، چرن سنگھ چرن عطا کلیانوی، نثار احمد کلیم، سید عبدالماجد شمیم ایڈوکیٹ کا خاص کر ذکر ہے۔ مخفی مبادا کہ بیدر کے اردو ادب وشاعری کا ماضی، حال اور مستقبل درخشندہ و تابندہ ہے اور رہے گا۔ ☐☐

(بہ شکریہ جناب یوسف رحیم بیدر ''مؤلف باقہ'')

ضلع رائچور کا ادبی منظر نامہ

ناظم خلیلی، رائچور

جنوبی ہند کی تاریخ کے گلیاروں میں گھومتے گھامتے اگر آپ اچانک تنگبھدرا اور کرشنا جیسی پراسرار ندیوں کی گود میں ایک نیم غنودہ ضلع رائچور میں نکل آئیں تو میرا مشورہ ہیکہ آپ حیرت و استعجاب جیسی فطری صفات کو اس کے باب الداخلہ پر ہی چھوڑ دیں کیونکہ قدم قدم پر حیران او متعجب ہوکر آپ اپنے آپکو نڈھال محسوس کرنے لگیں گے۔

دو عظیم دریاؤں کے بیچ واقع ہونے کی وجہ سے ضلع رائچور کو ''دوآبہ'' بھی کہا جاتا ہے اور اس کی تاریخ ہمیں تقریباً تیسری صدی قبل مسیح تک لے جاتی ہے اور اشوک اعظم اور گوتم بدھ جیسی شہرہ آفاق شخصیتوں کے دمکتے ادوار میں لا کھڑا کرتی ہے۔ جہاں رائچور کا قلعہ ہمیں موریان راجاؤں کی چھتر چھایا کی یاد دلاتا ہے وہیں ہمیں ہوائسلا، یادوا، دیواگری، وجے نگر، بہمنی اور عادل شاہی سلطنتیں بھی دعوت نظارگی دیتی نظر آتی ہیں۔ شہر رائچور کا ایک گہرا تاریخی نقش پا ''نورنگ دروازہ'' کے نام سے جانا جاتا ہے اور یہ اپنی پشت پر سات سو سالہ قدیم وجے نگر سلطنت کی چھاپ لیئے ہوئے ہے۔ مختلف مذہبوں، زبانوں، تہذیبوں، سلطنتوں اور رجواڑوں کی گذرگاہ مانا جانے والا یہ شہر ۱۹۴۷ء کی آزادی سے قبل کے اپنے آخری دور میں سلطنت عثمانیہ کے دائرۂ عمل و اختیار میں شامل رہا اور پھر ۱۹۵۶ء میں سقوط ریاست کرناٹک کے بعد مستقل طور پر کرناٹک کا ایک ضلع بن گیا۔

زبان اردو کی شیرین اور دلفریب لب و لہجے نے شمالی مزاج اور دکنی انداز کو اپنے اندر سموتے ہوئے عوام الناس کو کافی متاثر کیا اور نامور شعراء و ادباء اردو ادب کے کینوس پر اپنی ذہنی

تابندگی اور تخلیقی صلاحیتوں کے ساتھ ابھر کر درخشاں ہو گئے۔ خصوصی طور پر حیدرآباد کرناٹک علاقے میں اردو کا طوطی بولنے لگا۔ ضلع رائچور اور شہر رائچور کے شعراء وادباء کے نام ان کے تخلیقی سالوں، کہنہ مشقی، پختگی عمر و تصنیفات وغیرہ کی رو سے ذیل میں درج ہیں۔ اگر اس ذیل میں تقدیم وتاخیر کی اغلاط در آئیں تو اسے راقم الحروف کی کم علمی یا کم فہمی پر محمول فرمائیں۔ پچاس ناموں کی اس طویل فہرست ملاحظہ فرمائیں:

نشان	نام شاعر	دور	تصنیف یا تصنیفات	علاقہ
1	رزمی اورنگ آبادی	1940۔1960	نہیں	رائچور
2	قتال احمد بلبہ ر	1945 - 65	پہلے صاحب دیوان شاعر	رائچور
3	سید علی حیدر حیدر	1945 - 70	نہیں	رائچور
4	سید مصطفیٰ حسین واصف	1945 - 90	نہیں	رائچور
5	غلام رسول دستگیر	1945 - 70	نہیں	رائچور
6	عبدالشکور واجد	1945 - 70	نہیں	رائچور
7	محمد عبدالستار شاطر	1945 - 70	نہیں	رائچور
8	سیدہ خورشید زہرہ	1950 - 08	نہیں	رائچور
9	پانڈورنگ راؤ پواری	1950 - 70	نہیں	رائچور
10	نندا کنی مدھوراو	1950 - 70	نہیں	رائچور
11	عبدالقادر مجازؔ	1950 - 85	نہیں	رائچور
12	رحمٰن جامیؔ	1955 - 08	کئی مجموعہ ہائے کلام شائع ہو چکے ہیں	رائچور
13	محی الدین محیؔ	1955	نہیں	رائچور
14	مجید موج	1955 -	نہیں	رائچور
15	ڈاکٹر مدنا منظرؔ	1955 -	نہیں	رائچور
16	حسن رضا	1955 - 90	نہیں	رائچور

17	عثمان عارف	1955	نہیں	رائچور
18	شیدا رومانی	1955 - 08	درد کا سورج	رائچور
19	راج پریمی	1955 - 08	ایک عدد	--
20	لیق راؤ قمر	1950	نہیں	گنگاوتی
21	گزر رائچوری (مزاحیہ)	1955	نہیں	رائچور
22	قاسم القادری (ڈھکتی)	1955 - 08	ایک عدد نعتیہ فردوس سخن	رائچور
23	رحمن راہی	1950	نہیں	رائچور
24	فیض الرحمن فیضی	1955 - 06	نہیں	رائچور
25	قدوس ناظم	1955 - 04	نہیں	رائچور
26	حمید رائچوری	1955 -	نہیں	رائچور
27	صبیح حیدر صبیح	1955 -	ایک عدد	رائچور
28	وحید انجم	1955 -	--	کپل
29	ہاشم بہار	1955 -	--	رائچور
30	یٰسین عامر	1955 -	--	رائچور
31	علامہ خیر رینوی	1955 -	--	رائچور
32	اقبال رائچوری	1955 -	--	رائچور
33	وحید واجد	1958 - 08	--	رائچور
34	امیر اڈپی کر	1960 -	--	گنگاوتی
35	یون رائچوری	1960 -	ایک عدد مجموعہ	کپل
36	لال محمد مجاہد	1960 - 08	--	رائچور
37	ہونپا مسافر	1960 -	--	رائچور
38	مظہر لطیف	1960 -	--	رائچور

39	قیصر جعفری	1965 - 08	--	رایچور
40	قیصر رزاق	1965 - 08	--	رایچور
41	باسط توقیر	1965 -	--	رایچور
42	اعظم ندیم	1965 -	--	رایچور
43	ظہیر بابر	1968 - 08	بارانہ	رایچور
44	ناظم خلیلی	1968 - 08	نہیں	رایچور
45	وہاب آزاد	1972 - 08	نہیں	رایچور
46	اعجاز شاہین	1973 - 08	نہیں	رایچور
47	افتخار شکیل	1975 - 08	نہیں	رایچور
48	مسکین رایچوری	1999 - 08	نہیں	رایچور
49	جمیل نامی	2000 - 08	نہیں	رایچور
50	عرفان رایچوری	2000 - 08	نہیں	رایچور
51	عقیل احمد انصاری	2000 - 08	نہیں	رایچور
52	بانو بیگم	1975 - 08	سہ لسانی شاعرہ، دو مجموعے بھی ہیں	رایچور
53	سید شاہ تاج الدین	1970 - 08	مذہبی شاعر	رایچور

نثر نگار :

01	حبیب صدیقی	1950 - 08	(دل کا داغ (ناول)، گلاب کی بیٹی (کتاب))	رایچور
02	م۔ صبوحی	1965 - 75	افسانہ نگار کسی مجموعے کے چھپنے کی اطلاع نہیں	رایچور
03	حمیدہ بیگم	ایضاً	افسانہ نگار	رایچور
04	حسین پاشاہ عامر	ایضاً	ایضاً	رایچور
05	وحیدہ واجد	ایضاً	تنقید نگار (کبھی کبھار)	رایچور
06	لال محمد مجاہد	ایضاً	افسانہ نگار (کبھی کبھار)	کوئی مجموعہ نہیں چھپا
07	شجاعت علی خاں ایضاً		طنز و مزاح نگار	رایچور

08	نورمحمد نورتن	ایضاً	مضمون نگار	رائچور
09	خورشید گلنار	ایضاً	افسانہ نگار (کبھی کبھار)	رائچور
10	شریف انور	ایضاً	کرچیں (افسانوں کا مجموعہ)	رائچور
11	عابد عادل	1970 - 85	مجموعہ نہیں چھپا	رائچور
12	اعظم عرفان	1975 - 08	سنگلاخ زمینوں کا چاند (مجموعہ)	رائچور
13	حمید نثار	1975 - 08	مجموعہ نہیں چھپا	رائچور
14	ناظم خلیلی	1975 - 08	ایضاً	رائچور
15	ناصر شطاری	1975 - 85	ایضاً	رائچور
16	سمیرا حیدر	1976 - 08	گہن خواب اور کلیاں، خرمذی رشتے	رائچور
17	آفتاب سلیم (دو حضرات) 1980		ناول سیاب کی دلال	رائچور
18	شمیم حسین	1980	افسانہ نہیں چھپا (افسانہ نگار)	رائچور
19	ضیاء مجاہد	1970 - 85	ایضاً	رائچور

رائچور کے نثر نگاروں کی فہرست بھی شاعروں کی فہرست جیسی طویل نہ سہی ایسی کوئی مختصر بھی نہیں۔ان نثر نگاروں میں بعض نام آگے بڑھ کر قومی سطح پر بھی ابھر آئے اور انہوں نے اپنی خلاقانہ صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ان میں دو چار کی کتب اور مجموعے شائع نہ ہوئے، حالانکہ انہوں نے کافی مواد تخلیق کیا اور چار کے شائع ہوئے اور انہیں صاحب کتاب ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ اس ذیل میں کرناٹک اردو اکیڈمی کا بھی بڑا تعمیری و موثر رول رہا۔نثر نگاروں کی اس طویل فہرست میں جس میں تقریباً بیس قلم کار شامل ہیں۔

رائچور کا ادب جہاں کرناٹک کے بعض دوسرے صوبوں کے مقابلے میں زیادہ وقیع اور اہمیت کا حامل ہے وہیں بعض دوسرے صوبوں کے مقابلے میں پست بھی۔گلبرگہ کے شعری اور نثری ادب نے پچھلی چار دہائیوں میں جس ثابت قدمی سے ترقی کی ہے وہ حیرت انگیز بھی ہے اور

لائق ستائش بھی ۔ رائچور کی ادبی بدحالی کی بڑی وجوہات یہاں کے ادیبوں اور شاعروں کی آپس میں نااتفاقیاں اور ایک دوسرے کی شخصیت کو ایک دوسرے کی پشت پر ہر طرح سے کنڈم کرنے کی کوششیں، معقول ادبی انجمنوں کی غیر موجودگی اور عوام میں ادبی شعور کی کمی اور علمیت کا فقدان ہیں ۔

عوام الناس کو شاید یہ بات معلوم کر کے ایک دھکہ لگے کہ آج کا ادب عام آدمی کے علمی شعور اور ذہنی دسترس سے ایک چھلانگ آگے ہو گیا ہے۔ آج کا بھرپور سائنسی اور تکنیکی شعور رکھنے والا قلمکار عوام کے ساتھ رہتے رہتے اور عوام کے شانہ بہ شانہ، چلتے چلتے، یکا یک آگے بڑھ کر کانکرڈ طیارے پر سوار ہو گیا ہے اور آن واحد میں دنیا کے کئی چکر لگا رہا ہے اور وہاں سے اسے جو تصویر دنیا کی نظر آرہی ہے وہ اس میں سے لاکھ کوشش کے باوجود بھی اپنے ملک یا اپنے وطن کی شناخت نہیں کر پا رہا ہے اور اس برق رفتاری کی وجہ سے نا ہی اسے کوئی آدمی نظر آرہا ہے اور نا ہی اس کا مذہب۔ نا ہی وہ وہاں سے کسی کے رنگ میں فرق محسوس کر سکتا ہے اور نا ہی کسی کی نسل میں تمیز۔ لہٰذا وہ جھنجھلا کر پوری دنیا کو ایک ''گلوبل ولیج'' کہہ اٹھتا ہے اور پلیٹ کر بلیک بورڈ پر لکھے اس شعر کو

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا　　　ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

کاٹ دیتا ہے کیونکہ اسے اس شعر سے تنگ نظری کی بو آنے لگی ہے۔ ایسا اس لئے بھی ہوتا ۔□□

حیدر آباد کرناٹک کے اردو ادب پر ترقی پسند تحریک کے اثرات

ڈاکٹر جلیل تنویر

موظف صدر شعبہ اردو ، گورنمنٹ کالج، گلبرگہ

ہندوستان میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کے بعد ملک کی کئی زبانوں میں ترقی پسند ادب کے زیر اثر مارکسی فکر و نظر کی تشہیر کا آغاز ہوا۔ ادب کو زندگی سے ہم آہنگ کرنے اور معاشرہ میں ایک سائنٹفک اور ترقی پسند نظریات کو فروغ دینے میں اس تحریک کا زبردست رول رہا ہے۔ ہندوستان کی دیگر زبانوں کی طرح اردو میں بھی ترقی پسند نظریات کا چلن عام ہوا۔ سجاد ظہیر، احمد علی، جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیضؔ، عصمت چغتائی، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، علی سردار جعفری، مخدوم محی الدین، کیفی اعظمی جیسے فنکاروں نے اپنی نگارشات کے ذریعہ ترقی پسند فکر کو عام کیا۔ علی گڑھ تحریک کے بعد یہ اردو کی ایک توانا اور فعال تحریک تھی۔ 1936ء سے 1947ء تک ترقی پسند تحریک نے اردو کے کم و بیش ہر فنکار کو متاثر کیا۔

حیدر آباد ابتداء سے اردو کا مرکز رہا ہے۔ یہاں کی آصفیہ سلطنت نے اردو زبان و ادب کی جو خدمت انجام دی ہے وہ تاریخ کا ایک سنہرا باب ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہاں بھی سیاسی، معاشی، اور سماجی تبدیلیاں رونما ہوتی گئیں۔ ترقی پسند تحریک کو پروان چڑھنے میں یہاں کا ماحول کافی سازگار تھا۔ چنانچہ مخدوم محی الدین سلیمان اریب، راج بہادر گوڑ، حسینی شاہد، زینت ساجدہ جیسی شخصیتوں نے یہاں کے ادبی ماحول کو ترقی پسندی کی طرف مائل کیا اور ایک قلیل عرصے میں حیدر آباد کا ادبی سرمایہ ترقی پسندیت سے مالا مال ہو گیا اور حیدر آباد ترقی پسندوں کا ایک مرکز

بن گیا۔ حیدرآباد کرناٹک کے موجودہ اضلاع گلبرگہ بیدر رائچور سابق ریاست حیدرآباد کے اضلاع تھے۔ چنانچہ حیدرآباد کی تحریک کا ان پر اثر انداز ہونا لازمی تھا۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کی ادبی فضا پر بھی ترقی پسندوں کا قبضہ تھا۔ اس جامعہ سے فارغ طلباء اپنے ساتھ ترقی پسند رجحانات لئے اپنے شہروں میں پھیل گئے۔

گلبرگہ ابتداء سے ہی اردو ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ بہمنی دور سے ترقی پسند دور تک یہاں کئی ادبی رویوں کی آبیاری ہوتی رہی ہے۔ 1948ء سے قبل اور اس کے بعد تقریباً 1960ء تک یہاں ترقی پسند ادب کا کافی چرچا رہا۔ گلبرگہ میں جن قلم کاروں کے ہاں ترقی پسند رجحانات ملتے ہیں۔ ان میں سلیمان خطیب، شور عابدی، فضل گلبرگوی، عبدالرحیم آرزو، اکرام صہبائی، حمید الماس، وقار خلیل، سلام نورس، وہاب عندلیب، عبدالقادر ادیب وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

حمید الماس نے اپنی شاعری کی ابتداء ترقی پسند رجحانات کے تحت ہی کی۔ بعد ازاں وہ جدیدیت کی طرف مائل ہوئے۔ وقار خلیل ترقی پسند تحریک سے راست متاثر رہے۔ ان کے کلام میں ترقی پسند رجحانات واضح طور پر ملتے ہیں۔ اسی طرح سلیمان خطیب کی کئی نظمیں ترقی پسند ادب کی منہ بولتی تصویر ہیں۔ مثلاً ''کاٹو کھیتاں کاٹو رے''

''ایسا ہے اب آئے گا''

''ٹھنڈا ٹھنڈا موٹ کا پانی'' اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔

شور عابدی گلبرگہ کے ایک اہم ترقی پسند شاعر ہیں ان کا مجموعہ کلام ''خم کا کل'' ترقی پسند کا ترجمان ہے۔ عبدالرحیم آرزو کی نظموں اور غزلوں میں بھی ترقی پسند رجحانات کی گونج سنائی دیتی ہے۔

اردو کے مایہ ناز ادیب ابراہیم جلیس کا تعلق بھی گلبرگہ سے رہا ہے۔ اپنے دور کے ممتاز ترقی پسند ادیب تھے۔ زرد چہرے، چالیس کروڑ بھکاری ایک ملک دو کہانی 'نیکی کر تھانے جا' جیسی

کتابوں کے خالق نے گلبرگہ میں ترقی پسند رجحانات کو کافی فروغ دیا۔ اسی طرح ان کے بھائی محبوب حسین جگر بھی ایک ممتاز ترقی پسند تھے۔ حیدرآباد میں کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کے کامیاب انعقاد میں ان کی ان تھک مساعی قابل ستائش اور ناقابل فراموش ہے۔ انھوں نے افسانے بھی لکھے لیکن عمر کا زیادہ حصہ بہ حیثیت صحافی روزنامہ ''سیاست'' میں گذارا۔ اور اس اخبار کے ذریعہ سیکولر اور ترقی پسند افکار کو فروغ بخشا۔ اسی خاندان کے ایک اور اہم شخصیت مجتبیٰ حسین ہیں۔ جن کی ادبی زندگی کا آغاز ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ہوا۔ انھوں نے بھی اپنی تحریروں کے ذریعہ راست یا بالراست ترقی پسند نظریات کو پیش کیا عبدالقادر ادیب گلبرگہ کے ممتاز شاعر و ادیب گذرے ہیں ان کے ہاں بھی ترقی پسند رجحانات کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ مجتبیٰ حسین کی طرح ان کے ہم جماعت اور دوست وہاب عندلیب بھی جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کی ادبی سوغات میں ترقی پسند خیالات لئے گلبرگہ واپس ہوئے۔ ان کی تحریروں میں بھی ترقی پسند رجحانات و خیالات کی گونج سنائی دیتی ہے۔

نجم الثاقب شحنہ اگر چہ شاعر ادیب نہ تھے۔ لیکن اپنے ترقی پسند ذہن و فکر کے باعث ترقی پسند فنکاروں میں کافی معزز اور محترم تھے۔ انھوں نے حیدرآباد سے ایک رسالہ ''نظم'' شائع کیا۔ اگر چہ اس کے چند ہی شمار ے منظر عام پر آئے۔ لیکن اس کو ملک کے ممتاز ترقی پسند فنکاروں کا تعاون حاصل تھا۔ شحنہ صاحب بعد ازاں یادگیر منتقل ہوئے۔ گلبرگہ میں ترقی پسند خیالات و افکار کو فروغ دینے والوں میں کامریڈ حسن خاں نجمی کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اگر چہ انھوں نے بذریعہ قلم ترقی پسندی کی تشہیر نہیں کی لیکن مختلف ادبی جلسوں اور نشستوں میں ترقی پسند خیالات کی خوب آبیاری کی۔ سید مجیب الرحمٰن ایک ترقی پسند ادیب ہیں۔ ان کی تحریریں اور تقاریر مارکسی فکر کی آئینہ دار ہیں ''ماورائے شعور'' ان کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ ابراہیم ماموں، رشید جاوید اور

سید عثمان وغیرہ ٹریڈ یونین لیڈروں نے اپنی تقاریر سے ترقی پسند فکر عام کیا۔

1955ء کے بعد گلبرگہ کے ادبی افق پر شکیب انصاری کا نام نمایاں ہے۔ ان کے افسانوں میں ترقی پسندی کی جھلکیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔ ''گوتم کی واپسی'' ان کا کامیاب افسانہ ہے۔ جو اپنے وقت کے معروف اخبار ''آئینہ'' میں بڑے اہتمام کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ شاہد فریدی کے افسانے ماہنامہ بیسویں صدی کی زینت بن چکے ہیں۔ ان کے ہاں بھی ترقی پسند اسلوب اور خیال پایا جاتا ہے۔

1970ء کے بعد گلبرگہ میں شاعروں اور افسانہ نگاروں کی ایک نئی پود ابھر کر آئی ان میں معین محمود، حمید سہروردی، اکرام باگ، بشیر باگ، ریاض قاصدار، حکیم شاکر، خمار قریشی، لطیف نصیر، احمد نصیر، جبار جمیل، خالد سعید، جلیل تنویر، حشمت فاتح خوانی، وحید انجم، میر شاہ نواز شاہین، [illegible] عالم اکرم نقاش، کوثر پروین، امجد جاوید، انجم باگ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان تمام فنکاروں کی ذہنی تربیت راست یا بالراست ترقی پسند تحریک ہی کی مرہون منت ہے۔ بعد ازاں ان میں بیشتر فنکار جدیدیت میں داخل ہو گئے۔ محب کوثر کے ہاں بھی ترقی پسند رجحانات کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ محب کوثر کی احتجاجی لے اس کی عمدہ مثال ہے۔ حیدرآباد کی طرح گلبرگہ میں بھی 1985ء کے بعد انجمن ترقی پسند مصنفین کا احیاء عمل میں آیا۔ ڈاکٹر طیب انصاری اس کے صدر اور ڈاکٹر جلیل تنویر معتمد تھے۔ اس انجمن کے تحت کئی ادبی اجلاس منعقد ہوئے۔ اور شعر و ادب کی کافی مباحث بھی ہوئے۔ جلیل تنویر اور وحید انجم کے افسانوں میں ترقی پسند رجحانات واضح طور پر نمایاں ہیں۔ رشید جاوید کے افسانے بھی ترقی پسندی کی ترجمان ہیں۔

گلبرگہ کی طرح بیدر کے بعض قلمکاروں کے ہاں ترقی پسند رجحانات کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ صلاح الدین نیر، رئیس اختر، محسن کمال اور ارشاد انجم ریحانہ بیگم کی تخلیقات اس ضمن میں پڑھی جاسکتی ہیں گلبرگہ کی بہ نسبت بیدر میں ترقی پسند رجحانات کا فقدان نظر آتا ہے۔

رائچور کی سرزمین بھی ترقی پسند ادب کے لئے سازگار نہیں رہی سوائے چند ایک کے

جنہوں نے ترقی پسند نظریات کو اپنی تحریروں کا حصہ بنایا۔ زینت ساجدہ اس تحریک کی فعال کا رکن رہی ہیں۔ رائچور کے دیگر فنکار اعظم عرفان، شریف انور، ناظم خلیلی اور سمیرا حیدر کے یہاں کہیں کہیں ترقی پسندی کا احساس ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں شیدا رومانی، فیض الرحمٰن، وحید واجد کے یہاں ترقی پسندی کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ ان تمام فنکاروں کے ہاں شعوری یا غیر شعوری طور پر ترقی پسند رجحانات در آئے ہیں۔

غرض ترقی پسند تحریک اردو کی ایک فعال منظم اور توانا تحریک کا نام ہے صرف دس پندرہ سال میں اس تحریک نے اردو ادب کے سرمایہ میں گراں قدر اضافے کئے۔ اور ادب کی ایسی راہیں متعین کیں کہ بعد کے فنکار مدتوں انہیں راہوں پر چل کر شعر و ادب کی آبیاری میں مصروف ہو گئے۔

حیدر آباد کرناٹک کے اردو ادب پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ملک کے دیگر حصوں کی طرح یہاں کے اہل قلم نے بھی اپنے پیش رو ترقی پسندوں سے اکتساب کیا ہے اور اپنی تخلیقات کے ذریعہ اردو کے سرمایہ میں گراں قدر اضافے کئے ہیں۔ ☐☐

ریحانہ بیگم : بیدر کی پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ

ڈاکٹر حشمت فاتحہ خوانی

صدر شعبہ اردو ،کرناٹک کالج ،بیدر وریسرچ گائیڈ ،شعبہ اردو وفارسی ،گلبرگہ یونیورسٹی ،گلبرگہ

آزادی کے بعد ضلع بیدر کے شعر وادب پر بغائر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ اردو ادب کے اُفق پر اُدبا و شعراء کی ایک لمبی قطار کہکشاں کی مانند چمکتی نظر آتی ہے۔ کچھ تو بجھتے چراغوں کی طرح ٹمٹاتے رہے اور کچھ تند و تیز ہواؤں میں بھی درخشاں ستاروں کی مانند جگ مگاتے رہے،تو کچھ نظم ونثر میں اپنے انمٹ نقوش چھوڑے ،بعضوں کا کلام زمانے کی حوادث کے سبب بہار آنے سے پہلے ہی خزاں کا شکار ہوا۔ ایسے صاحبِ طرز اُدباء و شعراء میں عطا کلیانوی اور دیپی بخاری کا شمار ہوتا ہے۔ اولذ کر کا تاریخ کے موضوع پر لکھا گیا غیر مطبوعہ نسخہ پولیس ایکشن کی نذر ہو گیا تو آخر الذکر کا مزاحیہ کلام عوام وخواص کے سینوں میں تو محفوظ رہا لیکن تا حال شائع نہ ہو سکا۔ شاعری میں عطا کلیانوی کی رباعیات کا مجموعہ'' وجود و شہود'' کلاسکی اور صوفیانہ روایات کا امین ہے تو دوسری جانب رشید احمد رشید بیدری اور سلیمان خطیب چٹگوپہ کا ضلع بیدر میں ان کا مقام کسی ملک الشعراء سے کم نہ تھا۔ اس پورے پس منظر اور پیش منظر میں ۱۹۴۷ء سے تا حال ریحانہ بیگم ہی کے تین غزلیہ مجموعہ ہائے کلام شائع ہوئے ہیں ۔اس اعتبار سے انہیں آزادی کے بعد ضلع بیدر کی پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔

ریحانہ بیگم ۱۲/ اگست کو گولہ خانہ بیدر کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ آپ کے والد کا نام نذیر احمد خان تھا۔ اور والدہ حمیدہ بیگم اپنے ماں باپ کی اکلوتی ،چہیتی ،اور پڑھی لکھی دین دار خاتون تھیں ۔ ریحانہ بیگم کے دادا اسماعیل خان صدر مدرس تھے۔ اور نانا غلام جیلانی میاں کا

تعلق خوشحال زمیندار گھرانے سے تھا۔ آپ کی ابتدائی تعلیم موضع مکندہ تعلقہ ضلع بیدر میں ننھیال اور پھوپھی صاحبہ کی زیر نگرانی انجام پائی۔ بعد ازاں گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول بیدر میں داخلہ لیا اور ۱۹۷۷ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ٹی سی ایچ کی تکمیل کے بعد الامین ہائیر پرائمری اسکول مناکھیلی ضلع بیدر میں آپ بحیثیت اسسٹنٹ ٹیچر جون ۱۹۸۱ء سے اپنی خدمات انجام دے رہی ہیں۔ ۲۹/ مئی ۱۹۸۰ء کو آپ شادی کے بندھن میں بندھ گئیں آپ کے شریکِ حیات ظہور احمد خان منکسر المزاج باکردار اور خوش طبع انسان ہیں جن کے سبب ریحانہ بیگم کے شعری ذوق کو جلا ملی۔ آپ کی تین اولادیں ہیں ایک لڑکا فاروق احمد خان ہے اور دو لڑکیاں فرحانہ بیگم اور الماس فاطمہ ہیں۔ آپ کو ابتداء ہی سے شعر و ادب سے دلچسپی تھی۔ پہلی غزل مقامی روز نامہ ''ادبی عکاس'' کے ادبی ایڈیشن میں شائع ہوئی۔ بعد ازاں یہی غزل نومبر ۱۹۹۸ء میں ماہنامہ ''خوشبو کا سفر'' حیدرآباد میں چھپی۔ آپ اُردو کے نامور ادیب، شاعر و صحافی صلاح الدین نیر سے اپنے کلام پر اصلاح لیتی رہتی ہیں۔ آپ کے والدِ مرحوم اور پھوپھی صاحبہ کو بھی شعر و سخن سے گہری دلچسپی تھی اسی لئے وقتاً فوقتاً ان سے بھی مشورۂ سخن کیا کرتی تھیں۔ ریحانہ بیگم کا کلام مقامی اخبارات اور آکاش وانی گلبرگہ سے شائع ہوتا رہا ہے۔ علاوہ ازیں خوشبو کا سفر حیدرآباد، پیامِ اُردو، اسباق پونہ جیسے موقر جریدوں میں چھپ چکا ہے۔ آپ کا پہلا افسانہ ''درد کا رشتہ'' خوشبو کا سفر ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا۔ دیگر افسانوں میں قاتل مسیحا، پیکرِ وفا اور وہ شخص کون ہے، قابلِ ذکر ہیں۔ اصناف شاعری میں غزل کے علاوہ نظمیں اور قطعات بھی قلم بند کرتی رہی ہیں۔ آپ کے تین شعری مجموعے 'پہلی کرن، آنگن آنگن پھول، اور دامن دامن خوشبو، شائع ہوکر داد حاصل کر چکے ہیں۔ دوسرے مجموعۂ کلام پر کرناٹک اُردو اکاڈمی نے انہیں ایوارڈ سے نوازا ہے۔ آپ کو تا حال حکومتی سطح پر دو مرتبہ ۱۹۹۵ء اور ۱۹۹۷ء میں بیسٹ ٹیچر ایوارڈ مل چکے ہیں۔ تیسرا بیسٹ ٹیچر ایوارڈ اسکول مینجمنٹ کی طرف سے عطا کیا گیا ہے۔ حج بیت اللہ کے موضوع پر منظوم سفر نامہ زیر طبع ہے۔

پہلی کرن، ریحانہ بیگم کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو ۱۰/ جنوری ۲۰۰۱ء کو صلاح لدین نیّر کی

زیرِ نگرانی صبیحہ سلطانہ، ثنا ارم، کی ترتیب وتزئین کیساتھ شائع ہوا۔ متذکرہ مجموعہ میں تریاسی (۸۳) غزلیں شامل ہیں۔ حمد سے ابتداء کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں دو نعتیں اور متفرق اشعار بھی شامل ہیں۔ '' پہلی کرن'' میری نظر میں، کے عنوان سے ڈاکٹر علی احمد جلیلی نے نئے دور کی غزل اور روایتی غزل تناظر میں پہلی کرن پر جامع انداز میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ ریحانہ کا تعلق اسی دوسرے گروہ سے ہے جو روایتی غزل کے پیچ وخم سلجھا رہا ہے۔ زیرِ نظر شعری مجموعہ پہلی کرن، کا مطالعہ یہ تاثر دیتا ہے کہ شاعر نے جمالیاتی اقدار کی پاسداری کی ہے۔ اور اسی کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ غزل کی روایت سے واقفیت اور فطری صلاحیت جو انہیں ودیعت ہوئی ہے اس کو بروے کار لانے کی پر خلوص کوشش نمایاں ہے۔ صلاح الدین نیر مدیر خوشبو کا سفر نے '' ریحانہ بیگم سرزمینِ علم و عرفان کی باصلاحیت شاعرہ'' کے عنوان سے مضمون قلمبند کیا ہے۔ جس سے شاعرہ کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اور زبان و بیان موضوع ومواد کے حوالے سے '' پہلی کرن'' کی غزلیات میں پائے جانے والے شعری محاسن پر تفصیل سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ میرا شعری وادبی سفر کے زیرِ عنوان ریحانہ بیگم نے اپنے مجموعہ کلام کے متعلق ایک مضمون قارئین کی نذر کی ہیں۔ جس میں انہوں نے اپنی شخصیت، شاعری، شعر گوئی، معاصرین، اساتذہ، شعری صلاحیتیں، گھر کا ماحول، درس وتدریس کے پیشہ سے وابستگی وغیرہ پر دوٹوک انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔ گویا حال وقال کو بیانیہ انداز میں پیش کیا ہے۔

کم وبیش اٹھارہ ماہ بعد یعنی ۱۵/ اگست ۲۰۰۲ء کو ریحانہ بیگم کا دوسرا شعری مجموعہ '' آنگن آنگن پھول'' شائع ہوا۔ جس کی ترتیب وتزئین صلاح الدین نیر نے انجام دی ہے۔ ۱۲۰ صفحات پر مشتمل اس مجموعہ میں دو حمد ایک نعت چند متفرق اشعار کے علاوہ ۳۶ غزلیں اور دو نظمیں بھی شامل ہیں۔ '' آنگن آنگن پھول'' کے عنوان سے ڈاکٹر علی احمد جلیلی نے ریحانہ بیگم کی شاعری کو اسلوب کی صفائی، سادگی، شگفتگی اور نرمی سے تعبیر کیا ہے۔ اور مجموعہ کے حوالے سے قاری اور شاعری کے درمیان ترسیل وابلاغ کے مسئلہ کو بھی اجاگر کیا ہے۔ صلاح الدین نیر نے نور ونغمات

کی شاعرہ کے عنوان سے دو صفحات قلمبند کئے ہیں ۔جن میں ان کے کلام کے حوالے سے فطری شائستگی ،تہذیبی روایات، اشعار میں گہرائی و گیرائی مسرت و انبساط کی کیفیات اور فکر و خیال کی بالیدگی کو شاعری کی نمایاں خصوصیات گردانا ہے ۔ریحانہ بیگم روشن مستقبل رکھنے والی باشعور شاعرہ کے تحت رئیس اختر نے پر اثر لب ولہجہ ،شعری پیکر تراشی اور شگفتگی کو اُن کی شاعری کی پہچان بتایا ہے ۔صبیحہ سلطانہ نے ''ریحانہ بیگم تہذیبِ نظر کی شاعرہ'' کے عنوان سے دو صفحات قلمبند کئے ہیں ۔جن میں اُن کی شخصیت اور شاعری کے انوکھے پہلوؤں کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے ۔ثناء ارم نے ''دیارِ شعروادب' بیدر کی نامور شاعرہ'' کے عنوان سے شاعری افسانہ نگاری اور شخصیت پر اپنے تاثرات پیش کی ہیں ۔مریم صدیقہ نے بھی '' ریحانہ بیگم کی شاعری کی ایک مداح'' کے عنوان سے مجموعہ کلام کی اشاعت پر مستقبل کیلئے خوشی و مسرت اور نیک تمناؤں کا اظہار کیا ہے ۔اور دو صفحات پر مشتمل ''پہلی کرن'' کی رسم اجراء تقریب کی رپورٹ بھی شامل کی گئی ہے ۔جس میں اہلِ قلم خواتین وحضرات کی جانب سے پذیرائی کی گئی ہے ۔اپنی بات کے تحت فن کارہ نے اپنی زندگی اور شاعری سے متعلق روایتی انداز میں اظہارِ خیال کیا ہے ۔

ریحانہ بیگم کا تیسرا مجموعۂ کلام ''دامن دامن میری خوشبو'' ۱۰ مئی / ۲۰۰۵ء کو شائع ہوا۔ صفحات ۱۳۶ ہیں ۔محمد علی اثر پیش لفظ میں لکھتے ہیں :

> ''ریحانہ بیگم کی غزلیں صرف حسن و عشق کے موضوعات تک محدود نہیں بلکہ مختلف النوع مشاہدات ،محسوسات اور تجرباتِ زندگی کی عکاسی و ترجمانی کرتی ہیں ۔ان کی تشبیہوں ،استعاروں اور لفظیات میں روایتی غزل کی بازگشت ضرور سنائی دیتی ہے ۔لیکن ان میں اندازِ بیاں کی ندرت ،تازگی اور اظہار کے نقوش بھی نظر آتے ہیں''۔

پہلے اور دوسرے مجموعہ کی طرح اس مجموعہ میں بھی صلاح الدین نیّر نے پورے اخلاص کے ساتھ شعری محاسن کی طرف قاری کی توجہ مبذول کروائی ہے ۔حسبِ روایت صبیحہ بیگم ،ثناء ارم اور ریحانہ

بیگم نے بھی اپنے اپنے تاثرات پیش کئے ہیں۔

ریحانہ بیگم نے تشبیہ استعارہ اور تراکیب کی مدد سے اپنی شاعری میں نئی جان ڈالی ہے۔ روایتی شاعری کے شعری محاسن کو مقتضائے حال کے توسط سے پیش کیا ہے۔ روانی کے سبب ان کے اشعار قاری کے ذہن پر دیر پا اثر چھوڑتے ہیں۔ انہوں نے انسانی زندگی کی شکست و ریخت کو اپنے تجربات و مشاہدات کی مدد سے اشعار کو خوبصورت پیکروں میں ڈھالا ہے۔ ان کی شاعری میں طنز کی کاٹ ہے جھنجلاہٹ نہیں۔ شمعوں کی دھیمی روشنی ہے، چراغوں سے اُٹھنے والا دھواں نہیں، آزمائش تو ہے نجات نہیں، روشنی ہے بجھتے چراغ نہیں، ڈر تو ہے خوف نہیں، بے باکی ہے دوٹوک نہیں، ضبطِ غم ہے اشکِ غم نہیں، بہاروں سے شکوہ ہے موسمِ خزاں نہیں، اقرار ہے زباں نہیں، غم پوشیدہ ہے جگ ہنسائی نہیں، درگذر ہے انتقام نہیں، صبر ہے تلقین نہیں، مصلحت ہے گفتار نہیں، اعتبار ہے عارضی نہیں، مجرم ہے سزا نہیں، تصور ہے دیدار کی حوس نہیں، اقرار ہے لب کشائی نہیں، مغموم ہے چشم پرنم نہیں، حساب ہے عذاب نہیں، رنجشیں ہیں نفرتیں نہیں، گویا ان کا کلام غمِ دوراں اور غمِ جاناں کا بہترین امتزاج ہے۔ نمونۂ کلام :

خدا جانے یہ کیسی کاری گری ہے
وہ پتھر بھی گوہر سا لگنے لگا ہے

فضاؤں میں برسوں سے جو اُڑ رہا تھا
پرندہ وہ بے بال و پر لگ رہا تھا

جو رسوا تھا کل تک نگاہوں میں سب کی
وہی شخص اب معتبر لگ رہا ہے

گھر کا موسم کبھی نہیں بدلے گا
جب تلک سائباں باقی ہے

دیکھتے رہتے ہیں چہرے کو ترے
خاموشی بھی تو زبان ہوتی ہے

خاموش دعاؤں میں اتنا تو اثر ہوگا
پتھر مری راہوں کا اک دن تو گہر ہوگا

دوستی کا چلن کیا بڑھا
دشمنی کی ادا بڑھ گئی

تجھ کو گلشن یہ سونپ کر اپنا
مجھ کو صحرا سے دل لگانا تھا

□□

علاقہ حیدرآباد کرناٹک میں اردو زبان اور تعلیم

ڈاکٹرخلیل مجاہد

صدر شعبۂ اردو، ڈاکٹر باباصاحب امبیڈکر، ڈگری کالج، ہلی کھیڑ، وریسرچ گائیڈ، شعبۂ اردو و فارسی،
گلبرگہ یونیورسٹی، گلبرگہ

تاریخی پس منظر:

علاقہ حیدرآباد کرناٹک کی موجودہ تعلیمی اور لسانی صورت حال کا جائزہ لینے سے پہلے ہم اس کے تاریخی عوامل واثرات کا جائزہ لینا ضروری سمجھتے ہیں کیونکہ تاریخی اعتبار سے ان علاقوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس کے بھلے اور برے اثرات یہاں کے سماج، زبان، مذہب اور تعلیم پر ہمیں جو آج نظر آتے ہیں ان کا ماضی سے تسلسل ہے اگر ہم صرف آزادی کے بعد یا پھر 1956ء میں ریاست کرناٹک تشکیل پانے کے بعد کی صورت حال کا جائزہ لیں تو یہ بڑی ناانصافی ہوگی۔ حال کو سمجھنے کے لئے ماضی کی تاریخی روایتوں اور حقائق کا جائزہ لینا ضروری ہوجاتا ہے لسانی اعتبار سے خاص کر اردو زبان کی صورت گری، ترویج اور علمی وادبی اعتبار سے ان علاقوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ہر چند ادبی ولسانی مورخین اس کو اتنی اہمیت نہیں دیتے کیونکہ یہ مورخین شمالی ہند کے ہیں اور دکن کے مورخین لسانیات وادب خود ہماری اپنی تاریخ سے بے اعتنائی برتتے آئے ہیں یہ شمال سے تیار مواد سے استفادہ کرکے اپنی شعروادب کی دوکانیں سجاتے رہے ہیں۔ آج بھی شمس الرحمٰن فاروقی جیسے شمالی ہند کے ناقد کو اپنا رہنما بنا بیٹھے ہیں۔ وہ خود اپنے تئیں شمال کے بالمقابل تحقیق وتنقید کے فرائض انجام دینا نہیں چاہتے۔ یہ حقیقت ہے کہ شمالی ہند کے محقق وناقدین کی نگاہ علم وادب کے تئیں گہری ہے وہ محنت اور سعی کرنے کا فریضہ بھی انجام دیتے ہیں لیکن تمام

برصغیر کا جائزہ و علی گڑھ دہلی بھوپال یا الہ آباد میں بیٹھ کر لیتے ہیں ظاہر ہے اسطرح انصاف ممکن بھی نہیں ہے۔ اس لئے راقم الحروف نے ان علاقوں کی لسانی علمی و ادبی اعتبار سے جائزہ لینے کی سعی کی ہے تا کہ ہماری نئی نسل کو ایک تحریک مل سکے اور وہ ہمارے علمی ولسانی ورثہ کی تاریخی و تدریجی حقائق کا پتہ لگائیں۔ ہماری یہ سعی ان کے لئے روشنی کا کام کرسکتی ہے تا کہ دکن میں تحقیق وتنقید کا حق واقعی ادا ہو سکے۔ مانگے کے اجالے سے استفادہ سے گریز کرتے ہوئے اپنی محنت فکر تدبرو ادراک کے ذریعہ ہمارے علاقہ کی جہتوں کی بازیافت کر سکے۔

گلبرگہ، بیدر، اور رائچور کی اپنی ایک تاریخی اہمیت ہے۔ پہلے یہاں ہندو راجے، راجواڑے حکومت کیا کرتے تھے۔ پھر یہ علاقے شمالی ہند کے مسلم بادشاہوں کے باجگذار بن گئے جسکی نگرانی کے لئے تاریخ میں ہمیں ملک کافور کا نام ملتا ہے۔ پھر 1347ء میں حسن گنگو بہمنی نے گلبرگہ کو اپنا پایۂ تخت بنایا اسطرح ان علاقوں کی عظمت کو چار چاند لگ گئے تقریباً 80 برس بعد فیروز شاہ بہمنی نے احمد شاہ بہمنی کو حکومت حوالے کردی۔ احمد شاہ نے گلبرگہ کے بجائے بیدر کو پایۂ تخت منتقل کر دیا جب بہمنیوں پر زوال آیا تو برید شاہوں نے بیدر کو پایۂ تخت برقرار رکھا۔ کچھ عرصہ مغلوں کے زیرنگیں رہا پھر آصف جاہی حکومت کا پایۂ تخت حیدرآباد کے بعد یہ علاقے اس کے زیرنگیں آگئے۔ پولس ایکشن 17 ستمبر 1948ء کے بعد ریاست حیدرآباد کو انڈین یونین میں شامل کرلیا گیا۔ اور پھر 1956ء میں فضل علی کمیشن کے تحت لسانی بنیادوں پر صوبوں کی تشکیل دی گئی تو یہ علاقہ ریاست کرناٹک کا حصہ بن گئے۔ یہ علاقے ریاست کے شمال میں واقع ہیں۔

جنوبی ہند کی پانچ ریاستیں دراوڑی زبانیں بولنے والوں پر مشتمل ہیں۔ بہمنیوں، قطب شاہوں، برید شاہوں اور آصف جاہوں کے عہد میں زبان، تہذیب وتمدن تعلیم و معاشرت کے تعلق سے مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں فخر محسوس ہوتا ہے۔ گلبرگہ اور بیدر مذکورہ عوامل کے اولین مرکز رہے ہیں گولکنڈہ اور بیجاپور کو علمی، لسانی، سماجی وتہذیبی میراث ان ہی دو شہروں سے منتقل ہوئی جب آصف جاہوں نے حیدرآباد پر اپنی حکومت قائم کرلی تو یہی وراثت انہیں نعمت کے طور پر حاصل

ہوگئی ہر چند وہ شمال سے اپنے ساتھ تہذیب و زبان کا ورثہ لے آئے تھے لیکن یہاں کے علاقوں کا مزاج و مذاق بالکل جدا گانہ تھا۔ ان کی سرپرستی میں علم و زبان کو بے انتہا پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ جسکو آج حیدرآباد کی تہذیب سے یاد کرتے ہیں یہ ضرور ہے کہ حیدرآباد کی تہذیب و زبان اور علم کی جو عظیم الشان عمارت ہمیں نظر آتی ہے اسکے پایے گلبرگہ اور بیدر میں مضبوط اور مستحکم پیوست ہیں جسکا انکار کفرانِ نعمت ہوگا۔

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کے بعد تمام چھوٹی ریاستیں ان کی زیرِ نگیں آگیں ۔آصف جاہی حکومت نے انگریزوں کے ساتھ ملکر ریاست میسور کو جسکی کمان ٹیپو سلطان کے ہاتھ میں تھی) شکست دی اسطرح آصف جاہی حکومت نے اپنی زندگی کے دن ایک سو برس سے زیادہ لمبے کر لئے انگریزوں نے اپنی تہذیب و زبان کے فروغ کے لئے انگریزی کے چلن کو عام کرنا شروع کر دیا۔ جس سے ہمارے سوچ و فکر کے ڈھانچے منہدم ہونے لگے۔ نئی سوچ نئی فکر، نئی تہذیب ،نئی تعلیم، سائنس اور ٹیکنالوجی کے اثرات نے پورے ہندوستان کے ساتھ جنوبی ہند کے علاقوں میں پھیل گئے ۔ آصف جاہوں کی علمی و لسانی سرپرستی نے زبان اور ادب کے ساتھ فکر و خیال کے سانچوں میں تبدیلی پیدا کی جو زبان نظام الدین بیدری سے ملاوجہی ،نصرتی کی علمی و فکری ضیا پاشیوں سے منور ہو رہی تھی سراؔج اور وؔلی سے لیکر مخدوم تک ترقی کی بلندیوں پر پہنچ گئی۔ عبدالجبار خاں ملکاپوری ''محبوب التواریخ'' میں لکھتے ہیں۔

> ''اس عہد کا بڑا امتیاز یہ ہے کہ اس میں زبردست علمی سرگرمیاں ہوئیں فیروز شاہ کا دور تاریخ میں مثالی ہے۔ اس کے عہد میں زبردست علمی سرگرمیاں ہوئیں' قابل علما (گلبرگہ میں) جمع کئے علم کی اس قدر حوصلہ افزائی کی کہ اس وقت کا بڑا علمی مرکز بن گیا''

مورخین جن میں لین پول' ایڈورڈ تھامس ،علی طباطبا' عبدالمجید خاں ملکاپوری ، رفیع الدین شیرازی' جے این۔ ہولسٹر' نصیر الدین ہاشمی اور مرتضی حسین وغیرہ کی اہم تحریروں کے مطالعہ سے

معلوم ہوتا ہے کہ بہمنی دربار میں ادیب، شاعر، فلسفی ماہرین فلکیات، مورخ، صوفی اور ارباب کمال موجود رہتے تھے۔ اس عہد میں گلبرگہ اور بیدر، عالموں، فاضلوں، ادیبوں اور صوفیوں کا گہوارہ بن گئی تھی۔ محمد شاہ ثانی کو رعایا ارسطو کے نام سے پکارتی تھی۔ فیروز شاہ ایک غیر معمولی شخصیت کا حامل بادشاہ تھا اور فضل اللہ انجو جیسے عالم کا شاگرد بھی تھا۔ اسکو مشرقی زبانوں پر دسترس حاصل تھی۔ یوروپی زبانوں میں بھی گفتگو کرسکتا تھا۔ یہ شاعر بھی تھا۔ اس کے علاوہ علوم تفسیر، اصول حکمت، طبعی و نظری میں مہارت رکھتا تھا۔ ہفتہ میں تین دن پیر، چہارشنبہ اور ہفتہ کو مختلف مضامین کے درس مدارس میں دیتا۔ ہر چوتھے دن سرکاری فرائض کی ادائیگی سے قبل قرآن حکیم کے سولہ صفحات کی نقل کیا کرتا تھا۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ حضرت سید محمد گیسودراز کو گلبرگہ میں قیام پذیر ہونے کی دعوت دی جسکے سبب آج گلبرگہ برصغیر میں مرجع خلائق بنا ہوا ہے۔

احمد شاہ بہمنی جس نے بیدر کو اپنا پایہ تخت بنایا تھا۔ حضرت گیسودراز کا مرید تھا حضرت خواجہ کی بدولت وہ بہمنی حکومت کا بادشاہ بنا تھا۔ حصول حکومت کے بعد کئی مواضعات اور کثیر الارض گلبرگہ اور اسکے قرب و جوار میں مستقلاً عطا کر دیں اور ان کے لئے ایک بڑی درسگاہ اور ایک عظیم الشان رہائشی دیوڑھی تعمیر کرائی اور ان کی مزار پر اعلی گنبد بھی تعمیر کروایا۔ بہمنی دور کے آخر میں خواجہ محمود گاواں کا نام بڑی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ یہ نہ صرف علم دوست تھا بلکہ اس نے اپنے عہد کی ایک اقامتی یونیورسٹی قائم کی تھی جسکو مدرسہ محمود گاواں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

زبان:

انسان کے جذبات احساسات خیالات کا اظہار الفاظ کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ یہ الفاظ چاہے جس زبان کے ہوں لفظوں کے سہارے زندگی کے نشیب و فراز کی کہانی رقم کرتے ہیں۔ اس کے اپنے اثرات کبھی بھلے کبھی برے ہوتے ہیں۔ الفاظ ہی کے سہارے ہم مختلف کیفیتوں کو موثر انداز میں پیش کرتے ہیں بلکہ سیاسی، سماجی، ادبی، مذہبی، تمدنی اور عمرانی زندگی کو

لفظوں ہی کے وساطت سے ایک نسل سے دوسری تک منتقل کرنے کے لئے محفوظ بھی کرتے ہیں۔ یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ ہم نے اپنے ماضی کے ورثہ کو اس عقیدت اور حقیقت نگاہ سے نہیں دیکھا جسکی توقع نئی نسلوں سے کی جاتی ہے۔ لفظوں کے جھروکوں سے ماضی کی وسیع وعریض زندگی کی فضا کچھ غور کریں تو ہمیں یہ طمانیت ہوتی ہے کہ زبان، تخلیق، تحقیق، وتنقید کے ارتباط باہمی سے ہم ماضی کے پرنور ورثہ کا مطالعہ کرکے حال کی تعمیر اور مستقبل کی تابناک منزلیں تلاش کر سکتے ہیں۔ تحقیق دراصل حقائق کو ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچانے کا نام ہے۔ مذکورہ امور کی روشنی میں جب ہم ہمارے علاقے کی زبان اور تعلیم کا جائزہ لیتے ہیں تو حیرت انگیز حقیقتیں ہمارے روبرو جلوہ گر ہو جاتی ہیں۔ یہ علاقے گلبرگہ اور بیدر جو ماضی میں اپنے شاندار علمی، ادبی، لسانی، سیاسی، تمدنی و مذہبی سرگرمیوں کی وجہہ سے نہ صرف اہل دکن بلکہ برصغیر کو متاثر کئے بغیر نہیں رہے، یہاں تک کہ ایران وعرب میں ان علاقوں کا چرچہ ہوتا رہا ہے۔ ایک تاریخی حقیقت بھی ہے کہ ایران سے اپنے وقت کے عظیم شاعر حافظ شیرازی کو گلبرگہ آنے کی دعوت دی گئی تھی اور وہ بادشاہ وقت کی دعوت پر ایران سے نکل پڑے تھے لیکن سمندر کے راستے ہونے والی مشکلات میں گھر گئے۔ اسکو بدشگونی خیال کرتے ہوئے وہ پھر ایران واپس ہو گئے۔

جہاں تک مقامی زبان کا تعلق ہے اس علاقے کی زبان کنڑا ہے۔ البتہ عہد بہمنی اور آصف جاہی میں اس علاقے میں مرہٹی اور تلگو بولنے والے بھی کافی تعداد میں موجود تھے۔ کنڑا زبان کو آج سرکاری سرپرستی حاصل ہے۔ یہ حقیقت اہل علم سے پوشیدہ نہیں کہ کنڑی زبان پر اردو عربی اور فارسی کے اثرات بہت زیادہ ہیں اور اس کثرت سے گھل مل گئے ہیں کہ اہل کنڑا کو اس سے اجتناب بڑا مشکل مرحلہ ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ اس علاقہ پر تقریباً چھ سو 600 برس تک مسلمانوں نے حکومت کی جنکی سرکاری زبان پہلے فارسی اور بعد میں اردو رہی تھی اور دینی اعتبار سے عربی کو اہمیت حاصل تھی یہی وجہ ہے کہ عربی فارسی اور دکنی اردو کے اثرات مقامی زبان پر بہت زیادہ ہیں۔ روزمرہ اور اصطلاح کے الفاظ کنڑی زبان میں تھوڑی سی تبدیلی کے بعد ہمیں نظر آتے

ہیں۔ ایسے ہزاروں الفاظ کنڑ الغت دیکھنے سے دستیاب ہوتے ہیں اور اصطلاحی و دفتری الفاظ مثلاً تحصیلدار و وکیل کو وکیلر وغیرہ۔

موجودہ دور میں یہاں کی کنڑا انجمنیں اور درس گاہیں' کلیات اور جامعات وغیرہ اپنی زبان اور تہذیب کے فروغ کے لئے ایک منصوبے کے تحت کام میں لگے ہوئے ہیں۔ آزادی کے بعد مختصر عرصہ میں ان کی زبان وادب کا بین الاقوامی سمیلن بھی منعقد ہوا ہے۔

جہاں تک اردو زبان اپنے بولنے والوں کے ضمیر پر ہمہ وقت دستک دیتی ہے کہ میرے وجود میں ماضی کی شاندار لسانی، علمی اور تہذیبی روایتیں پنہاں ہیں کوئی آئے اور تحقیق کے ذریعہ الوالعزمی بہادری اور علوم کے جواہر کو حاصل کر لے اور اپنی زندگیوں کو روشن اور تابناک بنالے۔ مایوسی اور بے بسی کی زندگی سے نکل کر پر امید زندگی کی بہاروں کے حصول کے لئے گامزن ہو جائے۔ مگر افسوس۔۔۔۔؟ آج ہمارے علاقہ میں زبان کی فروغ کے لئے بہت سے مدارس کام کر رہے ہیں۔ جہاں لڑکے لڑکیاں زبان اور شعر و ادب سے واقفیت حاصل کر رہے ہیں' حکومت کرناٹک بھی ان مدارس کو رقمی امداد فراہم کر رہی ہے۔ ان مدارس کے علاوہ کلیاتی اور جامعاتی سطح پر اردو زبان کے فروغ کے لئے حکومت مالی امداد فراہم کر رہی ہے۔ اردو اساتذہ ابتدائی جماعتوں سے لیکر جامعہ تک طلبہ کو زبان اور ادب میں مقام و مرتبہ دلانے کے لئے کوشاں ہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حیدرآباد کرناٹک کا علاقہ نہ صرف زبان کے فروغ میں مصروف ہے بلکہ اسکے ذریعہ علمی روایتوں کو آگے بڑھانے اور ذہن سازی کے کام میں بھی مصروف ہے۔ یہاں کا شعر و ادب بھی نہ صرف اپنے علاقہ میں موثر اور کارکرد ہے بلکہ دکن کے علاوہ ہندوستان میں بھی اپنی شاندار روایتوں سے جلوہ گری بھی کر رہا ہے۔

جب ہم اس علاقے کی لسانی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ تاریخی حقیقت سامنے آتی ہے کہ شہر گلبرگہ اور بیدر دو اہم مقامات ہیں جن کا تذکرہ کئے بغیر کوئی بھی لسانی مورخ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ یہ علاقہ نہ صرف لسانی اعتبار سے اہم ہے بلکہ علمی وادبی لحاظ سے بھی اہمیت کا حامل ہے۔

تاریخ ادب اردو یا لسانی تاریخ کی ابتداء و ارتقاء کا تعلق ہے۔ اسکے مطالعہ سے ہمارے علاقہ کے حساس محققین اور ناقدین کو تکلیف دہ احساس سے گزرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ ادب اور لسانیات کی تاریخ مرتب کرنے والوں نے ان علاقوں کی لسانی خدمات کو یا تو یکسر فراموش کر دیا ہے یا پھر ضمناً تذکرہ کیا ہے۔ یا پھر مذہبی عقیدت مندی کے زیر اثر حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کے خوش عقیدگی کے طور پر معراج العاشقین اور ان کی دیگر کتابوں میں قدرے تفصیل سے دکنی زبان کے بننے اور پروان چڑھنے کا ذکر کیا ہے اور یہاں کی مذہبی روایتوں کو بھی قدرے تفصیل سے لکھا ہے۔ دکنی زبان کی لسانی اہمیت کے پیش نظر وہ لکھتے ہیں:

''اب یہ سوال کے شمال سے آنے والے جو زبان ساتھ لائے تھے اس کے کیا نمونے تھے اسکی ساخت اور کینڈا کیا تھا اس لئے دشوار ہے کہ اس زبان کے باقاعدہ نمونے نہیں ملتے''۔

(تاریخ ادب اردو ص 152-151)

مذکورہ اقتباس کی روشنی میں ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ شمال میں نہ تو اس کے کوئی تحریری نمونے تھے اور نہ اسکی واضح شکل وصورت جسکو جمیل جالبی کینڈا کہتے ہیں یا پھر انگریزی میں لیپی کہا جاتا ہے موجود تھی۔ لیکن تاریخی حقائق کے باوجود امیر خسرو اور فرید الدین گنج شکر کے ملفوظات میں کہیں کہیں کسی لفظ کی جھلک نظر آتی ہے تو اس زبان کے ابتدائی نمونے کے طور پر پیش کرنے میں عار محسوس نہیں کی جاتی لسانی تحقیقاتی کتابوں کے مطالعہ سے ہمیں علاقہ واری تعصبیت کی بو آتی ہے۔ کیونکہ بقول جمیل جالبی اس زبان کا کینڈا یہی علاقہ گلبرگہ اور پھر بیدر ہے جہاں اس زبان کے اولین تحریری نمونے دستیاب ہوتے ہیں۔ اگر عادل شاہیوں نے گلبرگہ کے قلعہ کو مسمار کر کے ان کتب خانوں کو تلف نہ کیا ہوتا تو آج تاریخ میں بہت سی حقیقتیں محفوظ ہوتیں۔

شمالی ہند کی اونچی درسگاہوں میں بیٹھے ہوئے محققین، وناقدین نے ہمارے علاقے کی علمی و لسانی خدمات پر طائرانہ نظر ڈالنے کا خوش گوار فریضہ انجام ضرور دیا ہے لیکن پھر بھی علمی و تحقیق

تشنگی کا احساس اہل دکن کو ہوتا ہے کہ اس اہم ترین علاقہ کی لسانی اہمیت خصوصیت اور فروغ کے تعلق سے جو کام ہوا ہے وہ نہیں کے برابر ہے۔ موجودہ عہد کے ماہرلسانیات مرزا خلیل احمد بیگ استاذی علی گڑھ یونیورسٹی نے اپنی کتاب میں اس علاقے کے لسانی محققین کی تمام آرا کو ایک قلم رد کر دیا ہے اور یہاں کے قاری کو یہ احساس دلایا ہے کہ دکن میں جو کچھ ہے وہ شمالی ہند کے مانگے کا اجالا ہے۔ اور اس بات کو ہماری جامعات کے اساتذہ نے بلا سوچے سمجھے بلا غور وفکر کے بلا تحقیق کے قبول کر لیا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے لسانی وادبی اساتذہ ذہنی طور پر کتنے دیوالیہ پن کا شکار ہیں۔ ہم اپنی شعری تخلیقات شمالی ہند کے رسالوں میں شائع کر کے مسرور ہو جاتے ہیں اور شمالی ہند کے ناقدین کی آرا کو اپنے لئے سرمایہ افتخار سمجھتے ہیں۔ خود سوچنا غور وفکر کر کے تاریخی حقائق تک پہنچنا ان کے لئے جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ بہرحال ہم جمیل جالبی کی ایک اور تالیف کدم راؤ پدم راؤ کا اقتباس (ص 36) پیش کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں:

'' کدم راؤ پدم راؤ'' میں فارسی اور عربی کے اثرات اور لہجے میں اسلوب میں ذخیرۂ الفاظ میں آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ اس مثنوی میں تقریباً 12000 بارہ ہزار الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور ان میں سے صرف 125 (ایک سو پچیس) الفاظ عربی وفارسی میں ہیں۔

مذکورہ اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اردو زبان کی ابتدائی شکل لسانی اعتبار سے دکن کے علاقے کو قرار دیا جا سکتا ہے لیکن محققین یہ مانتے ہیں کہ اس علاقہ میں اردو زبان کا مولد ومنشا ہو ہی نہیں سکتا مشکوک ہو جاتا ہے کیونکہ جن بارہ سو الفاظ کا ذکر جمیل جالبی نے کیا ہے وہ ان دراوڑی خاندان کے زیر اثر ہی استعمال ہونے والے الفاظ ہیں جو اس مثنوی میں در آئے ہیں۔ نصیرالدین ہاشمی نے دکن میں اردو ۲۴ میں لکھا ہے:

'' سلاطین بہمنیہ نے اس زبان دکن کی خاص طور پر سرپرستی فرمائی اور اس کو سلطنت کی سرکاری زبان کا درجہ دے دیا ہے''۔

تاریخ ادب اردو کے مولف رام بابو سکسینہ اپنی بات کتاب کے ص 63،64، میں لکھتے ہیں۔

''سلاطین بہمنیہ نے یہاں کے شاہی دفتر کو اردو میں منتقل کر دیا تھا''۔

مذکورہ ہر دو اقتباسات اس بات کا ثبوت ہیں کہ اردو دکنی کا مولد اور اسکا رسم الخط ان ہی دو شہروں گلبرگہ اور بیدر سے وابستہ ہے۔ کیونکہ بہمنی سلاطین کے پایۂ تخت گلبرگہ اور بیدر رہے ہیں۔ میں یہاں لسانیات کی توضیحی بحث میں جانا نہیں چاہتا صرف اس علاقے کے علمی و لسانی مطالعہ کرنے والوں کے لئے کچھ اہم نکات کی جانب ان کے ذہن کو مبذول کرنا چاہتا ہوں کیونکہ ہم نے شمالی ہند کے خیالات و نظریات کو قبول کرنے میں جو جلد بازی کا مظاہرہ کرتے ہیں ذرا احتیاط سے کام لیں۔

اب ہم یہاں لسانی تاریخی بحث کو روکنا ضروری سمجھتے ہیں کیونکہ یہ مقالہ اس بات کا متحمل نہیں ہے کہ لسانیات پر تفصیل سے بحث کر سکے اور ہمارا یہ موضوع بھی نہیں ہے یہاں ہمارے علاقے کی اردو لسانی اہمیت پر روشنی ڈالنا ضروری تھا تا کہ اہل اردو خاص طور پر تاریخ ادب اردو کے طالب علم کو جو اس علاقے کی کلیات اور جامعہ سے وابستہ ہیں حقیقت کی جانب انہیں مائل کر سکیں۔

موجودہ دور میں علاقہ حیدرآباد کرناٹک کے ادیب و شاعر اور صحافی کو احساس ہے اس لئے وہ اپنی زبان کے تحفظ کے لئے سرگرداں ہیں۔ اس زبان کے وسیلے سے اپنے قارئین کی ذہن سازی کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ یہ قابل غور بات ہے کہ ریاست اتر پردیش اور بہار میں اتنے روزنامے شائع نہیں ہوتے جتنے اس چھوٹے سے علاقہ میں شائع ہوتے ہیں اسکول سے یونیورسٹی تک اس زبان کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں۔ ہمارے یہاں بیشتر اردو انجمنیں ہیں جو نہ صرف زبان کا تحفظ کر رہے ہیں بلکہ طلبہ میں علمی بیداری کا کام بھی انجام دے رہے ہیں۔ جن میں انجمن ترقی اردو شاخ گلبرگہ کے علاوہ انجمن ارباب اردو، اردو اکاڈمی گلبرگہ انجمن اساتذہ جامعہ گلبرگہ کا ذکر اہم ہے ان انجمنوں نے طلبہ کے لئے تحریری تقریری مقابلے

بیت بازی کے مقابلے مباحثے کانفرنس منعقد کر کے طلبہ میں اسپرٹ پیدا کرتے رہے ہیں۔ مقامی اخباروں میں ''سلامتی''انقلاب دکن'' کے بی این ٹائمز''بہمنی نیوز''ایقان''امین جہاں'' کونسل ادارت''شعلہ نوا'غیرہ وغیرہ اردو صحافت کو زندہ رکھنے میں معاون بنے رہے۔

بہر حال اردو زبان کے تحفظ کے لئے نئی نسل بھی آگے آرہی ہے ان میں لکھنے پڑھنے کا احساس 1980ء کے دہے کے بعد کچھ کم ہوا ہے لیکن جو بھی ہے وہ جوش و جذبہ کے ساتھ آج بھی موجود ہے ہر نسل اپنی آنے والی نسلوں کے لئے زبان کے تحفظ کے احساس کو بطور رشتہ جوڑتی جارہی ہے۔

تعلیم:

اردو والوں کے لئے تعلیم کا موضوع دین سے جڑا ہوا ہے۔ یہ روایت رہی ہے کہ بچہ جب چار سال چار مہینہ چار دن کا ہو جاتا تو اسے بسم اللہ خوانی کروائی جاتی ہے بس وہی ''اقرا باسم ربک''یعنی پڑھ اللہ کے نام سے'' کا ورد کرایا جاتا ہے۔

تعلیم کا موضوع بہت وسیع معنی و مفاہیم اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ آج جس طرز کے تعلیمی مناظر ہمارے سامنے ہیں انسان کو چالاک اور ہوشیار تو بنادیتے ہیں لیکن صحیح انسان ہمدرد غمگسار انسان بننے میں معاون نہیں ہوتے اہل اردو کے نزدیک مغربی طرز تعلیم اور طرز نگارش کو بڑی اہمیت حاصل ہے لیکن ان کی پوشیدہ خرابیوں کا ادراک ہم نہیں کر پارہے ہیں ہم نے دنیاوی تعلیم کے ساتھ اخلاقی دینی تعلیم کا نظام بھی قائم کرلیا ہے مگر یہ ایسا ہی ہے جیسے بقول اکبرالہٰ آبادی

نئی تعلیم میں بھی مغربی تعلیم داخل ہے — مگر ایسا کہ جیسے آب زم زم مئے میں داخل ہے

بہر حال تعلیم صرف طالب علم تک محدود نہیں ہے بلکہ اسکا اصل تو استاد ہی ہے جو اپنے طالب علم کے اندر صفائی قلب و ذہن کو اولیت دیتا ہو یعنی تعلیم کی پہلی منزل تزکیہ نفس ہو۔ پھر دنیا کے ان تمام علوم کی تعلیم دی جائے جسکو خالق کائنات نے انسان کو درجہ کمال پر پہنچنے اور فرشتوں

سے افضل ہونے کے لئے ضروری قرار دیا ہے یہ دوسری منزل ہے تیسری تعلیمی منزل حکمت' حکمت جسکو آج کی زبان میں سائنس یا احساساتی تعلیم بھی کہتے جس سے انسان آسمانوں میں پرواز کرتا ہے یہ اسی وقت ممکن ہے جب اساتذہ تمام باتوں سے متصف رہیں اگر ایسا نہیں ہے تو پھر وہ حقیقی استاد کہلانے کے قابل نہیں ہے وہ سب کچھ ہوسکتا ہے لیکن ''استاد'' نہیں ہوسکتا ہے مرتبہ استاد تو ایک شرف ہے جو انبیا کے بعد سنت رسول ﷺ کی پیروی کرنے والوں کو ملتا ہے۔ تعلیم کے جن نکات کا ہم نے ذکر کیا ہے وہ ہماری سوچ کا نتیجہ نہیں بلکہ خالق کائنات نے قرآن مجید میں اپنے رسول کو (جو ساری کائنات کے لئے ہادی (استاد) بنا کر مبعوث کئے تھے) مذکورہ تین صفات سے متصف کر کے مبعوث کیا تھا چونکہ اب کوئی رسول نہیں آئیگا اس لئے اس سنت کو قیامت تک ''اچھا استاد'' اپنے طالب علم میں مذکورہ صفات کو پروان چڑھا کر انسان کو انسان بلکہ اچھا انسان بننے میں مددگار ہوگا' طالب علم کو چاہیے کہ وہ جس عمر کا ہو عورت ہو کہ مرد ہو پہلے قرآن کے بتلائے ہوئے نکات سے واقف ہو۔ تعلیم دینی و دنیاوی دونوں ضروری اور لازمی ہیں اور دونوں ایک سکہ کے دو رخ ہیں یعنی ''سلیم طبع'' اور ادراک کے ذریعہ حاصل کرتا ہے جسکو ہم فلسفہ عظیم کہتے یا فکر کی انتہا کہتے ہیں۔ سلیم الفطرت کا تعلق روحانیت سے ہے جس سے انسان کے اندر بقول اقبال ''عشق پیدا ہو جاتا ہے، علوم طبعی و علوم فطری کا آمیزہ انسان کو اشرف المخلوق کے درجہ پر فائز کرتا ہے

محبت ہی بنا دیتی ہے مشتِ خاک کو انساں　　　قوامِ آب و گل سے بھی کہیں انسان بنتے ہیں

لفظوں کے وسیلے سے جو چیز ہم تک پہنچتی ہے وہ تعلیم ہی ہے۔ چنانچہ مذکورہ نقاطِ نظر کی روشنی میں ہم ہمارے علاقے کی تعلیمی جدوجہد کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں موجودہ مروجہ نظام تعلیم کی طرح کے ادارے ہمیں نہیں ملتے بلکہ اس عہد میں طالب علم اپنے استاد کے نام سے پہنچانے جاتے تھے۔ جب ہم ہمارے علاقے گلبرگہ اور بیدر کی تعلیمی صورت حال کا جائزہ لیتے ہیں تو اساتذہ کے علاوہ ادب و شعر کا مقصد و مرکز دل بہلائی نہیں تھا، نہ ماضی رہا نا حال میں ہمیں نظر آتا ہے۔ زبان کو تعلیمی امور سے جوڑے رکھا گیا چاہے منصوبہ بند ہو یا نہ ہو۔ اسکا شعر و ادب لب و رخسار

گل و بلبل کی داستان نہیں سنا تا جیسا کہ شمال میں فارسی کے زیر اثر ادب وجود میں آیا تھا۔ اس میں شراب و شباب، خمریات، ہجر و وصال، غم فرقت کی داستانیں ادب کا مقصد تھیں جہاں تک ابتدائی شعری نقوش ہمیں دستیاب ہیں ان میں تعلیم کو اہم موضوع بنا کر پیش کیا گیا۔ دراصل ذمہ داری کا احساس انسان کو مصلح بنا تا ہے اس لئے ابتدائی شعر و ادب سے لیکر آج تک جو کاوشیں ہیں اسی ذمہ داری کی غمازی کرتی نظر آتی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ دینی اداروں کے اساتذہ بھی شعر کہا کرتے اور نثر میں حکمت و پند و نصائح کو اولیت کا درجہ دیتے نظر آتے ہیں۔ شعر و ادب کے ذریعہ اخلاق فلسفہ اور روحانیت کی تعلیم دی جاتی تھی۔ جسکو ہم اصطلاحاً صوفی شعر یا صوفی ادب کا لیبل لگا کر ادب کے کارواں سے ذرا الگ کرنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔

دکنی ادب کا بنیادی موضوع صفائی قلب رہا ہے پھر منکراتِ کے عواقب و نتائج بتا کر حقیقت تک پہنچنے کے لئے اوصاف حمیدہ کے ساتھ تہذیب و معاشرت میں اچھا انسان بننے ہمدردی، عفو و درگزر کرنے والا، غم گسار، بلند اخلاق کا حامل پاکیزہ انسان بنانے کے جتن کئے جاتے۔ موجودہ دور میں تعلیم نسواں پر بہت زور دیا جاتا ہے اور اردو والوں پر الزام ہے کہ وہ تعلیم نسواں کو زہر ہلاہل سے تعبیر کرتے ہیں جبکہ ہمارے ادب کی معلوم شعری تصنیف میں تعلیم نسواں پر ہی زور دیا گیا ہے یعنی ایک نیک اور پاکباز عورت، وفادار و فاشعار عورت کے پورے اوصاف بتلا ئے گئے ہیں ' نیک و بد کی تعلیم دی گئی چونکہ اس عہد میں سوچنے کے جو سانچے تھے تعلیم کے جتنے وسائل تھے اس سے کام لیکر بتلایا گیا کہ نیکی کی راہ میں تکالیف دکھ کے باوجود عورت کو پاکیزہ باکردار، عفت مآب پاکیزہ ہونا ایک صالح سماج کے لئے کتنا ضروری ہے۔ اس پہلی مثنوی سے ہم اکبر کی تعلیم نسواں سے متعلق عقب کا موازنہ کرتے ہیں تو تعلیم اچھی تعلیم اور مغربی تعلیم کا پورا ماحول اور سماج ہمارے سامنے دست بستہ اور گمراہ کن نظر آتا ہے۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ میں شاعر نظام الدین بیدری نے عورت کو یہ ذہن نشیں کر دیا ہے کہ اس دنیا کے بعد کہتے ہیں یہ کتنی عجیب بات ہے کہ پندرھویں صدی کے اس شعری تصور کے بعد ہمیں آکر انیسویں صدی میں وہی کہتے نظر آتے

ہیں جسکو نظام الدین بیدری نے کدم راؤ پدم راؤ میں کہا ہے یعنی اکبر کا شعر

دنیا اور قیامت میں الیکشن سمجھو ‏ ‏ ‏ ‏ اس کو کالج کا کانوکیشن سمجھو

کدم راؤ پدم راؤ کے اشعار بطور ثبوت پیش کرنا نہیں ہے بس دو ایک شعر اس ضمن میں حاضر ہیں۔

سبھی کھیل اس کے کرنہار و ہ ‏ ‏ ‏ ‏ کرنہار جوگی نہ کرتار وہ

بھلے کوں بھلائی کرے کچھ نہوے ‏ ‏ ‏ ‏ بُرے کوں بھلائی کرے ہوئے توے

جو کچ کال کرنا سو توں آج کر ‏ ‏ ‏ ‏ نہ گھال آج کا کام توں کال پر

جو نیت کرے کام جے کچھ کوئے ‏ ‏ ‏ ‏ اسی کا بھلا بھی اسی سات ہوئے

وہ استری وہ جو پر پر کھ تل ‏ ‏ ‏ ‏ کدل دیس کر ہوئے تس تل ادل

یہ اور اس قسم کے تعلیمی فکر پر مبنی بے شمار اشعار مثنوی کی زینت ہیں۔

آج بھی جب ہم ہمارے شعر و ادب کا جائزہ لیتے ہیں تو نظم و غزل کا کوئی نہ کوئی شعر تعلیم' اخلاق' احساس' جذبات و کردار کے موضوع سے خالی نہیں ہے اگر چہ تعلیمی امور کی حفاظت اور فروغ کے لئے آج جدید اسکول' کالج' اور یونیورسٹی قائم ہیں۔ حکومتیں تعلیم و ترقی کے لئے سرمایہ فراہم کرتی آئی ہیں۔ اس کے تحت ہر سال ہزاروں طلبہ علم حاصل کر کے روزگار سے جڑ گئے ہیں۔ زندگی کو بدحالی سے خوشحالی میں بدل چکے ہیں۔ لیکن بقول غلام السیدین (اصول تعلیم ص 43)

"تعلیم کوئی ایسا نظام نہیں جسکو بعض ضروریات سے مجبور ہو کر انسان نے قائم کرلیا ہے اور نہ وہ ایسا شغل ہے جس کو انسانی زندگی کے لئے محض زینت کا باعث سمجھا جائے۔ وہ تمدنی زندگی کے رگ و ریشے وسیلہ بن گئی ہے جس کے ذریعہ ہم ناواقف اور ناتجربہ کار انسان کو بہترین اخلاقی اور معاشرتی اقدار اور اصولوں سے روشناس کرتے ہیں اور تہذیب و تمدن کے ورثہ کے ان عناصر کو جو بہترین تعلیمی قدر رکھتے ہیں انسان کے سامنے اسطرح پیش کرتے ہیں کہ اس میں خود بہ خود معاشرہ کی بنیاد ڈالنے کی اہلیت پیدا ہوتی ہے۔

مذکورہ اقتباس پر غور کریں اور موجودہ تعلیمی ماحول اور مقاصد پر نظر ڈالیں تو ہمیں تعلیمی نظام اس کے برعکس نظر آئینگے۔ آج حال یہ ہے کہ بقول اکبر

کیا بتائیں احباب کیا کارنمایاں کر گئے
بی اے ہوئے پنشن ملی اور مر گئے

کچھ سوچ نہیں کچھ ہوش نہیں نفشوں کے سوا کچھ جوش نہیں
وہ لوٹ کے بھاگا جاتا ہے' یہ آگ لگائے جاتا ہے

ڈاکٹر سلامت اللہ اپنی کتاب ''تعلیم اور سماج'' ص 17 پر رقمطراز ہیں۔

''اگر تعلیم کا مقصد واضح نہ ہو تو تعلیم ایک رجعت پرست قوت بن سکتی ہے مثلاً ہمت جوانمردی وفاشعاری' مستقل مزاجی فرمانبرداری وغیرہ سب اپنی جگہ قابل تعریف محاسن ہیں مگر یہی خوبیاں مجرموں کے کسی گروہ میں پیدا کردی جائیں تو تمدنی سماج کے لئے عذاب بن جائیگی اس لئے تعلیم کی پیچیدگی کی وضاحت ضروری ہے کہ تعلیم کے ذریعہ کس قسم کے سماج کی تعمیر مقصود ہے''۔

یہاں پرائمری یا میٹرک کی سطح کی تعلیم پر نکتہ چینی کرنا مقصود نہیں ہے۔ ہر چند کہ یہی وہ ادارے ہیں جو طلبہ میں پختہ فکر و کردار اور اخلاق کی داغ بیل ڈالنے کا فریضہ انجام دیتے ہیں وہ چاہے چھوٹی اخلاقی نظموں کے ذریعہ ہو یا کسی اقوال زرین کے ذریعہ قصوں کے ذریعہ ہو یا کہانیوں کے ذریعہ بہر حال یہی وہ زرخیز ادارے ہیں جسکی سرزمین سے گل ولالہ سے عیاں ہو کر ہمارے انسانی معاشرہ کی فضا کو خوشگوار اور معطر بنا دیتے ہیں تاہم موجودہ عہد جو حال ہے اور اس سے جو نتائج برآمد ہو رہے ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں حالی کی مسدس کا مطالعہ اگرچیکہ ایک سو برس سے اوپر کی شعری کاوش ہے لیکن آج اس کے مطالعہ سے حال کی تمام صورتِ حال معلوم ہو سکتی ہے بلکہ ان کے عہد سے آج اور بھی حالات بد سے بدترین ہو گئے ہیں۔

اعلیٰ تعلیمی ادارے اور اس سے منسلک اساتذہ اور طلباء کا مثلث کوئی بڑا کارنامہ انجام

نہیں دے رہا ہے تعلیمی ادارے ایک ''مافیا'' گروہ کی طرح کام کرر ہے ہیں اساتذہ اپنی ذمہ دری سے زیادہ تنخواہ اور سماج میں جھوٹے وقار کو بڑھانے کی فکر میں مشغول ہیں، طلبہ کا مقصد تعلیم صرف حصول ملازمت ہے والدین کا مقصد، فراغت تعلیم کے بعد لڑکے سے ملازمت کروانا اور دولت حاصل کرنا ہے وہ ان اداروں کا زیادہ رخ کرر ہے ہیں جنکو ہم کمرشیل تعلیم کہتے ہیں ہم اس نسل سے کسی بڑے اخلاقی ذمہ داری کو نبھانے کی توقع کر ہی نہیں سکتے کیونکہ خود اساتذہ کا حال بقول اکبرالہٰ آبادی

کردیا کعبہ کو گم اور کلیسا نہ ملا　　　واہ کیا راہ دکھائی ہے ہمیں رشد نے

یعنی اساتذہ کی فکر ونظر میں استحکام نہیں ہے ان کے پاس کوئی ہدف نہیں کوئی تعلیمی منصوبہ نہیں ہے تو پھر طلبہ میں وہ تمام عناصر کس طرح پیدا ہونگے کہ جس سے بھلے سماج کی تعمیر ہو سکے۔ ہماری لڑکیوں میں بھی تعلیم حاصل کرنے کی لگن ہے وہ محنت کرر ہی ہیں پرائمری سے لیکر میٹرک اور کالج ویونیورسٹی تک تعلیم بھی حاصل کرر ہی ہیں اور اساتذہ کے فرائض بھی انجام دے رہی ہیں لیکن وہ لڑکیاں شادی کے بعد بقول اا کبر

یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی　　　ان سے بیوی نے فقط اسکول ہی کی بات کی

گلبرگہ، بیدر، رپچور بھی اپنے ماضی سے حاصل کی ہوئی روایات کو باقی رکھنے کے لئے ایک تعلیمی جال پھیلا دیا ہے۔ ریاست کی تشکیل نو کے بعد جتنے ادارے ان مقامات پر قائم ہوئے ہیں وہ ایک مثال ہے ان علاقوں میں نہ صرف مقامی طلبہ وطالبات علم سے استفادہ کرر ہے ہیں بلکہ پڑوسی ریاستوں کے علاوہ ملک کی دیگر ریاستوں کے طلبہ بھی یہاں کے علمی اداروں سے استفادہ کرر ہے ہیں۔ یہ علاقے علم کا ایک مرکز بن چکے ہیں ہمہ مقصدی ابتداء سے اعلیٰ تعلیم تک موجود ہے۔ خواجہ بندہ نواز ایجوکیشن سوسائٹی کے تحت خواجہ ہائی اسکول، بی بی رضا ہائی اسکول جونیر و ڈگری کالج انجنیرنگ، میڈیکل، نرسنگ کالج وغیرہ موجود ہیں نیشنل ایجوکیشن سوسائٹی کے تحت پرائمری سے ڈگری کالج تک انتظام ہے۔

اس طرح مختلف ناموں سے تعلیمی سوسائٹیاں وٹرسٹ قائم ہیں جنکی نگرانی میں بے شمار تعلیمی ادارے چل رہے ہیں۔ بیدر میں شاہین اسکول واقامتی جونیر کالج اپنے تعلیمی امور میں مصروف ہے رائچور میں بھی مختلف تعلیمی ادارے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں ساتھ ہی ساتھ سرکاری اسکول اور کالجس بھی مختلف شہروں اور تعلقوں میں قائم ہیں گلبرگہ میں انگلش میڈیم اسکولوں کا ایک جال بھی ہے اس علاقہ کے مختلف مقامات پر پالی ٹیکنیک اور انجینئرنگ کالجس میڈیکل اور ڈینٹل کالجس خانگی اور سرکاری سطح پر قائم ہیں دینی تعلیم کی ہمہ جہت ترقی اپنے ماضی سے رشتہ جوڑے ہوئے ہے۔ □□

حیدر آباد کرناٹک کے طنز و مزاح نگار

ڈاکٹر پیرزادہ فہیم الدین

صدر شعبہ اردو، وجیہ نگر ڈگری کالج، ہاسپیٹ وریسرچ گائیڈ، شعبہ اردو و فارسی، گلبرگہ یونیورسٹی، گلبرگہ

ریاست کرناٹک میں حیدر آباد کرناٹک کو ادبی دنیا میں ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ خصوصاً گلبرگہ کو ریاست بھر میں مرکزیت کا درجہ حاصل کرلیا ہے۔ اردو ادب کی تخلیقات کے ذریعہ حیدر آباد کرناٹک کے فنکاروں نے ساری دنیا میں اپنے وجود کا احساس دلایا ہے، جہاں اردو کے دیگر اصناف میں اپنی پہچان بنائی ہے وہاں طنز و مزاح کے میدان میں بھی اپنی شناخت بنائی ہے۔ عالمی شہرت یافتہ طنز و مزاح نگار مجتبیٰ حسین کا کہنا ہے کہ

> ''طنز و مزاح ایک مشکل فن ہے'' لیکن اس مشکل فن پر بھی قدرت حاصل کرنے والوں میں حیدر آباد کرناٹک کا علاقہ پیش پیش ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اردو طنز و مزاح سے تعلق رکھنے والی دو عظیم شخصیتیں ابراہیم جلیس اور فرحت اللہ بیگ کا تعلق گلبرگہ سے رہا ہے۔''

صف اول کے طنز و مزاح نگار مجتبیٰ حسین کی پیدائش ضلع گلبرگہ میں ہوئی۔ آپ کی گلبرگہ سے والہانہ وابستگی سے ہر کوئی واقف ہے۔ مجتبیٰ حسین نے نہ صرف ایک طویل عرصے سے طنز و مزاح نگاری کی آبیاری کی بلکہ اس فن کی جانب نئی نسل کو راغب بھی کیا ہے بے شمار انعامات و اکرامات سے نوازے گئے مجتبیٰ حسین اپنے آپ میں ایک انجمن ہیں بیس طنزیہ و مزاحیہ تصانیف کے خالق مجتبیٰ حسین کے مداح ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ سید امتیاز الدین صاحب کا کہنا ہے:

> ''مجتبیٰ حسین اردو کے مزاحیہ ادب میں اپنی بھرپور انفرادیت کے ساتھ زندہ رہیں گے۔''

گلبرگہ سے وابستہ حضرت سلیمان خطیب کا نام ہی ہونٹوں پر تبسم بکھیر دیتا ہے آپ نے اپنی دکنی شاعری کی وجہ سے ہر دل میں اپنے لئے جگہ بنائی ہے مشاعروں کے روح رواں حضرت سلیمان خطیبؔ جہاں جاتے ہیں وہاں ہر چھوٹے بڑے کو اپنے اشعار کے ذریعہ اپنا گرویدہ بنا لیتے۔طنزیہ ومزاحیہ شاعری کے ذریعہ سلیمان خطیب کے یہاں اس موضوع پر شعر کہنے میں بھی کوئی نہ کوئی سماجی کمزوری چھپی ہوئی تھی ۔سادگی اور پرکاری سے لبالب ان کے اشعار گھر گھر کی بات بن گئے ۔ عام آدمی کی بات عام فہم انداز میں کہنے کے گر نے انہیں شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ بقول عابد علی خان بانی روزنامہ سیاست:

''خطیبؔ صاحب کی مقبولیت کی بڑی اور بنیادی وجہ دکنی زبان کا استعمال اور عوامی مسائل کا اظہار ہے''۔

رائچور کے طنزیہ ومزاحیہ شاعر فیض الرحمٰن فیضؔ کی پہچان حیدرآباد کرناٹک اور ساری ریاست کرناٹک سے مقتدر ہے فیض الرحمٰن فیض طنزیہ ومزاحیہ شاعر ہیں' صحافت سے بھی وابستگی تھی ۔ ناقدانہ رنگ بھی تھا۔ مشاعروں میں اکثر ایک آدھ شعر ایسا پڑھ دیتے تھے جسے شرف قبولیت حاصل نہیں ہو پاتی تھی۔اسی لئے اچھی شاعری کے باوجود اکثر تنقید کا نشانہ بن جاتے تھے ۔

رائچور ہی کے وحید واجد بھی طنز ومزاح کی طرف راغب ہوئے سنجیدہ شاعری میں یہ اپنا ایک الگ مقام رکھتے ہیں۔ صحافت سے بھی آپ کا تعلق ہے۔ بنیادی طور پر سماج کی ناہمواریوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں روزمرہ کے مسائل کو خوبصورتی سے کہنے کا ڈھنگ ان کے پاس موجود ہے شعر پڑھنے پر آپ کو اندازہ ہوگا۔

بلدیہ نظر کرم جو کر گیا نل گیا کٹھ گیا پھر گھر گیا

سید ابراہیم ماموں شہر گلبرگہ کی ان چند ایک شخصیتوں میں سے ہیں جن کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ کیا بڑے کیا چھوٹے سب ان کے دوستوں میں شامل تھے اور سب ہی ان کے قدرداں بھی تھے۔ ہمہ جہت شخصیت کے مالک ابراہیم ماموں ہرفن مولا تھے ۔طنز ومزاح سے

بھی گہرا شغف تھا۔ شگفتہ بیان اور شگفتہ تحریروں کے مالک سید ابراہیم ماموں کے کئی مضامین میں نے آل انڈیا ریڈیو گلبرگہ سے نشر کئے ہیں۔ درویش صفت ماموں ادبی اور غیر ادبی حلقوں میں ہر دل عزیز تھے۔

سرور مرزائی اردو و فارسی شاعری کے ذریعہ شہرت حاصل کی اردو، مراٹھی اور فارسی پر قدرت رکھنے والے سرور کو طنز و مزاح سے بھی دلچسپی تھی۔ قبلہ اور کچھ قبلہ محترم تخلص مزاحیہ شعر کہنے کے لئے استعمال کرتے۔ آپ کی مزاحیہ شاعری کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر لئیق صلاح کہتی ہیں:

"سرور مرزائی نے جو بنیادی طور پر غ فانیات کے شاعر ہیں اس بوقلمونی تخلیق کے لئے ایک علیحدہ تخلص قلبہ محترم اختیار کیا"۔ (ھرنگ صفحہ ۱۰)

سرور صاحب کا مزاحیہ انداز دیکھیے:

جہاں تن ہے مرا واں فن نہیں ہے	جہاں فن آ گیا ہے وہاں دلھن نہیں ہے
ثمینہ اس لئے شوہر سے خوش ہے	کہ قانوناً کوئی سوکن نہیں ہے

گورنمنٹ کالج گلبرگہ کے شعبۂ اردو میں ڈاکٹر طیب انصاری اور ڈاکٹر جلیل تنویر کے ساتھ جناب رؤف خوشتر بھی تھے۔ رؤف خوشتر کو گلبرگہ کی ادبی فضا راس آئی۔ مزاج میں طنز و مزاح تھا سو لکھنے کی طرف رجوع ہوئے نتیجتاً تصنیف غبار حاضر منظر عام پر آئی۔ اس تصنیف کے ذریعہ رؤف خوشتر نے ثابت کیا کہ وہ ایک اچھے طنز و مزاح نگار ہیں۔ غبار حاضر کے بعد معلوم نہیں کیوں رؤف خوشتر کی کوئی اور تصنیف منظر عام پر نہیں آئی۔ مجھے امید تھی کہ ان کی تحریریں مسلسل آتی رہینگی پتہ نہیں کیوں ان دنوں وہ خاموش ہیں۔ ڈاکٹر لئیق خدیجہ اول بی بی رضا ڈگری کالج اور پھر گلبرگہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ رہیں۔ کرناٹک اردو اکیڈمی کی صدر نشین کے عہدے پر بھی فائز رہیں۔ مجھے ان کی شاگردی کا شرف حاصل ہے ڈاکٹر لئیق صلاح بنیادی طور پر ایک بے حد سنجیدہ محنتی خاتون ہیں ارسطو جاہ اور حضرت میر شمس الدین آپ کے دو تحقیقی مقالے ہیں۔ تحقیقی ذہن

رکھنے والی ڈاکٹر صاحبہ میں ایک اور خوبی یہ بھی موجود ہے کہ آپ ایک اچھی طنز و مزاح نگار ہیں۔ ''سنی سنائی'' آپ کی طنزیہ و مزاحیہ تصنیف ہے۔ اس تصنیف کے ذریعہ انہوں نے اپنی طبعیت میں موجود ظرافت کا اظہار کیا ہے۔

ڈاکٹر راہی قریشی کی شاعری' مزاح اور پھبتیوں سے کون واقف نہیں ہے۔ آپ کی اصل پہچان ایک مستند شاعر کی ہے۔ آپ کی شاعری حرف ملال کا آئینہ خانہ ہے یہ سب اپنی جگہ لیکن بہت کم لوگ واقف ہیں کہ آپ ایک مزاح نگار بھی ہیں۔ آپ کو یقین نہ آئے تو پھر ذرا آپ کا یہ نثری انداز دیکھئے۔

> ''ٹوپی اچھالی جا سکتی ہے لیکن وہ سر کی گلہ کسی اور جگہ زیب نہیں دیتی قمیص کسی بھی طرح پاجامے کا نعم البدل نہیں ہوسکتی۔ لونگی پتلون کی جگہ نہیں لے سکتی، لیکن جوتا اپنی کراہت کے باوجود ایک ایسی ایجاد ہے جو پاؤں کے علاوہ ہاتھ کی مدد سے بھی چلتا ہے۔ بلکہ ہاتھ میں آنے کی وجہ سے زیادہ مفید اور موثر نتائج کا مظہر ہوتا ہے''۔

ڈاکٹر شمیم ثریا اپنے والد محترم معروف دکنی شاعر حضرت سلیمان خطیب پر تحقیقی مقالہ شعبہ اردو گلبرگہ یونیورسٹی کے تحت تحریر فرما چکی ہیں طنز و مزاح اور دکنی زبان آپ کو وراثت میں ملی ہے۔ ابتدائی تعلیم گلبرگہ میں ہوئی اور پھر آپ نے حیدرآباد سے گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن، دھارواڑ یونیورسٹی سے بی ایڈ کیا ہے۔ آپ نو سال کی عمر سے مضامین لکھتی رہی ہیں۔ آپ کا پہلا مضمون 1966ء میں شائع ہوا۔ طویل عرصہ تک بی بی رضا ڈگری کالج برائے اناث سے پرنسپال کی حیثیت سے وابستہ رہیں۔ طبیعت میں سنجیدگی ہے طنز و مزاح کے میدان میں ان کی تحریروں سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ میں بے پناہ ظرافت بھی موجود ہے۔ لائف از گوڈ' باتیں علی گڑھ کی۔ یہ وہ عنوانات ہیں جس پر ڈاکٹر شمیم ثریا کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین شائع ہو چکے ہیں کوئی بھی مضمون پڑھ لیجئے آپ کو اندازہ ہو جائیگا کہ یہ ایک اچھی طنز و مزاح نگار ہیں۔

ڈاکٹر لئیق خدیجہ، سرور جمال' بانو سرتاج' شیفتہ فرحت' بھی نامور خاتون مزاح نگاروں کے بعد ڈاکٹر حلیمہ فردوس طنزیہ و مزاحیہ اردو ادب کے منظر پر اُبھر آئیں۔ آپ کی دو تصانیف ''ماشاءاللہ'' اور ''بہر کیف'' شائع ہو چکی ہیں ان دو تصانیف کی وجہ سے ڈاکٹر حلیمہ فردوس ایک جانی مانی طنز و مزاح نگار بن گئیں۔ میرے خیال میں طنز و مزاح نگار وہی بن سکتا ہے جو زندہ دل ہو۔ اپنے ایک مضمون میں لکھتی ہیں:

''ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ رنگین دنیا کے مزے رنگین مزاح ہی لے سکتا ہے یہ
مردہ دلوں کی بات نہیں''

ڈاکٹر حلیمہ فردوس کا اپنا ایک الگ مشاہدہ ہے سنجیدہ محفلوں کے ماحول میں اپنے مشاہدے کو غافل ہونے نہیں دیتیں تحریر فرماتی ہیں:

''جمایاں لینے کا کام زندگی کے دوسرے مواقعوں کی بہ نسبت امتحان ہال میں
بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا جا سکتا ہے''۔

فاروق نشتر آجکل میسور میں مقیم ہیں مگر ان کا تعلق گلبرگہ سے رہا ہے۔ آپ کی دو تصانیف شائع ہو چکی ہیں ''دراصل'' اور ''دم بخود''۔ شائع ہوئی ''دراصل'' کا انتساب بھی بڑا عمدہ ہے ''گلبرگہ کے سدا بہار پھولوں کے نام جو انسانی چہروں کو جھلسہ دینے والی دھوپ کی تمازت کے باوجود کھلے رہتے ہیں۔ ان پھولوں میں میرے والدین اور اساتذہ بھی شامل ہیں''۔ ڈاکٹر عبدالغفار شکیل کا کہنا ہے:

''فاروق نشتر صاحب کی خوبی یہ ہے کہ وہ ایک حساس شخصیت کے مالک ہیں
گرد و پیش کے سماجی' سیاسی' تہذیبی حالات و تغیرات کا گہرہ مشاہدہ کرتے ہیں''

فاروق نشتر نے اپنے آپ کو بھی طنز و مزاح کا نشانہ بنایا ہے ایک اچھے طنز و مزاح نگار میں اتنا دم خم تو ہونا ہی چاہیے، ان کا رنگِ مزاح ملاحظہ فرمائیں:

شریک حیات زرینہ بیگم کا اظہار تشکر اس لئے لازمی ہے کہ بقول ان ہی کے
ان کی سمجھ میں آنے والی کوئی چیز تو اس کتاب میں ہو لہٰذا صفحہ آخر کی تصویر ان ہی
کی ایما پر شائع کی گئی ہے۔ فاروق نشتر''

مختار احمد منو آجکل ای ٹی وی اردو سے وابستہ ہیں اور ان کا شمار گلبرگہ کے اہم طنز و مزاح
نگاروں میں ہوتا ہے اب تک ان کے تقریباً بیالیس طنزیہ مزاحیہ مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ کتے
سے انٹرویو' قصہ صدارت کا' وجہ بے وجہ وغیرہ جیسے مضامین نے انہیں مقبول بنا دیا۔ امید ہے کہ
بہت جلد ان کی تصنیف شائع ہوگی۔

گلبرگہ سے وابستہ ایک اور طنز و مزاح نگار منظور وقار بھی آجکل ضلع بیجا پور میں بہ سلسلہ
ملازمت مقیم ہیں۔ آپ کا قلم مسلسل رواں رہتا ہے۔ مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی کرتے ہیں
افسانہ منی افسانہ' انشائیہ اور طنز و مزاح آپ کے تخلیقی میدان ہیں۔ 1990ء میں آپ کی طنزیہ
و مزاحیہ تصنیف ''ہنسنا منع ہے'' شائع ہو چکی ہے۔ ملک کے مختلف رسائل و اخبارات میں آپ کی
تخلیقات مسلسل شائع ہوتی رہتی ہیں۔ عصری مسائل آپ کی تحریروں کا خاص موضوع رہا ہے۔

غافل قریشی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کا وہ نام ہے جیسے سنجیدہ شاعری کی دنیا خمار قریشی کے
نام سے جانتی ہے۔ خمار صاحب جہاں ایک بہترین سنجیدہ شاعر کی حیثیت سے اپنی شناخت بنا چکے
ہیں وہیں وہ طنز و مزاحیہ اشعار کی تخلیق سے بھی شغف رکھتے تھے۔ روزنامہ سلامتی اور شگوفہ حیدرآباد
سے آپ کا طنزیہ و مزاحیہ کلام شائع ہوتا رہا ہے۔

ڈاکٹر فوزیہ چودھری نئی نسل کی ان تخلیق کاروں میں سے ہیں جنھوں نے ادب کی تخلیق
میں اپنی ایک الگ پہچان بنائی ہے۔ بچوں کے اردو ادب پر آپ نے تحقیقی مقالہ لکھا ہے اور بچوں
ہی سے متعلق ایک رسالہ بنام ''غبارہ'' بھی نکال رہی ہیں ''مہربان کیسے کیسے'' آپ کے خاکوں کا
مجموعہ منظر عام پر آچکا ہے آپ کے لکھے گئے خاکے دلچسپ اور معلومات آفریں ہوتے ہیں۔ یہ
خاکے ان شعراء و ادباء پر لکھے گئے ہیں جن سے ان کی شناسائی رہی ہے۔ جناب وہاب عندلیب

نے ان خاکوں پر یوں اظہار خیال فرمایا ہے:

''بحیثیت مجموعی فوزیہ چودھری فنِ خاکہ نگاری سے طبعی مناسبت رکھتی ہیں۔
ڈاکٹر فوزیہ چودھری صاحبہ ان تیرہ خاکوں سے قاری کے دل میں جگہ بنائی ہے
امید ہے کہ کئی اور خاکے منظر عام پر آئینگے۔''

گاواں کے مدیر محسن کمال ایک کامیاب مدیر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں اور ایک شاعر اور ناقد کی حیثیت حاصل ہے۔ اس بات سے بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ آپ نے تر پٹ بیدری کے نام سے طنزیہ و مزاحیہ شاعری بھی کی ہے۔

جوان مرگ امجد علی فیض گلبرگہ کے ان طنز و مزاح نگاروں میں سے تھے جن سے اس میدان میں کئی امیدیں وابستہ تھیں۔ امجد علی فیض طنز و مزاح کی تخلیق کے فن سے اچھی طرح واقف تھے آپ کی تحریروں میں اول تا آخر دلچسپی قائم رہتی ہے۔ امجد دلچسپ عنوانات پر دلچسپ پیرائے میں اظہار خیال کرتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین صاحب کا کہنا ہے کہ امجد علی فیض کے مضامین میں نہایت دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔

عابد مرزا صاحب کی تصنیف ''ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو'' ابھی ابھی منظر عام پر آئی ہے انجمن ترقی اردو گلبرگہ میں رسم اجرا ہوئی' عابد مرزا صاحب ایک عرصہ تک محکمہ جنگلات سے وابستہ رہے۔ کمال یہ ہے کہ انہوں نے اس ویرانے میں بھی طنز و مزاح کو تر و تازہ رکھا آپ کی اس تصنیف پر دو معروف شخصیتوں مجتبیٰ حسین اور مضطر مجاز نے اظہار رائے فرمایا ہے۔ مجتبیٰ حسین، عابد مرزا کے بارے میں لکھتے ہیں:

''گلبرگہ کی سر زمین کو طنز و مزاح سے خاص رغبت ہے آگے لکھتے ہیں کہ
آپ (عابد مرزا صاحب) کی وابستگی اور مشاہدے کی تیزی آپ کے پختہ
شعور کی نشاندہی کرتی ہے۔

مضطر مجاز لکھتے ہیں: ''مرزا صاحب نے اپنے ساز کو غلط آہنگ ہونے نہیں دیا''۔

رائچور کے عبدالقیوم بگڑ رائچوری طنز و مزاح کی دنیا کا ایک جانا پہچانا نام ہے۔ تقریباً 1948ء سے شعر کہہ رہے ہیں یہ وہ زمانہ تھا جب سیاسی حالت میں کافی اتار چڑھاؤ تھا۔ اسی سیاسی ماحول کے اثر کو آپ کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری میں محسوس کیا جا سکتا ہے آپ کی ایک نظم کافی شہرت حاصل کر چکی ہے وہ ہے ''حیدر آبادی نگینہ اندر مٹی اوپر چونا'' آپ کو طنزیہ و مزاحیہ شاعری میں ایک مقام حاصل ہے۔

محمد قاسم القادری ڈھکن رائچوری کا طنزیہ و مزاحیہ کلام کا مجموعہ ''گلبر گے کے پھول'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے اپنے رکھ رکھاؤ اور انوکھے انداز کی وجہ سے ڈھکن رائچوری ہر دل عزیز ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو گلبرگہ سے آپ کا مزاحیہ کلام بار بار نشر ہوا ہے۔ ایک عرصہ تک طنز و مزاح سے وابستگی کے بعد آپ نے مزاحیہ شاعری سے دوری اختیار کر لی۔ آپ نعتیہ شعر بھی کہتے ہیں۔ ڈھکن رائچوری نے طنز و مزاح کی دنیا میں رائچور کا نام روشن کیا ہے۔ ع

آپ ڈھکن کو کیا سمجھتے ہیں لاج رکھتا ہے خالی ڈبے کی

طنز و مزاح کی دنیا کے ایک اور شاعر پرویز دھمڑی نے بھی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کے ذریعہ شاہ آباد کے نام کو روشن کیا آپ کو مشاعروں میں چاہت سے بلایا جاتا۔ پرویز دھمڑی کی شاعری کے عنوانات سیدھے سادے ہوتے ہیں اور اپنے اطراف ہونے والے واقعات کو بڑی خوبصورتی سے وہ اپنے طنز و مزاح کا نشانہ بناتے ہیں۔ نعت غزل نظم منقبت ضبط تحریر میں لا چکے ہیں ''دھمڑی کی دھوم'' کے نام سے آپ کے کلام کا مجموعہ 2003ء میں شائع ہو چکا ہے۔ پرویز تخلص ہوا کرتا تھا۔ شولاپور کے اقبال کلب کے ایک مشاعرے میں ''جوڑی جو دیکھو کیا دھوم کی دھمڑی ہے''، نظم لوگوں کو اتنی پسند آئی کہ وہاں کے لوگوں نے انہیں دھمڑی ہی کہنا شروع کیا سو آپ نے بھی تخلص دھمڑی اختیار کر لیا۔ محمد مستان پٹیل دھمڑی کرناٹک، آندھرا پردیش اور مہاراشٹرا میں ہر دل عزیز رہے ہیں نمونہ کلام ہے

اس کو دھمڑی نہیں تو کیا کہنا بستر اگھر کے بھار ہے سو ہے

سرزمین حیدرآباد کرناٹک اردو ادب کے تخلیق کاروں سے بھری پڑی ہے کچھ نے تاریخ میں اپنا نام بنایا کچھ اور کا تخلیقی سفر جاری ہے۔ کئی نئے لکھنے والوں کی تخلیقات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ آگے چل کر اپنے وجود کا احساس دلوائینگے۔ ◻◻

حیدر آباد کرناٹک کی خاکہ نگاری

ڈاکٹر فوزیہ چودھری

لیکچرار، شعبہ اردو ، مہارانی کالج، بنگلور

عہد قدیم سے ہی ضلع گلبرگہ دکنی تہذیب کا مرکز رہا ہے۔ یہاں کا ادبی ماحول بے نظیر ہے۔ جس کی جڑیں عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں سے لے کر فیروز شاہی سلطنتوں تک جا پہنچتی ہیں۔ آزادی سے پہلے ہو یا بعد یہاں پر اہل قلم و اہل علم حضرات کی کمی نہیں رہی، جنھوں نے مذہب وملت کے علاوہ زبان وادب کی بے دریغ خدمت کی ہے۔ شعر وادب کی متنوع اصناف کی آبیاری میں یہ علاقہ زمانہ قدیم سے ہی زرخیز رہا ہے۔ یہاں کے لوگ فعال اور مجتہدانہ فکر کے حامل ہیں۔

خاکہ کیا ہے؟ ''خاکہ نگاری'' اردو کی مقبول، جدید اور کم سن صنف نثر ہے۔ اس میں شخصیت کے درون و بیرون کا احاطہ کیا جاتا ہے۔ شخصیت کی چلتی پھرتی تصویریں پیش کی جاتی ہیں۔ منفی ومثبت صفات کے ذریعہ تصویر میں گویا جان ڈال دی جاتی ہے۔ یہ غزل کا آرٹ ہے۔ اختصار اس کی خصوصیت ہے۔ خاکے میں شخصیت کے سوانحی عناصر پائے جاتے ہیں، مگر یہ سوانح عمری نہیں ہوتا۔ افسانوی رنگ بھی اکثر خاکوں میں مل جاتا ہے، مگر خاکہ شخصیت کا افسانہ نہیں ہوتا۔ یہ شخصیت کا لفظی آئینہ ہوتا ہے۔ جس میں شخصیت کے ساتھ ساتھ اس کے ماحول، دوست واحباب اور تہذیب وتمدن کی جھلکیاں بخوبی دکھائی دیتی ہے۔ خاکہ دراصل شخصیت کا تعارف ہے۔ مختصر سوانح ہے۔ شخصیت کی نفسیاتی گتھیوں کی تشریح ہے۔ شخصیت کی پیکر تراشی ہے۔ چلتا پھرتا مرقع ہے۔ صورت اور سیرت نگاری کا فن ہے۔ حالات وواقعات کا خوبصورت مگر دلچسپ

لفظی البم ہوتا ہے۔اسی لئے کہتے ہیں ''خاکہ'' ایک شخص کا نہیں ایک دور کا مطالعہ ہوتا ہے۔

اردو میں خاکہ نگاری کی ابتدا فرحت اللہ بیگ کے لکھے خاکہ سے ہوتی ہے جو 'نظیر احمد' پر لکھا ہوا ہے۔ یوں تو اردو کے تذکروں میں شاعروں اور ادیبوں کی منہ بولتی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں، مگر یہ خاکہ نگاری کے عناصر ہیں جو تذکروں میں دستیاب ہوتے ہیں۔ یہ ارادی طور پر لکھے ہوئے خاکے نہیں ہیں۔ جہاں تک حیدرآباد کرناٹک کی خاکہ نگاری کی ابتدا کا تعلق ہے، اردو ادب کی معروف و مقتدر شخصیت کی خاکہ نگاری سے ہوتی ہے۔ جسے دنیا ''مجتبیٰ حسین'' کے نام سے جانتی ہے۔ جن کی خلاقانہ صلاحیتوں کا لوہا مانتی ہے۔ اور ان کے مزاحیہ خاکوں کی چٹ پٹی تحریروں سے محظوظ ہوتی آئی ہے۔ آج مجتبیٰ حسین کی شخصیت علاقائی سطح سے ابھر کر اردو کی عالمی ادبی شخصیت بن گئی ہے۔ ان پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ موضوع کے ساتھ، کم صفحات میں انصاف کرنے سے قاصر ہوں۔ اس لیے میں نے یہ فیصلہ لیا ہیکہ مجتبیٰ حسین کو چھوڑ کر حیدرآباد کرناٹک علاقہ کے مابا قی خاکہ نگاروں کے فن پر روشنی ڈالی جائے۔

مجتبیٰ حسین کے کم و بیش معاصر وہاب عندلیب، طیب انصاری، رزاق فاروقی، جلیل تنویر کی پہلی کھیپ کا میں نے اس مضمون میں ذکر کیا ہے۔ ان کے بعد آنے والے گروہ میں ڈاکٹر حلیمہ فردوس، منظور وقار، ڈاکٹر وحید انجم وغیرہ کو رکھا ہے۔ اس کے علاوہ امجد جاوید اور حامد اکمل کے چند مضامین میں خاکے کے عناصر نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ اس کے بعد، عہد جدید میں ڈاکٹر فوزیہ چودھری اور امجد علی فیض نے اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ اس کے علاوہ ہو سکتا ہے اور خاکہ نگاروں نے خاکے لکھیں ہوں، لیکن یہ میری دسترس سے باہر ہے۔ میں نے مندرجہ بالا اشخاص پر تقدیم و تاخیر کی درجہ بندی کے بغیر ہی روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

وہاب عندلیب:

وہاب عندلیب ایک فرشتہ صفت انسان ہیں۔ تقریباً پچاس سالوں سے ادب کی ہر نوع خدمت میں مصروف ہیں۔ کسی صلہ کی تمنا کے بغیر، مدت مدید تک اپنے آپ کو بے غرض و غایت

مصروف رکھنا، آج کے دور میں مشکل ہی نہیں ناممکن کام بھی ہے۔ایسے ناممکن کام کو بھی وہاب عندلیب نے ممکن کر دکھایا ہے۔آزادی کے بعد خاکہ نگاری پر حیدرآباد کرناٹک علاقے میں مجتبیٰ حسین کے بعد وہاب عندلیب نے زیادہ توجہ کی۔انھوں نے متعدد خاکے لکھے۔ان کا پہلا خاکوں کا مجموعہ ''قامت و قیمت' 1981ء میں پہلی بار زیور طبع سے آراستہ ہوا۔دوسری بار یہی کتاب 2004ء میں شائع کی گئی۔اس میں چودہ شخصیتوں کے خاکے ہیں۔یہ شخصیتیں گلبرگہ کی جانی پہچانی شخصیتیں ہیں۔ ان میں مجتبیٰ حسین، سلیمان خطیب، مبارزالدین رفعت، سید مجیب الرحمن، ڈاکٹر غیاث صدیقی، امیر احمد خسرو، وقار خلیل، ڈاکٹر راہی قریشی، ڈاکٹر طیب انصاری، خمار قریشی، حامد اکمل، شکیل مظہری اور شید اردمانی کے خاکے ہیں۔ان میں سے بعض احباب کی شہرت نے علاقائی سرحدوں کو توڑا ہے آج مجتبیٰ حسین اور سلیمان خطیب کو اردو کی نئی بستیوں والے بھی جانتے ہیں۔اس کتاب میں وہاب عندلیب پر مجتبیٰ حسین کا لکھا ہوا خاکہ بھی موجود ہے۔مجتبیٰ حسین پر مجھے یہاں کچھ کہنا نہیں ہے۔میرا موضوع فی الوقت وہاب عندلیب کی خاکہ نگاری ہے۔اس کتاب کے دیباچہ کا عنوان زیرلب ہے۔ہاں وہاب عندلیب کی ہر بات زیرلب ہوتی ہے۔ہر کام میں وہ پیش رفت کرتے ہیں۔یہی کام بعد کو پیش لفظ بن جاتے ہیں۔انھوں نے خود کو ملی کاموں میں الجھایا ہے۔تخلیقات کم ہی لکھیں۔جتنا لکھا ہے اس سے اور زیادہ کی توقع وہاب عندلیب سے کی جاسکتی ہے۔

مجموعی اعتبار سے یہ بات سولہ آنے صحیح ہے، مگر ان خاکوں میں متذکرہ بالا خصوصیات ملی جلی ہیں۔تعارف، سوانح، تاثر، کردار اور سراپا کو گوندکر یکجا کیا جائے تو وہاب عندلیب کا لکھا ہوا خاکہ تیار ہوجاتا ہے۔مختلف خاکے جو انہوں نے لکھے ہیں اسکی سرشت میں یہی خمیر پوشیدہ ہے۔غیاث صدیقی کی وضع دار جذباتیت، اور زود گوئی، امیر احمد خسروؔ کا صوفیانہ پن، بے حالی، بے خیالی اور کم گوئی، مجتبیٰ حسین کی خوش ذوقی اور زندہ دلی، وقار خلیل کی ہوا اور واہ واہ پر جینے والی، سمٹی سمٹائی منحنی شخصیت، راہی قریشی کی دھان پان والی، اور طیب انصاری کی لحیم شحیم، جاث،

خنجر بکف شخصیت، خمار کا بانکپن، آہ کیا اشخاص تھے۔ موت کے بے رحم ہاتھوں نے ان میں سے اکثر کو دبوچا ہے، جو باقی ہیں تیار بیٹھے ہیں۔ سچ یہی ہے کہ کون تیار نہیں ہے اس دنیا میں؟ دانا تو وہی ہوتا ہے جو ہر پل خود کو موت کا سامنا کرنے کے قابل رکھتا ہے۔ کل من علیه فان.

ان تمام خاکوں میں مجھے ذاتی طور پر طیب انصاری پر لکھا خاکہ دلچسپ لگا۔ یہ قبائح اور صنائع اوصاف کا سنگم ہے۔ اس لئے معروضیت سے دو قدم آگے بڑھ کر معقولیت کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہ وہاب صاحب کی فطرت کے متضاد خاکہ ہے۔ وہاب عندلیب کی فطرت میں منفی صفات کم ہیں۔ وہ مثبت اقدار کے حامل شخص ہیں۔ منفی موضوع کا بھی وہاب عندلیب بہت اچھا خاکہ لکھ سکتے ہیں۔ مگر انھوں نے اس خاکہ کو چھوڑ کر اس نوع کا دوسرا خاکہ لکھا نہیں ہے۔ اس خاکہ سے طیب انصاری کی فطرت جھلکتی نہیں ہے بلکہ طیب انصاری بہ نفس نفیس نظروں کے سامنے آجاتے ہیں۔ اس خاکہ کے بعد دوسرا کامیاب خاکہ مجھے سلیمان خطیب کا لگا۔ اس میں بھی راوی کی گردن پر دروغ رکھ کر خوب تیر چلائے گئے ہیں۔ اکثر وہاب صاحب کے تیر ممدوح کو زخمی نہیں کرتے، تیر چلانے کے بعد ممدوح زخمی ہو یا نہ ہو، وہاب عندلیب اپنی فطرت سے مجبور ہو کر، مرہم پٹی کرنے لگ جاتے ہیں۔ عفو و درگزر انکی فطرت میں اتنا کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ اخلاق ، اقدار، تہذیب، مذہب، ادب، میں جس طرح وہاب عندلیب کی شخصیت بندھی ہوئی ہے، انکے خاکے بھی زندگی کے ہلکے رنگوں سے مزین ہیں۔ ان میں مجھے گہرے رنگوں کی کمی نظر آئی۔ گہرے رنگ سے میری مراد منفی جذبات سے ہے۔

طیب انصاری:

ولا اکیڈمی کی جانب سے شائع شدہ ''میرا شہر میرے لوگ'' طیب انصاری کی واحد خاکوں کی کتاب ہے۔ جو 1974ء میں شائع ہوئی۔ اس میں 21 خاکے ہیں۔ ان خاکوں کے ذریعہ شہر حیدرآباد کی علمی، ادبی، اور سماجی زندگی کی ترجمانی کی گئی ہے۔ ساتھ ہی اُن شخصیتوں کے خدوخال نمایاں ہو جاتے ہیں۔

طیب انصاری کی تعلیم وتربیت حیدرآباد میں ہوئی۔اس شہر سے ان کا قلبی و ذہنی تعلق تھا۔ انہیں زمین کے عشق کے ساتھ ساتھ یہاں کے افراد سے بھی والہانہ محبت ہے،اس محبت نے انہیں مجبور کیا ہے کہ خاکے لکھیں ، اور انہوں نے حیدرآباد کے دانشوروں ، مفکروں ، ادیبوں ، شاعروں اور فنکاروں پر لکھا ہے۔ان کے لکھے میں جذباتیت ہے۔ جذباتیت کی وجہ سے روانی آئی ہے۔جذباتیت کے لئے بھی ایک خاص وجہ ہے۔طیب انصاری کو جن شخصیتوں نے متاثر کیا، مستفید کیا،جن کے وہ معترف تھے۔انہوں نے ایسی شخصیتوں کو خاکے کا موضوع بنایا ہے۔ان میں پہلا خاکہ کم گو شخصیت کے مالک ،شاعر ،صحافی، جناب محبوب حسین جگر حیدرآبادی کا ہے۔ کرشن چندر نے بھی ان کی شخصیت پر اپنے تاثرات کا اظہار'پودے' میں کیا ہے۔(ترقی پسند مصنفین کی کل ہند کانفرس جو حیدرآباد میں ہوئی تھی،اس کی رپورتاژ،جسکا پہلا اڈیشن ۱۹۴۷ء میں بعنوان پودے شائع ہوا)۔جگر کی بے نور آنکھیں، بے ڈول جسم، چپ چاپ بالکل مٹی کا مادھو انسان لیکن یہی مٹی کا مادھو حیدرآبادی نوجوان طبقہ کے لئے ایک تحریک ہے، جلسے، جلوس ،کانفرنس، مشاعرے، ہنگامے انہیں کے دم سے آباد ہیں۔اسی کے خون کی لالہ زاری سے محفلوں کی رونق قائم ہے۔انہیں تاثرات کے حوالے سے خاکہ کی ہئیت ہوئی ہے۔اس میں ڈرامائی اور افسانوی عناصر بھی ہیں۔محبوب حسین جگر کی شخصیت،ان سے جڑی جزئیات،ان کا سراپہ،بہرکیف محبوب حسین جگر کو حیدرآباد کی علمی ،ادبی اور ثقافتی زندگی کا محور دکھایا گیا ہے۔اس خاکے میں حیدرآبادی ماحول پورے کا پورا ہماری نظروں کے سامنے پھیل جاتا ہے۔ اور مناظر کی صورت اختیار کرتا چلا جاتا ہے۔محبوب حسین جگر نے 200 روپیہ اپنی اکلوتی بہن کے علاج کیلئے بڑی مشکل سے جمع کئے تھے۔علاج کے لئے رقم روانہ کئے جانے سے پہلے کسی ادبی پروگرام کے لئے انہوں نے خرچ کردی۔اور بہن کا علاج نہ ہوسکا وہ اس دنیا سے گزر گئی۔

ان قربانیوں کی اس سے بہتر مثال نہیں مل سکتی۔اس واقعہ سے جدید نسل کو کم از کم یہ پتہ تو چلے گا کہ ہمارے اسلاف نے کس ایثار سے کام لیا ہے۔زبان وادب کی کن نہج پر خدمت کی ہے

اور ہم آج اسی زبان وادب کے ساتھ کس قسم کی لاپروائی برت رہے ہیں۔ خاکہ نگاری کا مقصد بھی یہی ہے، کہ ہمارے تمدنی ورثہ کو آنے والی نسلوں تک پہنچایا جائے۔

ایم نرسنگ راؤ بحیثیت صحافی سے ترقی کرتے ہوئے منسٹر بن جاتے ہیں۔ان کا خاکہ گنگا جمنی تہذیب کے عناصر سے گوندھا ہوا ہے۔ ماہر اقبالیات اشفاق حسین کے خاکہ میں عثمانیہ تہذیب کا شیرازہ، شخصیت کے تال میل سے سنوارا ہے۔ مسعود حسین خاں، حسن الدین احمد، پروفیسر مبارزالدین رفعت، پروفیسر عاقل علی خاں، محمد شبلی یزدانی، احسن علی مرزا، عبدالقادر جیلانی، احمد مکی،، شیخ محمد، وقار خلیل، اعجاز قریشی، عابد انصاری، چاند انصاری اور محمود خاور وغیرہ کے خاکہ لکھ کر حیدر آبادی تہذیب کا اس دور کا آئینہ خانہ سجایا ہے۔ زینت ساجدہ، بانو طاہرہ سعید، آمنہ ابوالحسن، تین خواتین کے خاکے بھی اس میں شامل ہیں۔ان میں بعض خاکے سرسری ہیں۔ بعض تعارفی نوعیت کے ہیں، بعض مختصر ہیں۔ خواتین میں زینت ساجدہ کا خاکہ بہتر ہے۔ محمود خاور، چاند انصاری، حسن الدین کے خاکے جلد بازی میں لکھے ہوئے لگتے ہیں، استادوں کے خاکوں میں طیب انصاری ایک مرعوب شاگرد نظر آتے ہیں۔ اساتذہ کی تعریف کے پل باندھ دیتے ہیں۔ طیب انصاری کی خنجر بکف شخصیت کہیں گم ہو جاتی ہے۔ مجموعی طور پر وہاب عندلیب کے خاکوں اور طیب انصاری کے خاکوں میں وصفی بعد ہے۔ وہاب عندلیب کے یہاں ہوش ہے تو طیب انصاری کے یہاں جوش ہے۔وہاب عندلیب کے خاکوں میں ،اعتدال، اور دھیمہ پن ہے تو طیب کے یہاں صبا خرام اسلوب ہے۔ بے تکان بولنے کا رجحان ہے۔ان خاکوں کو پڑھتے ہوئے طیب انصاری سامعین سے بے خبر، آنکھوں کو بند کئے، محفلوں میں بے نیازی سے تقریر کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔اتنا ضرور ہے کی یہ خاکے نیک تمناؤں کے بطن سے جنمے خاکے ہیں۔ اور جذبات کی صباحت سے مملو بھی ہیں۔

عبدالرزاق فاروقی:

عبدالرزاق فاروقی کی کتاب ''یادوں کے جھروکے سے'' 2007ء میں شائع ہوئی۔

اس میں 18 خاکے اور ایک مضمون ''اردو اساتذہ کا ماحول اور مسائل'' بھی ہے۔ان خاکوں کو مصنف نے خاکے نہیں کہا ہے۔ بلکہ شخصیتوں کے نظارے کہا ہے۔۔گلبرگہ میں تقریباً 30 سال رہے۔مگر موصوف کو ہمیشہ گلبرگہ سے گلہ ہی رہا۔

عبدلرزاق فاروقی نے ایسی شخصیتوں کے خاکے لکھے ہیں، جن کے مطالعہ سے فکر ودانش میں اضافہ ہو،مگران خاکوں میں فن پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی ہے۔ بلکہ خلوص پر ان خاکوں کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ تاکہ منتخب روزگار، اور مثالی شخصیتوں کی زندگی کے واقعات بطور ورثہ محفوظ ہو جائیں۔اس کا انداز خطیبانہ ہے۔ بنیادی طور پر عبدالرزاق فاروقی ایک بہترین مقرر ہیں۔ان کی یہ فطرت ان کے خاکوں میں جا بجا عیاں نظر آتی ہے۔ کئی جگہ ان خاکوں کے تخلیقی مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں۔''کہ خاکوں سے زندگی کے مثبت عناصر کی تعمیر ہوتی ہے ۔اس لئے یہ خاکے لکھے گئے ہیں''۔ سید محی الدین قادری زورؔ، پروفیسر محمد عبدالقادر سروری، پروفیسر رفیعہ سلطانہ، مالک رام، قاضی عبدالودود، مولانا امتیاز علی خاں عرشی، مولانا عبدالماجد دریابادی اور پروفیسر بی شیخ علی جیسے جید اشخاص پر خاکے لکھے گئے ہیں۔ ان میں زیادہ تر حیدرآبادی شخصیتوں کی جھلکیاں ہیں یا اردو زبان وادب کی ممتاز شخصیتیں ہیں۔عبدالرزاق فاروقی کی دبنگ شخصیت اساتذہ کے ذکر کے دوران دب جاتی ہے۔ان خاکوں میں رزاق فاروقی قدموں تلے آنکھیں بچھاتے اور قدموں پر صدقے وارتے چلے جاتے ہیں۔مصنف نے کہیں بھی خاکہ نگاری کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔لیکن یہ مضامین حیدرآبادی تہذیب کی غمازی کرتے ہیں۔مجموعی طور پر سوانحی، تاثراتی اور خاکہ نگاری کے پہلوؤں کو لیے ہوئے شخصیتوں کی بے لاگ جھلکیاں ہیں۔ان شخصیتوں کے مطالعہ سے اس دور کے مطالعہ میں آسانی ہوتی ہے۔عبدالرزاق فاروقی کے نزدیک یہی ان مضامین کا بہترین وصف ہے۔

ڈاکٹر جلیل تنویر :

سرزمین گلبرگہ کی ایک معروف شخصیت کا نام ڈاکٹر جلیل تنویر ہے۔ جلیل تنویر ایک

خاص ''فکر ونظر'' کے مالک ہیں۔ بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں۔ افسانہ تخلیق کرنے کے اپنے ہی ''حصار'' کو توڑ کر انہوں نے کئی مضامین لکھے ہیں۔ فکر ونظر کے دیباچے میں وہاب عندلیب رقمطراز ہیں۔

> ''فکر ونظر کے مضامین کو نوعیت کے اعتبار سے تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔(۱) سوانحی خاکے (۲) ادبی مضامین (۳) تبصرے ۔۔۔ ۔۔رشید جاوید، عبدالرحیم آرزو اور شمیم ثریا پر لکھے گئے مضامین کا شمار سوانحی خاکوں میں ہوتا ہے۔ باقی جن ادیبوں اور شاعروں کے حالات تحریر کرتے ہوئے ان کے ادبی کارناموں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ان میں گلبرگہ سے تعلق رکھنے والی شخصیات ہیں''۔
>
> (مقدمہ فکر ونظر، مقدمہ نگار۔ وہاب عندلیب، منصف ڈاکٹر جلیل تنویر۔ گلبرگہ)

صلاح الدین نیر ڈاکٹر جلیل تنویر کے ماموں ہیں۔ رشید جاوید بھائی ہیں۔ علی الدین نوید خالہ زاد بھائی ہیں۔ وقار خلیل، طیب انصاری، ڈاکٹر راہی قریشی، محبّ کوثر، صغریٰ عالم وغیرہ سے قریبی تعلقات ہیں۔ جن پر اس کتاب میں مضامین ہیں۔ ڈاکٹر جلیل تنویر چاہتے تو یہاں کے حالات و واقعات سے اپنے مضامین کو سجاتے، جن سے بندہ نواز مٹی کی خوشبو آئے۔ مگر مجھے لگتا ہے کہ ''خاکہ نگاری'' ان کا مقصد نہیں تھا۔ سرسری تعارفی تبصرے لکھنا پیش نظر رہا ہوگا۔ اصلاً ان مضامین کو ''تذکرے'' کہا جاسکتا ہے۔ خاکے نہیں۔

ڈاکٹر حلیمہ فردوس:

ڈاکٹر حلیمہ فردوس اور خاکہ نگاری دو عجیب چیزیں ہیں۔ جو نعمتِ غیر مترقبہ لگتے ہیں۔ ڈاکٹر حلیمہ فردوس بحیثیت مزاح نگار اپنی پہچان 'ماشاء اللہ' بنا چکی ہیں۔ 'بچوں کی انوکھی دنیا' الفاظ کی دنیا' لسانی کھیل کی خالق ہیں۔ 'بہر کیف' ان کی خاکہ نگاری پر مجھے کہنا ہے۔ میرا کہا سننے سے پہلے یہ دیکھیں کہ حلیمہ فردوس خود اپنے خاکوں سے متعلق کیا کہتی ہیں۔

''خاکہ نگاری میری پہچان نہیں ہے۔ دراصل مزاح نگاری اور خاکہ نگاری میں ناخن و گوشت کا رشتہ ہے۔ شاید اسی وجہ سے مجھے بھی خاکے لکھنے کی تحریک ملی۔ میں نے دو چار خاکے لکھے ہیں جو روزنامہ 'سالار' اور ماہنامہ 'زرین شعاعیں' میں شائع ہوئے ہیں۔ قارئین نے انہیں سراہا بھی ہے۔ یہ خاکے نہ رسمی ہیں اور نہ ہی فرمائشی۔ مشفقوں کی جدائی کے غم اور عقیدت کے بطن سے جنمے ان خاکوں میں جذبات کی لے مرتعش نظر آتی ہے۔..................از: حلیمہ فردوس رائے برائے خود کی خاکہ نگاری۔''

تین خاکوں کی زیراکس کے ساتھ متذکرہ بالا رائے انہوں نے اپنے متعلق ارسال کی ہے۔ پہلا خاکہ 'ایک روشن دماغ تھا نہ رہا' محترم خالد عرفان مرحوم کا خاکہ ہے۔ یہ خاکہ مختصر ہے۔ مگر طویل جملوں کا دروبست اور پیریگراف کی کمی سے اسلوب سپاٹ لگتا ہے۔ اس میں خالد عرفان کی بذلہ سنجی ہے اور نہ محترمہ کی پروفیشنل بذلہ سنجی ہے۔ گراں الفاظ اور مرکب جملوں کا استعمال خوب کرتی ہیں۔ ایک ہی جملے میں کئی نت کے الفاظ شامل ہو جاتے ہیں۔ مجھے کئی جگہ ایسے بھی لگا کہ پھیکے رنگوں کا کوٹ سلوا کر خالد عرفان صاحب کو پہنایا گیا ہے۔ خالد عرفان اس کوٹ کی اوٹ میں چھپے نظر آتے ہیں۔

دوسرا خاکہ بشیرہ آپا کا ہے۔ جن کی ہم دونوں شاگرد ہیں۔ میری ذہنی تربیت میں بھی بشیرہ آپا کا ہاتھ رہا ہے۔ بشیرہ آپا کا شمار گلبرگہ کی صفحہ اول کی خاتون اساتذہ میں ہوتا ہے۔ ان پر لکھا ہوا خاکہ پڑھنے کے بعد مجھے آرٹ سے زیادہ کرافٹ کی کیفیت محسوس ہوئی۔

تیسرا خاکہ ان کے والد پر لکھا ہوا ہے۔ ہاں اس خاکے میں رشتہ کی خوشبو سمٹ آئی ہے۔ اس خاکے میں حلیمہ آپا کی غیر جذباتی فطرت کا کفر ٹوٹتا دکھائی دیتا ہے۔ اس خاکہ کا اسلوب پہلے دو خاکوں کی بہ نسبت کھلا ہوا ہے مگر واقعات کے اظہار میں یہاں بھی ایک نظم و ضبط دیکھنے کو ملے گا۔ یہی نظم، یہی ضبط اور کچھ ٹھہراؤ حلیمہ فردوس کی خاکہ نگاری کی فنی خصوصیت ہے۔ بہر کیف

ڈاکٹر حلیمہ فردوس اپنے منفرد اسلوب کے ساتھ خاکہ نگاری کی دنیا میں ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

منظور وقار:

ایک منظور نظر ادیب ہیں۔ جو پر وقار بھی ہیں۔ان کا نام ہے منظور وقار، منظور وقار نے کئی کہانیاں، افسانے، اور خاکے تحریر کئے ہیں۔منظور وقار کی شخصیت ایک خاموش، کم گو انسان کی لگتی ہے۔ پہلے وہ گلبرگہ کالج میں کلرک تھے۔اب ولیج اکاؤنٹنٹ ہیں۔صبح سے شام تک ولیج اکاؤنٹنٹ کے فرائض انجام دیتے ہیں۔گھر تھک ہار کر لوٹتے ہیں تو ایک وقفہ کے بعد ادبی کام شروع کرتے ہیں۔ برسوں سے مسلسل لکھ رہے ہیں۔بغیر کسی رکاوٹ کے مسلسل چھپ رہے ہیں۔کسی سے عدوگری نہیں۔ سب گاندھی گری ہے۔آفس کے کام کی رفتار بڑھی مگر ادبی مصروفیات میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ وہ بھی جاری یہ بھی جاری۔اب تک تقریباً بیس خاکے شائع ہو چکے ہیں۔دو خاکے طیب انصاری اور لئیق صلاح پر لکھے ہوئے رسالہ شگوفہ میں شائع ہوئے تھے۔ان میں کل ہند مشاعروں کی نظامت کے ماہر، اردو ادب انڈسٹری کی چلتی ہوئی غزلوں کا شاعر محبؔ کوثر کا خاکہ بھی ہے۔سمندر میں رہ کر پانی سے پھر بھی بچنے کی امید ہے لیکن گورمنٹ ڈگری کالج گلبرگہ کے ماحول میں رہ کر ادب سے دوری اختیار کرنا ناممکن تھا، ڈاکٹر طیب انصاری اور ڈاکٹر جلیل تنویر اس کے روح رواں تھے۔آئے دن کوئی نہ کوئی ادبی ہنگامہ ضرور ہوتا۔اسی کالج میں منظور وقار بحیثیت کلرک کام کرتے تھے۔ظاہر ہے خود کو ادبی آگ سے بچا نہیں پائے۔ادب کا بخار تیزی سے چڑھا۔ ویسے جراثیم ان میں پہلے سے موجود تھے،۔شائد یہیں پر، اسی دور میں انھوں نے، ڈاکٹر جلیل تنویر، ڈاکٹر طیب انصاری، احمد جلیس، صغریٰ عالم، خمار قریشی، صابر شاہ آبادی، سلیمان خمار اور وقار ریاض پر خاکے لکھے، جو اس ماحول کا حصہ تھے۔بحیثیت ادیب یا شاعر جن کا شعبہ کو آنا جانا تھا۔یہ خاکے زیادہ تر روزنامہ سالار، روزنامہ سیاست اور منصف کے ادبی صفحات کی زینت بنے۔

ضیا جعفر، سید امجد عمر برق حیدرآبادی، وقار ریاض، سلیمان خمار بیجاپور صابر شاہ آبادی،

خمار قریشی وغیرہ پر بہترین خاکے لکھے ہیں۔

ان کے خاکوں کو پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ نادر تشبیہات منظور وقار کو نامنظور ہیں۔ سادگی انہیں پروقار نظر آتی ہے۔ زبان سادہ وسلیس استعمال کرتے ہیں۔ پیچیدگیوں سے احتراز لازمی ہے۔ عام فہم خیالات کو کبھی اقوال زرین سے سجا کر، کبھی مزاح کی خاطر توڑ مروڑ کر، کبھی کسی چھوٹے واقعہ کے بیان سے ممدوح کے صفات کی عکاسی کی جاتی ہے۔ خیال، اسلوب، اور موضوع، تینوں ہی گنجلک نہیں ہیں۔ ہر حال میں عام فہمی کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ ویسے ان کے خاکے پڑھنے سے ان کی شخصیت کا تاثر کم ہی ابھرتا ہے۔ مجتبیٰ کے خاکے پڑھتے جائیں تو خود مجتبیٰ حسین کی جھلک بھی دکھائی دینے لگتی ہے۔ مگر منظور وقار خالص ممدوح کی شخصیت کے اجاگر کرنے پر کمر کسے نظر آتے ہیں۔ ممدوح کے حالات کو بے قابو ہونے نہیں دیتے۔

ڈاکٹر وحید انجم:

ڈاکٹر وحید انجم بیک وقت شاعر، ادیب، صحافی اور خاکہ نگار بھی ہیں۔ یہ کافی دراز قد ہیں۔ ان کی شاعری سے ان کا قد بھی بڑا ہے۔ وحید انجم اپنی شاعری کی بہ نسبت خاکوں میں کھل کر سامنے آتے ہیں۔ انھوں نے علاقہ حیدرآباد کرناٹک کی کئی شخصیتوں کے خاکے لکھے ہیں۔ خاکوں کے فن میں وہ اپنے استاد ڈاکٹر طیب انصاری اور وہاب عندلیب کا فن اپنانے کی شعوری کوشش کرتے ہیں۔ خاص کر سراپا نگاری کا کلاسک انداز جو وہاب عندلیب کے خاکوں کا خاص جوہر ہے، وحید انجم کے خاکوں کے لئے بھی لازم وملزوم ہے۔ 1978ء میں انھوں نے پہلا خاکہ لکھا۔ جوان کے عزیز دوست محبوب پٹیل ماہر پر لکھا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ پروفیسر راہی قریشی، ڈاکٹر طیب انصاری، ڈاکٹر جلیل تنویر، ڈاکٹر رزاق اثر، پروفیسر عبدالعزیز، ، ڈاکٹر راہی معصوم رضا (فلم اسکرپٹ رائٹر) ڈاکٹر منظور احمد دکنی، صابر فخر الدین یادگیر، ڈاکٹر جاوید رفاعی، عزیز بلگامی، پروفیسر سیدہ جعفر، ڈاکٹر لئیق صلاح اور ڈاکٹر پیرزادہ فہیم الدین وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

وحید انجم میں خاکہ نگاری کے جوہر بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ بعض خاکے خاکہ نگاری کے

فن پر پورے اترتے ہیں تو بعض سوانح و تاثراتی مضمون نما بھی بن جاتے ہیں۔ خاکوں میں جا بجا مزاح کو داخل کرنے کی شعوری کوشش سے خاکہ دلچسپ ہو جاتا ہے۔ اساتذہ میں ڈاکٹر راہی قریشی، ڈاکٹر جلیل تنویر، ڈاکٹر طیب انصاری، وہاب عندلیب اور ڈاکٹر لئیق صلاح پر خاکے لکھے ہیں۔ ساتھی شعراء میں عزیز بلگامی، صابر فخر الدین اور ڈاکٹر رزاق اثر شاہ آبادی کے خاکے محفلوں میں سنا کر داد حاصل کر چکے ہیں۔ اگر وحید انجم ان خاکوں کو کتابی شکل دینے کی زحمت گوارا کریں تو حیدرآباد کرناٹک علاقے کی خاکہ نگاری کی تاریخ میں ایک اور خاکوں کی کتاب کا اضافہ ہوگا۔ وحید انجم چونکہ فعال شخصیت کے مالک ہیں۔ اس لئے میں ان کی آئندہ آنے والی کتاب کی قبل از وقت مبارک باد دیتی ہوں۔

امجد جاوید:

محمد امجد حسین کا قلمی نام امجد جاوید ہے۔ نیشنل کالج میں کامرس کے لیکچرار کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ افسانہ نگاری اور تنقید ان کے مشاغل ہیں۔ کئی ادبی انجمنوں اور فلاحی اداروں سے وابستگی ان کے اندر موجود ادبی جولانی کے اظہار کا ذریعہ نہیں ہے۔ انہوں نے جہاں متعدد افسانے اور تنقیدی مضامین تحریر کئے ہیں ایک تاثراتی مضمون گلبرگہ کی شخصیت ''ابراہیم ماموں'' پر بھی لکھا ہے۔ یہ مضمون شائدان کی رحلت کے بعد، تعزیتی محفلوں میں پڑھا گیا۔ یہ خاکہ سے زیادہ ایک تاثراتی مضمون کی بہترین مثال ہے۔ ''ماموں'' مضمون ہے۔ خاکہ نہیں۔ چونکہ امجد جاوید ایک افسانہ نگار ہیں۔ اس میں افسانوی کیفیت بھی گھل مل گئی ہے۔ ایک شخصیت کے اس دنیا سے رحلت کر جانے کے بعد ان کی یاد میں، پیش کئے جانے والا یہ تاثراتی مضمون گلبرگہ کی اہم شخصیت بے لوث خدمت گار کامریڈ بادین کی زندگی کی جھلکیاں بھی پیش کرتا ہے۔ اس لئے لوگوں نے اسے خاکہ کہا ہے۔ ورنہ یہ تاثراتی و تعزیتی مضمون کی خوبصورت مثال ہے۔ یہ بات اٹل طریقہ سے نہیں کہی جاسکتی کہ یہی خاکہ ہے اور یہی مضمون کی سرحد ہے۔ خاکہ کی صنفی خوبی یہی ہوتی ہے کہ وہ بیک وقت کئی اصناف کا احاطہ کرتے ہوئے بھی علاحدہ صنف کا درجہ برقرار رکھتا ہے۔ طبع موزوں اس کی شاہد ہوتی ہے۔

ڈاکٹر فوزیہ چودھری:

اکثر کہا جاتا ہے خود پر لکھنا بہت مشکل ہے۔لیکن یہ ایسا مشکل کام بھی نہیں ہے۔ہاں انکے لئے جو صرف اپنی تعریف سننا چاہتے ہوں، اور خامیوں سے گریز کرتے ہوں۔اپنے منہ میاں مٹھو بن جانے کا خدشہ ہو سکتا ہے یا جو اپنے عیب کی طرف اشارہ نہیں کر پاتے۔یا جنہیں اپنے عیب دکھائی ہی نہیں دیتے ہوں۔میرے ساتھ ایسا معاملہ نہیں ہے۔میں اپنے محاسن اور عیوب کو بہتر طور پر سمجھ سکتی ہوں۔میں نے مقالہ لکھنے کے دوران اپنے ہی لکھے خاکوں کو دوبارہ پڑھا ہے، ایک نقاد کی نظر سے دیکھا ہے۔اپنی تحریر سے خود کو الگ کر دیا، تا کہ اسکا بھر پور جائزہ لے سکوں۔

''مہرباں کیسے کیسے'' ڈاکٹر فوزیہ چودھری کی یعنی میری اکلوتی کتاب ہے۔اس میں تیرہ خاکے ہیں۔جو کرناٹک کی ادبی شخصیتوں پر لکھے گئے ہیں۔۔ان میں اوروں پر خاک کم ڈالی گئی ہے۔خود پر خاک زیادہ پڑی ہے۔ان خاکوں میں ایک خاکہ بہت کمزور ہے۔وہ ہے فریدہ رحمت اللہ خان کا، جنہیں اس سال راجیوتسوا ایوارڈ سے نوازا گیا۔عورت ہو کر ایک عورت کا خاکہ لکھنے میں اس قدر بخیلی کا ثبوت کیوں دیا گیا؟ خاکوں کی اس کتاب میں صرف دو عورتوں کے خاکے ہیں۔ایک حلیمہ فردوس کا ہے۔دوسرا فریدہ رحمت اللہ کا۔اس کا جواب دینے سے پہلے میں اپنا طریقہ تحریر واضح کرنا چاہتی ہوں۔جب بھی کسی کا خاکہ لکھا ہے، موضوع کی شخصیت پر، ایک کچا خاکہ تیار کیا ہے۔، پھر اس شخصیت سے بار بار ملاقاتیں ہوتیں، فرمائش پر ان کی زندگی سے متعلق سنتی، سنے ہوئے واقعات کا تجزیہ کرنا، کتابوں سے موازنہ کرنا، تنقیدی نگاہ ڈالنا، حتی کہ زبان کی نوک پلک سدھارنا، وغیرہ۔کچی سیاہی سے پکی سیاہی میں آنے کیلئے جس عرق ریزی کی ضرورت ہوتی ہے، میں نے کی ہے، لیکن فریدہ صاحبہ نے کچے خاکے کے بعد خاکے کے دیگر مراحل میں میرا ساتھ نہیں دیا ہے۔جس کے نتیجہ میں خاکہ کچے کا کچا ہی رہ گیا۔اس کے برخلاف حلیمہ فردوس کا خاکہ مجھے پسند ہے۔ایک فریدہ رحمت اللہ کے خاکے کو چھوڑ کر باقی خاکوں پر محنت کی گئی ہے۔

ایک چیز جو مجھے یہاں کھلتی ہے وہ ہے نسوانیت۔ایک عورت ہوتے ہوئے ،مردوں کا خاکہ لکھنا مشکل کام ہے۔ہم مردوں سے کھل کر بات نہیں کر پاتے ،عورت ہونے کا لحاظ بھی رکھنا پڑتا ہے۔دوسری چیز جو میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں ۔وہ زبان سے متعلق ہے،زبان کا علمی ہونا خاکوں کے لئے جان لیوا ثابت ہوسکتا ہے۔میں اپنی زبان کو کچھ اور آسان کر دیتی تو اچھا تھا۔لیکن یہ کام مجھ سے ہونہیں سکا۔ادق الفاظ تو نہیں ہیں،لیکن زبان کی سجاوٹ میں وقت کا بہت اصراف ہوا ہے۔قارئین اکثر کہتے ہیں کہ یہی میرے خاکوں کی جان ہے۔کئی جگہ میری خاکہ نگاری،انشائیہ نگاری میں بدل جاتی ہے۔کبھی کبھی تو مضمون نگاری بھی لگتی ہے۔تمام خامیوں کے باوصف ،دلچسپ انداز بیان ،مکالمے، کچھ ڈرامائی کیفیت ،تخلیقی زبان ،واقعات کا جا بجا مشرن ان خاکوں میں جان ڈال دیتا ہے۔

امجد علی فیض:

امجد علی فیض (1965.2005) کا تعلق گلبرگہ سے ہے۔ان کی پیدائش 1965ء میں گلبرگہ ہی میں ہوئی۔ وہ گلبرگہ کے ادارۂ ذہن جدید کے سرگرم رکن تھے۔پیشے سے انجینیر ہوتے ہوئے بھی اینٹوں اور پتھروں سے زیادہ کتابوں پر جان چھڑکتے تھے۔ادب کا ذوق فطری تھا۔مطالعہ کی عادت تھی۔شوقیہ لکھنے لگے۔متعدد مزاحیہ مضامین لکھے۔جوں جوں لکھتے گئے ،لوگ سراہتے گئے۔ شوق بڑھتا گیا۔جستہ جستہ ابتدائی مزاحیہ مضامین کو جوڑ کر برجستہ کتاب 2004ء میں تیار کی۔اسم بامسمہ نام بھی ''جستہ برجستہ'' رکھا۔یار دوستوں کی فرمائش پر وقتاً فوقتاً خاکے بھی لکھے ہیں۔لیکن منصۂ ادب پر ابھرے ہی تھے کہ گردوں کی خرابی سے چل بسے۔صد حیف پروانۂ اجل نے گلبرگہ والوں سے ایک ذہن جدید کا حامل ،ابھرتا ہوا فنکار چھین لیا۔

امجد علی فیض کی وفات کے بعد ان کے احباب نے ،ان کے خاکے اور تبصرے اکٹھا کر کے زیور طبع سے آراستہ کیا ہے۔2007ء میں ان کی وفات کے بعد شائع شدہ کتاب کا نام رکھا گیا ''خاک کے پردے سے''۔اس کتاب میں سات خاکے ہیں جو حمید سہروردی ،برکت الحق ،

راہی قریشی، خالد سعید، وحید انجم، فارق نشتر، منظور وقار، اور سردار سلیم پر لکھے ہوئے ہیں۔

امجد علی فیض نے اپنے سامنے چلنے پھرنے والی گلبرگہ کی ادبی شخصیتوں پر جن سے وہ متاثر تھے، یہ خاکے لکھ کر اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ ان میں مزاح ہے۔ اسلوب متوازن کبھی چست ہے۔ زبان افسانوی ہوتے ہوئے بھی الجھی ہوئی کم اور سلجھی ہوئی زیادہ ہے۔ خاکے مختصر مگر دلچسپ ہیں۔ طرز تحریر اور یجنل ہے۔ یہ طرز انکا اپنا ہے۔ ایسا کہیں نہیں لگتا کہ گفتگو تو ہو رہی ہے اور موضوع نہیں مل رہا ہے۔ برموضوع گفتگو ہے، اور برمحل الفاظ کا انتخاب، کفایت لفظی کے ساتھ ہے۔ بعض جگہ امجد علی فیض چپ ہو جاتے ہیں اور بین السطور میں سرگوشیاں چھپا دیتے ہیں۔ شخصیتوں کی تصویر کے ساتھ ساتھ ماحول اور منظر بھی بولنے لگتے ہیں۔

ان خاکوں کی اکثر شخصیتیں میری بھی دیکھی بھالی ہیں۔ پڑھتے وقت میری نظروں میں ان شخصیتوں کا چہرہ بار بار پھر رہا تھا۔ میں اپنے تجربے کی بنیاد پر بھی کہہ سکتی ہوں کہ خاکہ نگاری کی یہ کوشش ایک کامیاب کوشش ہے۔ مجموعی طور پر خاکہ نگار کامیاب ہے۔ □□

حیدر آباد کرناٹک کا اردو افسانہ

ڈاکٹر کوثر پروین
معلمہ نیشنل ہائی اسکول، گلبرگہ

حیدر آباد کرناٹک کے اردو افسانہ پر بات کرنے سے پہلے ہم یہ جان لیں کہ حیدر آباد کرناٹک کی ادبی تاریخ کیا ہے کیونکہ اردو نثر کی تاریخ سے حیدر آباد کرناٹک کے اردو افسانے کی تاریخ جڑی ہے، کہا جاتا ہے اردو کا افسانہ پریم چند (۱۹۰۱ء میں یا پھر ۱۹۰۷ء) کی دین ہے لیکن ماہنامہ ''صباء'' میں شائع شدہ مضمون میں گیان چند جین لکھتے ہیں۔ افسانے کا آغاز بھی بندہ نواز کی تحریر میں ملتا ہے۔

> ''معراج العاشقین' حضرت خواجہ بندہ نواز کی تصنیف کو اردو کی پہلی نثر تسلیم کیا جاتا ہے، لیکن حالیہ تحقیق کے مطابق '' یہ آپ سے منسوب ہے مگر دراصل آپ کے ہم نامی ایک بزرگ جو علاتے رائچور سے قریب آرام فرما ہیں ان کی تصنیف ہے'، گلبرگہ ابھی ثابت نہیں ہو پایا۔

مگر مجید بیدار اپنی تحریروں میں لکھتے ہیں۔ معراج العاشقین کی زبان و اسلوب اور نثر کی بنیاد پر یہ ثابت کیا جا سکتا ہے یہ آپ ہی کی تصنیف ہے جو چکی نامہ کی زبان و اسلوب سے میل کھاتی ہے۔ یہاں پر شک کی گنجائش کم ہو جاتی ہے اور گیان چند جین کا جواز قابل غور لگتا ہے اور اردو نثر کی اس پہلی تصنیف میں ہی اردو افسانے کے آثار نظر آتے ہیں۔

گویا حیدر آباد کرناٹک میں اُردو افسانے کی تاریخ اردو نثر کے ساتھ ہی شروع ہوتی ہے۔ وہ دور بہمنی دور تھا جب اس حکومت کا شیرازہ بکھر گیا۔ حیدر آباد کرناٹک کا یہ حصہ ریاست حیدر آباد میں شامل رہا۔ آصفیہ دور میں بھی اس علاقے نے اپنی ادبی شناخت باقی رکھی۔

ادبی روایات، تحریکات اور رجحانات کا اثر حیدرآباد کرناٹک کے اردو افسانے پر بھی رہا کیونکہ ادب کی عالمی تاریخ بتلاتی ہے۔ جوں جوں انسان کے ادراک حقیقت کے انداز میں فرق آتا گیا ویسے ہی ادب کی تخلیق اوراس کے اسالیب کے بارے میں نقطہ نظر بدلتا گیا۔

تخلیق انسانی شعور واحساس، زماں ومکاں کی تابع ہوتی ہے۔ اسلئے کہ بلند پایہ تخلیق نہ تو ہمہ نویسی ہے اور نہ شعبدہ گری بلکہ وہ قاری کے ذہین کی رفیق کار ہوتی ہے۔ اسکے لئے ضروری ہے کہ تخلیق ان دریچوں کو ملا کرے جن سے قاری کو زندگی کا حسن، لے وترنم مہک وخوشبو حاصل ہوتا کہ اسکی زندگی کو تقویت اوراس کے شعور کو توازن حاصل ہو۔ اسکے لئے فن کار کو چاہئے کہ وہ ان تجربوں کو اختیار کرے جس سے قاری کے ذہین واحساس کو اپنی گرفت میں لینے کے اہل ہوں اور ایسا اسلوب استعمال ہو کہ قاری کے ذہن میں صحیح اور باصفی ردعمل پیدا ہو سکے۔

حیدرآباد کرناٹک کی تاریخ اسی فنی خصوصیت کی حامل ہے۔ ۱۹۳۶ء میں جب مہاراشٹرا وشمال میں ترقی پسند کا بول بالا رہا۔ اس سے قبل رومانی افسانوں کا دور رہا۔ تب ۱۹۳۲ء میں یہاں بھی ادبی سرگرمیاں عروج پر تھی۔ گلبرگہ کلب کے قیام سے ادبی سرگرمیاں عروج پر تھیں اور ابراہیم جلیس نے ''پیام برداری'' کی بناڈالی تو کئی ترقی پسند ادیب وفن کار اس میں شریک رہے۔ اسی زمانے میں عبدالقادر ادیبؔ نے پریم چند سوسائٹی قائم کی۔ کتب خانہ و بزم ادب کے قیام عمل میں اور ہر ماہ ادبی نشستیں ہوتی۔ محبوب حسین جگر، فضل گلبرگوئی، نیاز گلبرگوئی، قادر جاوید، وزیر علی سہروردی، عثمان صحرائی، عوض سعید، غلام حسین ساحل، اصغر شاہ آبادی، رشید خاں، شیونکپا ہد ہد، محمود حسین آغوش، ع۔و۔رشید، فائز افضل وغیرہ نے اپنے فن کا سفر وافسانہ نگاری کا آغاز کیا۔ کچھ دور چل کر اپنا سفر انہوں نے شاعری کی طرف جوڑلیا شاید وجہ یہ تھی ابراہیم جلیس کے ہمراہ اپنی شناخت کا سفر مشکل رہا ہو۔ ابراہیم جلیس کے افسانے ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے۔ عوض سعید نے شہر حیدرآباد کا رخ کیا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد نیاز گلبرگوئی اور فضل گلبرگوئی پاکستان منتقل ہو گئے۔ گو کہ ابراہیم جلیس نے بھی ترک وطن کیا۔

ایک نجی نشست میں نیاز گلبر گوئی نے فرمایا تھا۔ ان کا ایک افسانہ جو رومانی تھا بہت قیامت خیز تھا۔ حلقۂ احباب میں کافی واویلا مچا کہ یہ ایک دوست کی نجی زندگی ہے۔ پھر تو انہوں نے رومانی افسانوں سے رخ موڑ لیا۔

60 کے دہے میں جو قافلہ حیدر آباد کرناٹک کے افسانوی اُفق پر آیا۔ ان میں ترقی پسند تحریک سے متاثر افسانہ نگار بھی رہے اور جدیدیت کی لہر سے متاثر بھی۔ کسی نے روایت کا دامن تھامے رکھا۔ کسی نے رجحان پر زور دیا۔ شاید اسلئے کہ ادب کی جڑیں نظریات ہی سے پیوست ہوتی ہیں۔ فکر، خیال، آدرش، تمثیلیت کی بسیط فضاء سے فن جڑا ہوتا ہے، مگر اپنے خیال وفکر اور جذبہ احساس کی مدد سے نئی جہت، نئی توانائی اور نئی اجرتوں کی تلاش ہی رجحانات کی تبدیلی کا باعث بنتی ہیں۔ تحقیق وتلاش، تحلیل وتجزیہ، باریکی اور صحت کی جانب رغبت ہی رجحان ہے۔ زندگی تغیرات وحرکت کی پابند ہے اور یہ تغیر وحرکت ہی عقلی مزاج کو خم دیتا ہے۔ عقلی مزاج کے تحت ہی ادبی رجحانات کی نشو ونما ہوتی ہے اور یہ تمام تبدیلی بھی حیدر آباد کرناٹک کے افسانے کے سفر میں رہی۔ حیدر آباد کرناٹک (سقوط حیدر آباد کے بعد) تین ضلعوں پر مشتمل ہے۔ رائچور، گلبرگہ، بیدر۔ 60 کے دہئے میں گلبرگہ، بیدر اور رائچور میں کوئی آثار نہ مل سکے یا پھر میری پہنچ نہ ہوسکی ہو۔ گلبرگہ میں ان دنوں شاہد فریدی، شکیب انصاری نے ترقی پسند تحریک کے زیر اثر افسانے لکھے۔ شکیب انصاری کے افسانوں پر نظر ڈالی جائے تو جہاں ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ملتے ہیں۔ وہی جدیدیت کا رجحان بھی نظر آتا ہے۔ یا پھر اسے ہم ان دونوں کے درمیان کی کڑی کہہ سکتے ہیں۔ ''گوتم کی واپسی'' اسکی اچھی مثال ہے۔ ان کے افسانوں میں روایت شکنی نہیں اور نہ مقصدیت کا ٹھوس اقدام، اسلئے کہ روایت جامد اور غیر تغیر شکل نہیں کہ متحرک اور تغیر پذیر تصور ہے۔ اس لئے کہ یہ ماضی سے رشتے کو ظاہر کرتی اور حال کے لمحات کو ضم کرتی ہے، اس لئے کہ روایت وقت کے تسلسل کے ساتھ جڑی رہتی ہے۔ اگر اس تعریف کے پس منظر میں دیکھا جائے تو شکیب انصاری کے افسانے اس پر پورے اترتے ہیں۔ جسکی اچھی مثال ''گوتم کی واپسی'' ہے۔ آپ کے افسانے

کی فضاء معاشرے کی ناہمواریوں کو تمثیلی روپ عطا کرتی ہے۔ مکالمے، بیانیہ اور پلاٹ کی چستی فن کی پختگی کا پتہ دیتی ہے۔ افسانہ ''بقائے ستون'' علامتی پیرایہ میں موجود سیاسی اور تہذیبی علائم سے سجا ہوا ہے۔

شاہد فریدی شکیب انصاری کے ہم عصر فن کار ہیں۔۱۹۶۳ سے ۱۹۷۲ء کے درمیان میں بیسویں صدی میں شائع ہوتے رہے۔ آپ کے افسانے اپنے فنی روایت لوازمات کے ہمراہ تخلیق ہیں۔ ''کانٹوں کا سفر'' آپ کا افسانوی مجموعہ ہے۔ جس میں روایتی افسانوں کے ہمراہ ترقی پسند کی جھلک اور زندگی کی جہت نظر آتی ہے۔

۶۰ کے دہے بعد جو قافلہ نظر آتے ہیں، اس میں جدیدیت کی لہر سے زیادہ متاثر کن قافلہ رہا۔ جن میں اکرام باگ، حمید سہروردی، ریاض قاصدار، بشیر باگ، لطیف حزیں، نجم باگ، وقار عظیم، بدر مہدی، حامد اکمل، جلیل تنویر، حکیم شاکر، خالد سعید، وحید انجم وغیرہ ملتے ہیں۔

اکرام باگ و حمید سہروردی نے اپنے اسلوب و تجربات کی نئی شناخت بنائی۔ اکرام باگ نے نئی اور منفرد جہت نگاری، اچھوتے سائنسی اور ریاضیاتی وضعیات پر قائم افسانے لکھے، انکی اپنی منفرد تکنیک نے سب کو چونکا دیا۔ ''کوچ'' اکرام باگ کا افسانوی مجموعہ ہے۔ کوچ، رخش پا، اقلیما سے پرے، دم، افعی، حیات، تقلید بردار، کابوس، توفیق جیسے منفرد افسانے ہیں۔ اکرام باگ کا تجریدی رنگ قاری کیلئے معمہ لگتا ہے تو نقاد کیلئے ایسی ماورائی دنیا جہاں سے نتیجہ اخذ کرنا جوئے شیر لانا ہے۔ آپ کے افسانوں میں تجسس کی فضاء ابتداء سے آخر تک قائم رہتی ہے۔ موضوع پر مکمل گرفت پائی جاتی ہے۔ انسان کے کرب و شکستگی کا عکاس واضح نظر آتا ہے۔ افسانے میں منظر نگاری، تشبیہات اور کفایت لفظی افسانے کو دلچسپ بنانے میں مزید معاون نظر آتے ہیں۔ تمثیل آپ کے افسانے میں پائی جاتی ہے۔ ان افسانوں میں علامتی و استعاراتی بیانیہ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ تلازمہ خیال کی تکنیک کا استعمال بھی بہت عمدگی سے ہوا ''تقیہ بردار'' اس ذیل میں شامل افسانہ ہے جس میں عشق کی جہات اور تصوف و صوفیوں کے اعمال کا بھی رمزیہ بیان

متاثر کن ہے......

''اب بھی سارے کا سارا ماحول کہر آلود تھا۔ باہر امانت سے ملحقہ پہاڑ، ازلی گواہان، تسبیح خواں سنبیل کے درخت...... سب کے سب دھند میں ڈوبے ہوئے تھے۔ میں ویسے سردی ہو یا بارش سحر گزیدہ ہوں۔ اس رات رضوان نے رخصت ہوتے ہوئے پھر سے اسی وقت وہاں چلنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا مجھے محسوس ہوا کہ ارادہ موسم سے بے نیاز ہے یوں اس رات تعلیم گاہ میں کچھ زیادہ ہی سلوک نوشی رہی تھی۔ کمرے میں کوئی بلب تو تھا نہیں اسلئے تھرتھراتے چراغ کے موؤں سے نشتر مراجتی دھوئیں میں چہرے باتیں اور شاید منزلیں گمان ہی گمان تھیں''۔

اکرام باگ کے یہاں تمثیلی پیرائے کافی نظر آتے ہیں۔ آپ کے فن کا جائزہ لیا جائے تو تذکرے کے بغیر جدید افسانے کی تاریخ جہاں نامکمل ہوگی وہی اکرام باگ کے ذکر کے بغیر مابعد جدید کا ذکر بھی ادھورا ہوگا۔ مگر، توفیق کے بعد ''اس گلی سے'' کے زیر عنوان افسانے پیش کر کے اکرام باگ نے اشارہ دیا ہے کہ انہوں نے رخ موڑ لیا ہے۔

حمید سہروردی گلبرگہ ادبی افق پر ایک اور نام ہے، جنہوں نے افسانے کو نیا ذائقہ اور لہجہ دیا۔ حمید سہروردی ۱۹۶۵ بعد کی وہ نسل ہے۔ جو نہ ترقی پسند کی ضد ہے اور نہ جدیدیت کا ردعمل تھی بلکہ زندگی کی بے معنویت کی پوری آگاہی کے ہمراہ اپنا وجود لیے نیا افسانہ کہے جانے والے قافلے کا فن کار ہے۔

اس قافلے میں موجود ریاض قاضدار جن کا پہلا افسانہ شب خون الہ آباد میں شائع ہوا۔ ان کے یہاں کہانی پلاٹ کے اہتمام کے ساتھ اور بیانیہ کے ہمراہ بڑھتی ہے۔ آپ کے افسانوں میں عصر کی سیاسی حالات اور عالمی پس منظر نظر آتا ہے۔ لہجہ جدید فکری ہونے کی بناء پر متاثر کرتا ہے۔ تلازمہ خیال اور شعور کی رو کی تکنیک سے استفادہ ملتا ہے۔ مکالمہ بہت جاندار ہوتا ہے۔ آپ کے افسانوں میں تمثیل نگاری بھی موجود ہے۔

بشیر باگ کا اپنا منفرد اسلوب ہے۔ جو علاقائی ہمعصروں میں ممتاز بنا دیتا ہے۔ ان کے بیانیہ میں ڈرامائی و مافوق الفطرت عناصر کا عنصر خاصہ توجہ طلب ہے۔ ان افسانوں کے تانے بانے داستانی رنگ میں سیاسی ونفسیاتی خوف وموت کے انفرادی احساسات اجتماعی رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ آکٹوپس، ''جنگ'' اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔

لطیف حزیں وہ فن کار ہیں جن کے تجرید سے وابستہ افسانوں نے متوجہ کیا۔ جہاں تجریدی فضاء شعری اسلوب میں ڈھل جاتی ہے۔ وہیں کردار محض پرچھائی اور پلاٹ کا انہدام دیکھائی پڑتا ہے۔ حکیم شاکر کے افسانوں میں تجریدی عناصر کہیں کہیں علامت نگاری کی سعی ملتی ہے۔ حامد اکمل اس قافلے کا منفرد فن کار ہے۔ جس کا پہلا افسانہ ۶۸ میں دہلی کے رسالے میں ''تعبیر آشنا'' شائع ہوا۔ ''تعبیر آشنا'' اور ''ریڈیویسٹ'' ترقی پسند تحریک کے اثرات کے زیر اثر تخلیق کردہ ہیں۔ ''تعبیر آشنا'' مزدور کی کہانی پر مشتمل ہے جبکہ ریڈیویسٹ ایک سرکاری ملازم کی دبی ہوئی امنگ کی کہانی ہے۔ حامد اکمل نے کئی علامتی افسانے لکھے جن میں ''محور''، ''دوسرا کنارہ''، ''پیاز کے پاؤں''، ''دستاویز'' وغیرہ میں غیر معمولی علامت نگاری ہے۔ ۱۹۷۶ء میں ''کرفیو کا لک کتا'' فسادات کے موضوع پر خالص علامتی افسانہ ہے۔

جلیل تنویر ایسے فن کار ہیں جن کے افسانے روایت و بیانیہ سے جڑے فن پارے ہیں۔ ''حصار'' ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے جو ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا۔ نجم باگ نے اچھی شروعات کی اور عصری حسیت سے مزین افسانے لکھے اور ان دنوں ان کا قلم خاموش ہے۔ خالد سعید نے جو بھی لکھا خوب لکھا۔ شاید ہی جدید افسانے کی رغبت انہیں شاعری کی طرف لے گئی۔ خالد سعید کے افسانوں میں زندگی کا کرب، حالات کی جدوجہد، وقت کا شکنجہ میں جکڑی ذات کی بے کسی کا منظر خوب ہوتا ہے۔ طاقت پرواز، شب خون، آہنگ، کتاب نما وغیرہ میں اپنے افسانے شائع کروا کر اب شاعری کی طرف مائل ہیں۔ وحید انجم، اپنی نوعیت کے منفرد فن کار ہیں۔ اچھے افسانہ نگار کے ساتھ شاعر بھی ہیں۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''کڑی دھوپ کا سفر'' کے نام سے ۱۹۸۷ء

میں منظرِ عام پر آیا۔ وحید انجم کو بیانیہ پر گرفت حاصل ہے۔ ان کے فن پر اکثر یہ کہا جاتا رہا کہ ان کے افسانے روایتی طرز کے ہیں۔ مگر ان دنوں غیر سماجی عناصر، غربت کے مسائل پر توجہ دے رہے ہیں۔ یعنی اب روایتی افسانوں کے حصار سے باہر نکل آئے ہیں۔

ناظم خلیلی ۷۰ کے دہے کے فن کار ہیں۔ شاعری کے ہمراہ افسانہ نگاری بھی کرتے ہیں، ان کے افسانوں میں بیانیہ نپا تلا اور سماجی مسائل کی بھر پور عکاسی ملتی ہے۔ ان دہوں میں ضلع بیدر میں کوئی نام نظر نہیں آتا۔ یا پھر میری تلاش میں کوتاہی رہی ہو۔ ۱۹۷۰ء کے بعد آنے والی نسل میں ایک نیا منفرد نام علیم تماپوری کا بھی ہے جنکے نثری شہ پارے انشائیہ انداز لیے ہوئے ہیں۔ ادب لطیف کے شاہکار تھے۔ 'بربطِ حیات'' ۷۶۔۱۹۷۵ کے درمیان لکھ کر انہوں نے گلبرگہ کی ادبی فضاء میں ہل چل مچادی تھی۔ انہیں دنوں ضلع رائچور سے م۔ صبوحی نامی فن کارہ بہت اچھے افسانے لکھا کرتی تھی، کہا جاتا ہے ان کا تعلق یوپی سے تھا اور بعد کو وہ وہی منتقل ہو گئی۔ ۱۹۸۰ کے بعد کے فن کاروں کے قافلے میں شمیم ثریا، ہمیرا حیدر منظور وقار، مختار احمد منو، کوثر پروین، امجد جاوید، عبیداللہ، صادق کرمانی، حقیقت حاجی، کوثر پروین انصاری، حنیف قمر، خدیجہ ناز، زرینہ ناہید، صبیحہ خانم، نفیس بانو، علیم احمد وغیرہ کے افسانے شامل ہیں۔ مختار احمد منو، منظور وقار، حنیف قمر، خدیجہ ناز، صادق کرمانی، عبیداللہ، نفیس بانو، زرینہ ناہید نے اچھے افسانے لکھے۔ منظور وقار اور مختار احمد منو نے مزاح کی جانب رخ موڑلیا۔

علامت اور جدید لہر کا اثر امجد جاوید کے ہاں ملتا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی ان کے ایک افسانے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ امجد جاوید کے افسانے ''گھر میں افسانے'' کا ذکر ضروری ہے کہ انسانی خودغرضی سے آنکھیں چار کرنے کی تنگ دل ہمت امن افسانے میں ملتی ہے۔ اسکی مثال ڈھونڈنے ہمیں بہت دور جانا پڑیگا۔ امجد جاوید کے یہاں موضوع و بیاں کا اچھوتا پن ملتا ہے۔ سیاسی استحصال اور شخصی بے حسی کا المیہ علیم احمد کے ہاں ملتا ہے۔ تمثیل و استعارے سے بھی علیم احمد نے افسانے کے تانے بانے بنتے ہیں ''پچسواں گھنٹہ'' ڈریم شاپ تمثیلی افسانے ہیں۔

حیدرآباد کرناٹک کے افسانوں میں سمیرا حیدر کے افسانے جس میں غالب رجحان ہلکے رومانی ہونے کے ساتھ ساتھ فن کے روایت کی پاسداری اور جمالیات کی موشگافیاں ملتی ہیں۔ ''خواب گہن اور کلیاں'' ''خرمزی رشتے'' ان دونوں مجموعوں میں کردار بہت عمدہ ہیں۔ منظر نگاری اور جزئیات نگاری میں کمال حاصل ہے۔ افسانے کی فضاء قدرتی مناظر یوپی کے محسوس ہوتے ہیں اس کے علاوہ عورت کی سماجی حیثیت اور سماجی مسائل کی عکاسی نمایاں رہی ہے۔

''ہلچل سی کوئی'' ''بن باس'' جیسے افسانوی مجموعے کی خالق کوثر پروین کے افسانے حیدرآباد کرناٹک کے افسانوں میں اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ ابتدائی افسانوں میں روایت اور ترقی پسند عناصر کی کارفرمائی نظر آتی تھی۔ بعد کو لب ولہجہ تبدیل ہوا۔ سماجی مسائل کو تہذیبی عناصر کی آنکھ سے دیکھنے کا ہنر انہیں مابعد جدید افسانہ نگار کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔ ''دوڑتے دوڑتے'' جیسے علامتی افسانے بھی ملتے ہیں ''وجود''، ''کمان کے دار'' جدیدیت کا احساس دلاتا تمثیلی افسانہ ہے۔ لہٰذا شمس الرحمٰن فاروقی افلاک کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں ''بن باس'' میں بیان کی وضاحت کے باوجود معاصر دنیا کی جرم زدگی اور بے دردی کا اچھا احساس ہے''۔ اکرام باگ کا کہنا ہے۔ وہ ہمارے علاقے کی کامیاب افسانہ نگار ہے۔ وہ اپنے ڈھب کے افسانے شائع کرتی رہیں تو ایک نمایاں خاتون افسانہ نگار کی حیثیت سے جانی جائینگی۔ ادھر کوثر پروین کے ہاں مسلم معاشرے کے انتشار، سماج کی بے حسی اور فرد کی بے کلی نظر آتی ہے۔

بیسویں صدی میں شائع ہونے والی شمیم ثریا گلبرگہ کی ادبی فضاء میں روشن نام ہے۔ اپنے ادبی ورثہ کی بناء پر ادبی روایات کی پاسدار فن کارہ ہیں۔ آپ کے افسانوں میں روایتی تاثر غالب ہے۔ موضوع سماجی ومعاشرتی ہوتے ہیں۔ بیانیہ بہت ہی خوش اسلوب ہوتا ہے کہ قاری کو بھی اپنے ہمراہ بہالے جاتا ہے۔ جیسے قاری بھی کہانی کی کوفاؤں میں کھو جاتا ہے۔ عورت کا کرب اسکی قربانی اور اسکے ساتھ ناانصاری پر قلم اٹھاتی ہیں۔ خصوصاً عورت کی سماجی حیثیت کو آپ نے موضوع بنایا۔ 'ادھ کھلا گلاب' ''من کا مور'' ''زندگی تیرے لئے'' نمائندہ افسانے ہیں۔ جزئیات نگاری ومنظر نگاری میں آپ کو کمال حاصل ہے۔

صبیحہ خانم ''بتول'' میں شائع ہونے والے افسانوں میں بیدر کی نمائندہ افسانہ نگار ہیں۔ تمام افسانے اصلاحی رنگ لیے ہوئے ہیں۔ اپنا گریباں بھول گئے، ''مہکتے ہاتھوں کی خوشبو'' تہی دامن، ساحل کے طوفان نمائندہ افسانے ہیں۔ بیدر کی ایک اور فن کارہ جو شاعرہ بھی ہے اور افسانہ نگار بھی ریحانہ تبسم کچھ مجبوریوں کی بناء پر رسائی نہ ہو سکی۔ مگر ریحانہ تبسم بیدر سے ایک ابھرتا نام ہے۔ جو افسانے کے اُفق پر ان دنوں روشن ہے۔ روبینہ قادری، ہاجرہ پروین، بی بی رضا خاتون وغیرہ افسانے کے افق پر نئے نام ہیں۔ جن سے مستقبل میں امیدیں بندھی ہوئی ہیں۔ حیدرآباد کرناٹک ادب کا ذرخیز علاقے ہے جو اردو کی پہلی نثر کے ہمراہ ہی اردو افسانے کی تاریخ شروع کی۔ جس نے کئی نمائندہ فن کار دیئے۔ مگر ایک کمی رہ جاتی ہے۔ جسطرح مہاراشٹرا یا دیگر علاقے کے فن کاروں کی طرح یہاں سے کسی بھی فن کار نے کوئی ایسا کردار نہیں دیا۔ جو فن کار کے نام سے ذہن پر ابھر سکے۔ یا کردار کے ساتھ فن کار کا نام، جیسے کرشن چندر کہتے ہی باپو گوپی ناتھ، کالو بھنگی، پریم چند کے ساتھ ہی دھنیہ، راجندر سنگھ بیدی کے ساتھ ''لاجونتی'' عصمت چغتائی کے نام سے ''چوتھی کا جوڑا'' حیدرآباد کرناٹک کے فن کار کو اس جانب توجہ دینی چاہئے۔ جسطرح منفرد لب ولہجہ اور علامت منظر و تمثیل میں پہچان بنائی، اسی طرح امید کہ کل کو یہی فن کار کوئی کردار بھی دیں۔

حیدرآباد کرناٹک کے اردو افسانے پر اجمالی نظر ڈالی جائے تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ اردو افسانہ روایت کے ساتھ ساتھ تحریک و رجحان سے بھی وابستہ رہا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر شکیب انصاری، شاہد فریدی، اور ریاض قاصدار کے نام ملتے ہیں تو جدیدیت کے تحت لکھنے والوں میں اکرام باگ، حمید سہروردی، بشیر باگ وغیرہ کے نام اہمیت رکھتے ہیں جن کے یہاں استعارہ، تمثیل، علامت، تجرید نظر آتی ہے۔ مابعد جدیدیت یا نیا افسانہ لکھنے والوں میں حمید سہروردی، کوثر پروین، امجد جاوید وغیرہ نظر آتے ہیں۔ بیانیہ اور کہانی پن کی طرف لوٹتی کہانی تخلیق کرنے والوں میں وحید انجم، ہمیرا حیدر، شمیم ثریا، کوثر پروین دکھائی دیتے ہیں۔

بہر کیف حیدرآباد کرناٹک کا افسانہ متحرک اور تغیر پذیر رہا ہے۔ اس نے فن کے ماضی سے رشتہ روا رکھا اور حال کے لمحات کو ضم کرتا بھی رہا۔ یعنی وقت کے تسلسل کے ساتھ یہ جڑا رہا۔ ☐☐

ایک طبع زاد تنقید نگار

ڈاکٹر ماجد داغی

مہمان لیکچرار، شعبہ اردو و فارسی، گلبرگہ یونیورسٹی، گلبرگہ

سید مجیب الرحمن ایک طبع زاد سوچ رکھنے والے اُردو زبان کے ادیب اور تنقید نگار ہیں جن سے میری پہلی شخصی ملاقات کرناٹک ہندی پرچار سبھا گلبرگہ میں اس وقت ہوئی جب 3 رمئی 1998 کو میں ممتاز مجاہد آزادی و سابق رکن قانون ساز کونسل شری ودیا دھر گرو جی کی صدارت میں ایک ہمہ لسانی ادبی تنظیم ''لوک ساہتیہ منچ'' کی تشکیل وقیام کے لئے ایک اجلاس منعقد کیا گیا تھا جس میں مختلف زبانوں، مذاہب اور علاقہ سے تعلق رکھنے والے ادباء، شعراء، صحافی اور دانشوروں کی کثیر تعداد موجود تھی۔ سید مجیب الرحمن نے اس اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے لوک ساہتیہ منچ کے دستور ونصب العین کو پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ منچ کے اغراض و مقاصد میں ہندوستانی تہذیب کی رنگارنگی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے ذریعہ تخلیق ادب کو فروغ دینا اور تمام مذاہب کے ماننے والوں میں بھائی چارہ اور قومی یکجہتی کو مستحکم کرنا ہے انہوں نے اس سلسلہ میں مزید تفصیلات بیان کرتے ہوئے قرآن شریف کے حوالے سے کہا تھا کہ ''اے انسانوں ہم نے تم کو ایک مرد و عورت سے پیدا کیا اور تمہیں مختلف قوموں اور قبیلوں میں پھیلا دیا تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو اللہ کی نگاہ میں عزت والا وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہو'' اور دیگر مقدس کتابوں کے حوالے سے کہا تھا کہ '' سچائی، اچھائی اور حسن ہی میں فن کا کمال ہے، سارے دھرموں کا احترام مساویانہ طور پر کیا جائے، کائینات کی ساری تخلیق کو خوشی اور مسرت ملے اور ساری دھرتی ایک خاندان ہے'' اس طرح انہوں نے 'لوک ساہتیہ منچ' کے لئے مختلف مذاہب کی مقدس کتابوں سے ماخوذ پرمبل

پیش کرتے ہوئے جن خیالات کا اظہار کیا اس سے ان کی فکر و نظریہ کی ترجمانی ہوتی ہے۔ سید مجیب الرحمٰن چونکہ بنیادی طور پر سیکولرزم اور سوشلزم کے پاسدار ہیں اور انتہائی اصول پسند انسان بھی اس لئے انہوں نے لوک ساہتیہ منچ کے پریمبل (پیش لفظ) میں مختلف مذاہب کے تقدس اور عظیم ہندوستان کی تاریخ و ثقافت کو بنیادی درجہ دیا۔

سید مجیب الرحمٰن پر لکھے گئے مضامین اور انکی تخلیقات کو پڑھنے اور تقاریر سننے سے معلوم ہوا کہ انہیں اردو، فارسی، سنسکرت، ہندی اور تلگو کے علاوہ انگریزی اور کنڑا زبانوں پر بھی عبور حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ ادب، فلسفہ، تاریخ، نفسیات، جمالیات، انشاء پردازی، تنقید و تحقیق اور طب (ہومیو پیتھک) سے بھی گہری دلچسپی ہے۔ سید مجیب الرحمٰن کا تنقیدی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ ''ماورائے شعور'' ۱۹۹۰ء میں منظرِ عام پر آیا۔ کرناٹک اردو اکیڈمی بنگلور نے ان کے ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں ایوارڈ سے نوازا۔

سید مجیب الرحمٰن کے والد سید عبدالرحمٰن حیدرآباد کی ایک جاگیر کے تحصیلدار تھے ان کے والد کا وطن برہان پور تھا۔ سید مجیب الرحمٰن 4 ستمبر 1923ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے، فوج میں ملازمت اختیار کی اور بعد میں انڈین ایرفورس میں خصوصی تربیت حاصل کی اور ہندوستان کے مختلف مقامات لاہور، بیگم پیٹ، اگرتلہ، آسام، رنگون اور ہند چینی کے سائیگان میں بھی ملازمت کے فرائض انجام دیئے اور تقسیم ہند کے بعد فوجی خدمات سے سبکدوش ہو کر محکمہ آثار قدیمہ میں ملازمت اختیار کر لی اور اورنگ آباد، کریم نگر اور میدک کے قدیم آثار اور بدھ کے دور کی باقیات پر کام کرتے ہوئے نیک نامی حاصل کی۔

ملک کی لسانی تقسیم کے نتیجہ میں یکم نومبر 1956ء میں ریاست کرناٹک کی تشکیل بھی عمل میں آئی تو مجیب الرحمٰن نے محکمہ آثار قدیمہ کے اعلیٰ افسر کی حیثیت سے رائچور، گلبرگہ اور میسور میں بحسن و خوبی اپنی ذمہ داری نبھاتے ہوئے میسور سے اپریل 1981ء میں وظیفہ حسن خدمت سے سبکدوش ہوئے۔ سید مجیب الرحمٰن اپنے غیر معمولی ذوق مطالعہ کی بنیاد پر 1965ء میں

کرناٹک یونیورسٹی دھارواڑ سے گریجویشن کی تکمیل کے بعد 1967ء میں اسی یونیورسٹی سے تاریخ میں ایم اے کی سند سے نوازے گئے۔

سید مجیب الرحمٰن سستی شہرت کے قائل نہیں بلکہ انتہائی موثر انداز میں اپنی پہچان رکھتے ہیں خواہ سرکاری ملازمین کے حقوق کی بات ہو یا اُردو، ہندی کی ترقی وترویج کا مسئلہ ہو وہ سنجیدہ بات چیت سے لے کر مظاہروں، جلوس وجلسوں اور دھرنوں میں بھی سب سے زیادہ پیش پیش نظر آتے ہیں۔

مجیب الرحمٰن نے اُردو زبان وادب کی ترویج واشاعت کے لیے جہاں انجمن ترقی اُردو شاخ گلبرگہ کی تشکیل جدید میں فعال کردار ادا کیا وہیں انجمن کے روح رواں کی حیثیت سے جو کار ہائے نمایاں انجام دیئے ہیں وہ ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ مجیب الرحمٰن ہندی زبان کی ترویج اور توسیع کے لیے کرناٹک ہندی پرچار سبھا اور حیدرآباد ہندی پرچار سبھا میں نائب صدر کی حیثیت سے بھی فعال وسرگرم عمل رہے ہیں۔ جب ہم مجیب الرحمٰن کی پرورش، خاندان، تعلیم، دوست و احباب اور ان کے حالات کا مطالعہ کرتے ہیں تو مجیب الرحمٰن کی شخصیت سازی میں کارفرما عوامل سے ہمیں واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ وہ ان خیالات سے متاثر تھے کہ علم ایک گہرا سمندر ہے اور ہمیں اپنی دلچسپی کی بنیادوں پر اس کے کسی ایک شعبہ کو منتخب کرنا چاہیے اور علم وآگہی کے ساتھ ساتھ کسی نہ کسی فن میں مہارت حاصل کرنے کا بھی مشورہ دینے والے صدر مدرس نامپلی ہائی اسکول حیدرآباد جناب مرزا محمود علی بیگ سے بہت متاثر تھے۔ جب وہ 1941ء میں اسی مدرسہ میں زیر تعلیم تھے۔ مجیب الرحمٰن مارکسزم کے گہرائی سے مطالعہ کے دوران 1946ء میں ضلع چوبیس پرگنہ نواب گنج، بنگال میں امبیکا چکرورتی، گنیش گھوش اور اننت سنگھ و دیگر کمیونسٹ قائدین کو انڈمان اور نکوبار کی قید سے رہائی کے بعد منعقدہ استقبالیہ جلسہ میں مخاطب کرتے ہوئے ان سے ملاقات کی اور ان کی تقاریر سنیں اور متاثر ہوئے۔

مجیب الرحمٰن نے مارکس کے علاوہ ماہر جمالیات چرنشیفکی کی تحریروں کو بھی پڑھا اس کے

نظریات سے متاثر ہوئے۔ صوفیانہ مسلک سے مجیب الرحمٰن کے والہانہ لگاؤ، رواداری، بے تعصبی اور انسان دوستی کا اعتراف کرتے ہوئے گلبرگہ کے ممتاز ادیب جناب وہاب عندلیب نے انہی خصوصیات کا اعتراف کرتے ہوئے ''قامت و قیمت'' کے عنوان سے لکھے گئے خاکوں کے مجموعے میں لکھا ہے کہ

> ''بعض حلقوں میں مجیب الرحمٰن کے الحاد کا بڑا چرچا ہے مگر اہل نظر کے مطابق ان کا دماغ کافر اور دل مومن ہے، اقبال کی طرح وہ بھی اس خیال کے حامی ہیں کہ وہ دل ونگہ جو مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں، صوفیانہ مسلک کے بڑے مداح ہیں۔ گوتم، نانک، کبیر، سرمد، خسرو سے انہیں بڑی عقیدت ہے مارکسزم کے حامی ہونے کے باوجود قادر مطلق کو بھی مانتے ہیں، اپنی رواداری، بے تعصبی، وسیع المشربی، وضعداری اور انسان دوستی کے باعث ہر مکتب خیال کے احباب میں ممتاز ہیں۔ انکے ہاں دیر و حرم اور شیخ و برہمن کی کوئی تفریق نہیں وہ سب کچھ ہو سکتے ہیں مگر مقلد نہیں''۔

مجیب الرحمٰن کام عبادت کی طرح بڑی لگن اور انہماک سے کرتے ہیں اور باقاعدگی کو جزو ایمان اور ایک خوشحال معاشرہ کے لئے بدعنوانی، تغلب و تصرف، رشوت خوری کے خاتمہ کو لازمی مانتے ہیں۔ ایسی تمام مشنریز، تحریکات اور افراد سے سخت اختلاف کرتے ہیں جو سماج میں جبراً مذہب اور نظریات کی تبدیلی کے لئے سرگرم ہیں۔

مجیب الرحمٰن کا ایک اہم کارنامہ ہے کہ انھوں نے جمالیات کو ایک جبلت کی طرح مانا ہے۔ جبکہ ماہرین نفسیات چودہ جبلتوں کے قائل ہیں۔ جنسی تشفی اور جمالیاتی عدم تشفی کو دو مختلف وصف قرار دیتے ہوئے تجزیاتی حوالوں سے ثابت کرتے ہوئے غیر شعوری محبت اور لاشعوری عقیدت کو مسترد کرتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ جسمانی وضع قطع کے طور پر ''جیسا آدمی ہوگا ویسے ہی آدمی کو پسند کریگا''۔ یہ ان کے جمالیاتی مقالہ کا بنیادی خیال ہے۔

مجیب الرحمٰن کا عقیدہ ہے کہ مطلق حقیقت اپنے آپ کو وجودی شکلوں میں ظاہر کرتی ہے اور ہر وجودی پیکر کی تخلیقی بناوٹ اس کے نمو کو اپنا دستور عطا کرتی ہے۔ ایسے ہی نظریات کو بنیاد بنا کر انہوں نے جو تنقیدی اصول پیش کئے ہیں ان میں یہ کلیہ بھی شریک ہے کہ ''اگر ہم فطرت کے ہر پہلو کا گہرائی سے مطالعہ کریں تو اس کے تخلیقی نظام میں ایسی باقاعدگی کا پتہ چلتا ہے کہ کُل نظام کے تحت ہر انفرادی فطری پہلو کا بھی ایک الگ ضابطہ ہوتا ہے جو پورے نظام سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ اس لیے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہر صحت مند وجود ہمہ وجودیت اور ہم آہنگی کے اصول پر عمل پیرا ہے۔ اس نقطۂ نظر کے مطابق قدرت کے سارے نظام کے مطالعہ سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ وجود کی جتنی شکلیں ہیں وہ سب اپنے ماخذ سے اپنی شناخت کو قائم رکھنے میں ہی اپنی بقا مانتی ہیں۔ یہاں تک کہ ان میں ضم ہو جانے کو اپنے وجود کی آخری منزل سمجھتی ہیں۔ گویا خود آگہی خدا آگہی بن جاتی ہے۔

اس پس منظر میں جمالیاتی وجود اپنے جوہر کی لطیف ترین ترنگوں سے خود کو جوڑتا ہے اور نباتاتی وجود اپنے بیج سے جڑتا ہے۔ جبکہ انسانی وجود اپنے ماں باپ سے اپنی شناخت پا کر اور بہت آگے تک جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ماخذ کائنات کی شناخت اور اس سے وابستگی کو اپنی آخری منزل سمجھتا ہے۔

جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو سب سے پہلے اپنی ماں سے وابستہ ہوتا ہے۔ اور ذرا آگے چل کر اپنے باپ سے اپنی شناخت کو سارے سماج سے وابستہ ہونے کا وسیلہ سمجھتا ہے۔ مگر اس کا یہ سفر متضاد احساسات کے ارتقائی عمل سے پُر ہوتا ہے۔

آدمی کی بنیادی نفسیات یہ ہے کہ آدمی چھ سال کی عمر تک ماں کو ہی اپنا ماخذ مانتا ہے ماں کے دودھ سے زندگی ہی نہیں بلکہ روحانی مسرت، سکون، راحت اور ایک آئیڈیل انسان بننے کا پیغام پاتا ہے۔ اس لیے بچہ ماں کی چھاتی سے چپکا رہنا پسند کرتا ہے۔ اسی دوران اگر ماں حاملہ ہوگئی ہو تو وہ بچہ کا دودھ چھڑانا چاہتی ہے۔ جس سے بچہ کو دکھ ہوتا ہے کہ اس کی ماں نے ایسا کیوں

کیا۔اب بچہ کے سامنے دو متضاد احساسات ہوتے ہیں ایک یہ کہ ماں کو خوش رکھنے کے لیے دودھ چھوڑ دے۔ دوسرا یہ کہ ماں سے دور ہونا نہ چاہے۔ان دو متضاد جذبوں میں برابر کی ٹکر سے چھٹکارا پانے کے لیے بچہ ان دو متضاد جذبوں سے ایک مشترک اصول کو چن لیتا ہے اور اُسے ہی وہ راحت کا وسیلہ سمجھتا ہے اسی بات کو نرگیسیت کہتے ہیں۔یعنی بچہ ماں کے عطا کردہ خود کے جسم کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے اور اپنے خود کو ہی محبوب سمجھ کر خود کو چاہنے لگتا ہے۔اسی طرح وہ ماں باپ کی محبت کو نادانی میں یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ رات کو غالبًا اس کا باپ اس کی ماں کو ستا رہا تھا۔اس احساس کے ساتھ اسے باپ سے ناراضگی پیدا ہوتی ہے۔اور ساتھ ہی یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ شاید یہ لوگ جھگڑ نہیں رہے تھے بلکہ ایک دوسرے کی صحبت سے لطف اندوز تھے۔ یہ دو جذبے جب برابر ہوں تو بچہ اس کشمکش سے نجات پانے کے لیے یا تو ماں کا انتہا پسند نمائندہ بن جاتا ہے یا باپ کا۔ ماں کی محبت کا مارا خود کو ماں کے جیسا بنا لیتا ہے یعنی زنانی چال ڈھال زنانہ انداز اور ایذت کوشی ،جب وہ باپ کا بگڑا ہوا نمائندہ بنتا ہے تو وہ سخت گیر اور ایذاءرساں ،محنت کش اور دلیری کا غیر معمولی نمائندہ بن جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ قدرتی ہم آہنگی کے تحت اپنے دو مخالف جذبوں کی کشمکش سے نجات پاتا ہے تو وہ ایک ہم آہنگ، معتدل مزاج آدمی بن جاتا ہے۔

آدمی جس طرح چھ سال سے کم عمر میں اپنے ماں اور باپ کی محبت کا غلط تصور لے کر یا تو نفسیاتی طور پر بیمار پڑ جاتا ہے یا اپنے دوسرے مماثل تجربوں سے ہم آہنگی سیکھ لیتا ہے اس طرح سماج کے الگ الگ طبقوں کے الگ الگ مفادات اور ان کی کشمکش سے مضمحل ہو کر یا تو خود ان کا حل نکالنا چاہتا ہے یا پھر یہ سوچتا ہے کہ ان سارے وجودوں کے ماخذ تک پہنچا جائے۔ جیسے ہر برگد کا پیڑ اپنی نسل کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے بیج سے ہی بقا پاتا ہے۔اسی طرح آدمی کو زندگی کی ساری کشمکش سے ہارنے کے بعد ایک ایسا احساس پیدا ہوتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ دو اور خود کو قدرت کے حوالہ کر دو۔ یہی تجربہ گوتم بدھ کا تھا اور وہ ایسا کر کے ہی روشن ضمیر بن گئے۔

مجیب الرحمٰن مانتے ہیں کہ نفسیاتی تجزیہ سے روحانی تجربہ زیادہ موثر ہوتا ہے۔اس سلسلے

میں وہ کہتے ہیں کہ جب آدمی شعوری طور پر مکمل خاموشی اختیار کرتا ہے تو تحت شعور سے عجیب و غریب ماضی کی باتیں یاد آتیں ہیں۔اور اگر وہ ان بات کوشعور میں محفوظ رکھیں تو وہ غائب ہو جاتی ہیں۔اس کی جگہ ایک دوسری یاد آتی ہے۔وہ بھی شعور کی روشنی میں غائب ہو جاتی ہے۔گویا اس طرح سارا باطل جس کا کوئی وجود نہیں ہے ان باتوں کو دیگر ے فنا ہو جاتا ہے اور آخر میں پرسکون خاموشی کے ساتھ ایک خود آگہی کی حکمرانی شروع ہو جاتی ہے اور ہر باطل خیال ایک ایک باطل نفسیاتی حادثے کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے،روحانی ذکر کا عمل بھی ایک اعتبار سے اعلیٰ ترین نفسیاتی تجزیہ ہے جبکہ نفسیاتی تجزیہ میں یہ مشکل پیش آتی ہے کہ ہمیں بیماری سے چھٹکارا پانے کے لیے اس کے سبب والے حادثے کو یاد کرنا پڑتا ہے جبکہ روحانی تجزیہ میں اضافی کی بجائے بیماری کا اولین سبب چونکہ خدا ہے اس لیے یہاں کسی اور خصوصی سبب کو ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔اور اس طرح بیماری کو سبب اعلیٰ سے جوڑنے کے نتیجہ کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

مجیب الرحمٰن کہتے ہیں کہ اس عمل کو تیز کرنے کے لیے ویدانت اور تصوف نے ذہن کو خالی کرنے اور ''ذکر'' کے ذریعہ کو اپنانے کی تلقین کی ہے کہ جس کے ذریعہ ذہن کو خالی کیا جاسکتا ہے اور اچانک اس سبب اعلیٰ تک بھی پہنچا جاسکتا ہے جو ہمارے غم کا سبب بھی ہے یعنی شاہد اور مشہود جب ایک ہو جاتے ہیں تو مشاہدہ،شاہد وسبب ختم ہو جاتے ہیں صرف مشہود رہ جاتا ہے اور خلاء آجاتا ہے۔

نفسیاتی حادثوں کے سلسلہ میں مجیب الرحمٰن کہتے ہیں کہ غالبًا علامہ اقبال بھی Hallucination کے شکار رہے ہیں۔یعنی وہ اپنے تصورات میں کشمیری پنڈتوں کی تہذیب لیے ہوئے ہوں گے اس لیے وہ خودی کی بات کرتے ہیں اور چونکہ عملاً وہ اسلام سے جڑے ہوئے ہیں اس لیے فطری طور پر وہ اسلام سے خودی کے نظریہ کے ساتھ خود کو جوڑتے ہیں حالانکہ خودی کے تصور کا قرآن شریف میں کہیں بھی حوالہ نہیں ہے قرآن میں فطرت کے مشاہدہ پر زور دیا گیا ہے۔ Hallucination کی بیماری میں ایک باطل شئے کا نظارہ ہوتا ہے۔مجیب الرحمٰن جوش ملیح آبادی

اور ان کی تصنیف ''یادوں کی برات'' کے حوالے سے کہتے ہیں کہ جوش ملیح آبادی بڑے پھکڑ قسم کے صاف گو آدمی تھے مگر وہ بوڑھے ہو کر بھی عورتوں کو دیکھ کر مشاعرے میں ''ہائے جوانی ہائے جوانی'' کے اشعار سناتے تھے اور ایسا کرتے ہوئے وہ یوں محسوس کرتے تھے کہ وہ جوان ہیں حسین ہیں اور ساری عورتیں ان پر فدا ہیں اور وہ سب کے محبوب ہیں۔ جوش ملیح آبادی کے اس طرز عمل سے مجیب الرحمٰن یہ نتیجہ اغذ کرتے ہیں کہ جوش ملیح آبادی جان بوجھ کر جھوٹ نہیں کہہ رہے تھے بلکہ اپنے ماضی کے نرگسی احساسات کی نمائندگی کر رہے تھے۔ مجیب الرحمٰن کو شکایت ہے کہ جوش ملیح آبادی کی کتاب ''یادوں کی برات'' کا یہی پہلو ابھی تک صحیح تنقید سے محروم ہے وہ انتہائی حیرت سے کہتے ہیں کہ ہماری تنقید ''یادوں کی برات کے ان حصوں پر آ کر سکتے میں کیوں آتی ہے؟ اسی سلسلہ میں وہ وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ غالباً ہمارے تنقید نگار اس سائنسی فہم سے ناواقف ہیں اس طرح جب تک وسیع تر علم و آگہی اور تحقیقی مطالعہ نہ ہو کسی فن پارے اور شخصیت سے متعلق تنقید مکمل نہیں ہو سکتی۔

مجیب الرحمٰن اپنے ایک اور مقالے میں دور حاضر کے ناپ تول کے میدان میں اکائی کے عروض کو زیادہ موزوں سمجھتے ہیں۔ دور حاضر میں جس طرح عشری نظام ناپ تول ہے اسی طرح آزاد نظم کے چھوٹے بڑے مصرعے کے لیے اکائی کے اصول کو بہتر مانتے ہیں۔ وہ آزاد نظموں کی تخلیق کے لیے ان کے دریافت شدہ ''اکائی کے عروض'' کو ہی آہنگ کا صحیح پیمانہ مانتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ہندوستان کی ساری زبانوں والے انگریزی سے کافی واقفیت رکھنے کے باوجود انگریزی عروض کو نہ سمجھیں تو ظاہر ہے کہ ان کی آزاد نظمیں نئے اکائی کے عروض سے ناواقفیت کی وجہ سے لنگڑاتی ہیں حالانکہ روایتی عروض بھی بہت باکمال ہے مگر مشکل یہ ہے کہ اس میں ایک مخصوص بحر میں ہی لکھنا پڑتا ہے۔ اور جب آزاد نظم کہنی ہو تو روایتی عروض اپنی ساری آن بان کے باوجود ناکام ہو جاتا ہے۔ اکائی کے عروض کی اہمیت و افادیت سے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے مجیب الرحمٰن کہتے ہیں کہ سارے یوروپ میں الگ الگ زبانوں کے باوجود اکائی کا عروض ہی ان

کی شاعری کی بنیاد ہے اور آج ساری دنیا میں ناپ تول کے پیانے جس طرح عشری نظام کے زیر اثر ہیں اسی طرح شعری ترنم کے لیے بھی اقل ترین اکائی یعنی دو چار چھ حروف کے مجموعہ والے مماثل رکن کو ہی ہمارے روایتی عروض کے مصرع کی جگہ مانا جاتا ہے۔ اس طریقہ کار میں شعر کی ہر سطر کی آخری اکائی ادھوری ہوسکتی ہے مگر ہر سطر کی پہلی اکائی ساری نظم میں ایک ہی وزن کی ہونگی جبکہ درمیان کی اکائیاں ہموزن امتزاج کی ہوسکتی ہیں۔ مجیب الرحمٰن کہتے ہیں کہ اکائی کا عروض ان کا اپنا نہیں ہے وہ یوروپ کی دین ہے۔ مگر اس کے انبتاقی سانچے ان کے اپنے تیار کردہ ہیں اور یہ ان کا طبع زاد کام ہے وہ کہتے ہیں کہ اسی اصول کے مطابق وہ آزاد نظموں پر تبصرہ کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقید انفرادی اور نادر لگتی ہے۔

مجیب الرحمٰن طب میں اس فطری اصول کو مانتے ہیں جسے ہومیوپتھی کے موجد ڈاکٹر سیمول ہانی مان (Dr, Samnel Hahnemenn) نے 18ویں صدی میں دریافت کیا تھا۔ ''جو مادہ استعمال کرنے کے بعد جانداروں بالخصوص انسانوں میں بیماری لاتا ہے وہی اس قسم کے علامتوں کی بیماری کو جو فطری انداز میں ظاہر ہوتی ہیں دور کرسکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کوئی تنقیدی اصول جامد اور مطلق نہیں ہے۔ جس نظام کے جو اصول ہیں وہی اس نظام کی پرکھ میں معاون ہونگے۔ وہ تنقید میں انفرادی اصول سے انحراف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''تنقید میں انفرادی اصول کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا'' اس طرح وہ فطری اصول کے مطابق الگ الگ مواد پر فطرت کے اصول کے مطابق تنقید کرنا پسند کرتے ہیں۔ مجیب الرحمٰن کی تنقید ان کے تجربوں کی بنیاد پر ہی ہوتی ہے۔ جیسے جمالیات میں آپ کو یہ بات معلوم ہوئی کہ سارے انسان بنیادی طور پر دو قسموں میں بٹے ہوئے ہیں ایک قسم کا آدمی کم گو کم آمیز کم متحرک ہوتا ہے جو چھریرے بدن کا ہے جو ایسے ہی پیشے میں کامیاب ہوسکتا ہے جہاں اس کو غور وفکر اور منصوبہ بندی کا کام دیا جائے جسے وہ تنہائی میں پورا کرے۔ اگر یہ آدمی ذہنی طور پر بیمار ہوجائے تو اسے زماں ومکاں کا احساس نہیں ہوتا دوسری قسم کا آدمی جو گول مٹول سا ہوگا جس کے گال بھرے بھرے ہوں گے اور چھاتیاں گولائیاں

لی ہوئی ہوں گی، پیٹ باہر کو نکلا ہوا ہوگا۔ چہرہ ہنس مکھ ہوگا جو جلد غصے میں آتا اور جلد ٹھنڈا بھی ہو جائے وہ اچھا ڈپٹی کمشنر ہوسکتا ہے۔ آرگنائزر، سماجی آدمی ہوگا اور ایسا آدمی ذہنی طور پر بیمار پڑ جائے تو وہ حقیقت پسند ہوگا۔ مجیب الرحمٰن کے تنقیدی جائزہ میں یہ اصول کارفرما ہے کہ فطرت کے ایک مخصوص نظام کی مطابقت کا جائزہ لے کر ہی اس کی قدر طے کرنا چاہیئے اور اس کو جمالی پہلو سے جانچنے پر زور دے کر کہتے ہیں کہ حسن کوئی مطلق شئے نہیں ہے وہ اپنے اپنے نظام کے مطابقت کا نام ہے وہ نظر اور نگاہ کے تعلق کا نام ہے وہ کہتے ہیں کہ میں اپنے گھر کے برقی کھمبے کو دیکھتا ہوں تو وہ اونچا لگتا ہے اور گلی کے کونے کا کھمبہ چھوٹا دکھائی دیتا ہے۔

نزدیک کی چیز کا بڑا اور دور کی چیز کا چھوٹا نظر آنا فطری بات ہے۔ مجیب الرحمٰن کہتے ہیں کہ اگر کوئی دور کے کھمبے کو نزدیک کے کھمبے کے برابر دیکھنا چاہے تو یہ بات غیر فطری ہوگی۔ وہ ''غبار خاطر'' کے حوالے سے کہتے ہیں کہ مولانا آزاد نے غبار خاطر میں خود کو جامعہ اظہر کا فارغ التحصیل جان بوجھ کر جھوٹ نہیں کہا بلکہ انھوں نے اپنی شخصیت سے جامعہ اظہر کے معیار کو پیش کیا ہے۔ اس سلسلہ میں جواز پیش کرتے ہوئے انھوں نے مولانا کے بچپن کا وہ مشہور واقعہ پیش کیا ہے جب وہ تیرہ برس کے تھے تو ایک مذہبی مباحثہ میں حصہ لیا تھا اس وقت لوگ ان کے خطاب کو سنتے ہوئے محسوس کر رہے تھے کہ ایک بزرگ علامہ اظہار خیال کر رہا ہے واضح رہے کہ مولانا آزاد کی شخصیت کو جب ہم دیکھتے ہیں تو وہ قرآن کے اس اصول کے سختی سے پابند نظر آتے ہیں کہ ''حق پر رہو اور حق کی بات کہو۔

Halluacination ایک نفسیاتی بیماری ہے کہ اس میں آدمی یہ محسوس کرتا ہے کہ آپ کے خلاف کوئی پاس میں ہی باتیں کر رہا ہے اسی طرح وہ کئی غیر حقیقی چیزوں کو محسوس بھی کرتا ہے گویا وہ حقیقی ہیں حالانکہ وہ احساسات حقیقی نہیں بلکہ خیالی ہوتے ہیں۔

مجیب الرحمٰن نے Hallucination کے شکار ممتاز شخصیتوں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ عظیم مفکر شاعر ڈاکٹر علامہ اقبال کہتے ہیں کہ ان کے والد تصوف اور سماجی بھائی چارہ کے

بڑے عالم اور نمائندہ تھے حالانکہ تاریخ یہ کہتی ہے کہ وہ ناخواندہ تھے اور خیاطی کرتے تھے اپنے والد کو صوفی سمجھنا اور ویدانت کے خودی کے تصور کو اسلام سے جوڑنا وغیرہ بھی Hallucination کا کرشمہ ہے۔

18ویں صدی کا مشہور فرانسیسی شاعر بودلیر (Baudelaire) کہتا ہے کہ فطرت میں کراہتیں ہی کراہتیں ہیں۔ تاہم مجیب الرحمٰن کہتے ہیں کہ فطرت میں یہ کراہتیں اس لئے نہیں ہیں کہ اس میں رحمت کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں زحمت کا اصول بھی کارفرما ہے بلکہ فطرت جہاں باقاعدگی، حسن ہم آہنگی کا نمونہ ہے وہیں وہ اس میں بگاڑ لاکر اپنے کچھ رازوں کی طرف اشارہ کررہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ خالق عالم کے حکم کے بغیر اگر ایک پتا بھی حرکت نہیں کرسکتا تو یہ بیماریاں، آفتیں، مصیبتیں اور کراہتیں کیا اسکی ہی لائی ہوئی نہیں ہیں۔ مگر ہمارے اخلاقی نظام نے ایسا رویہ اختیار کیا ہے کہ فطرت کو پھولوں، خوشبوؤں اور حُسن سے ہی جوڑا جائے کانٹوں، کراہتوں سے نہیں۔ مجیب الرحمٰن کی ایک نظم ''اذیت'' یہی اشارہ کرتی ہے کہ فطرت میں بنیادی طور پر اذیت کا اصول بھی پنہاں ہے۔ سائنس کا ایک اصول ہے کہ اگر کسی نتیجہ یا خرابی کو بدلنا ہو تو اس کے سبب تک جانا چاہیئے اور جیسے ہی سبب معلوم ہو جائے تو بیماری یا کوئی خرابی بغیر دوا کے دفع ہو جاتی ہے۔ اگر یہ اصول سائنس کا ہے تو یہی اصول فلسفہ کا بھی ہونا چاہیے اگر ہمارا ایمان جسمانی بیماریوں اور کراہتوں کو مالک یا سبب سے جوڑ دے تو ان سے چھٹکارہ پایا جاسکتا ہے۔ مجیب الرحمٰن کہتے ہیں کہ مظاہر قدرت کو کراہت سے جوڑنا کفر لگتا ہے مگر یہ ایمان کو اس کی مکمل صورت گری میں دکھاتا ہے اور ایمان بالغیب کو ایمان کی بالحاضر تک پہنچاتا ہے ایمان ایک ارتقاء پذیر شئے ہے۔

اگر بندہ اپنے رب سے رجوع ہو کر یہ کہتا ہے کہ پروردگار آپ نے مجھ پر یہ مصیبتیں اگر میرے ساتھ ظلم کیا ہے تو فوری اس کو یہ جواب بھی مل جاتا ہے کہ یہ سارا ظلم تمہارا اپنالایا ہوا ہے۔ تم پر جب مصیبت آئی تو تمہیں یہ خیال تک نہیں آیا کہ یہ ہمارے نظام سے ہی تمہیں ملی ہے۔ تم نے ہم سے رجوع ہوئے بنا خود ہی ان کا حل ڈھونڈا۔ جس چیز کو تم نے پیدا نہیں کیا اسے تم دور کس

طرح کر سکتے ہو، مگر تم نے یہ فرض کرلیا کہ تمہاری انا اسے ہماری مدد کے بغیر دور کردے گی تو یہ غلط خیالی ہوئی نا۔ پھر ہم ظالم کہاں ہیں۔ گویا کفر بھی ایمان تک پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مگر شرک ایمان تک مشکل سے پہنچتا ہے۔ کیوں کہ وہ ایمان سے ہی برگشتہ ہو کر پلٹا ہے۔ مجیب الرحمٰن کی تنقید کا سفر سائنسی فکر سے شروع ہو کر عرفانی طرز اختیار کر کے فلسفیانہ رنگ اپنالیتا ہے۔ اس لیے یہ سب بہت طبعی اور ندرت رکھنے والا ہے۔

ٹی، ایس ایلیٹ (T.S. Eliut) بیسویں صدی کے رہنما دانشور کہلاتے ہیں۔ انھوں نے فن کاروں سے کہا کہ جس طرح خدا ساری کائنات کی تخلیق کر کے بھی خود کو اپنی تخلیق میں چھپائے دکھتا ہے اسی طرح فن کار کو بھی اپنے فن پاروں میں سماجی جانبداری نہیں دکھانی چاہیئے۔ (Impersonality of Writers) جب ایلیٹ ایک اور کیمسٹری کی مثال دیتے ہیں کہ بعض کیمائی عمل میں بعض دھاتیں شریک کی جاتی ہیں اور جب یہ عمل پورا ہوتا ہے اور ایک نئی کیمیائی حقیقت سامنے آتی ہے تو درمیان میں رکھی معاون دھات بغیر متاثر ہوئے الگ تھلگ رہ جاتی ہے۔ حالانکہ اس کے بغیر کیمیائی عمل پورا نہیں ہوتا۔ ایلیٹ نے کہا کہ فن کار کو ایک Catalyst یعنی معاون کی طرح سماجی جانبداری سے بچنا چاہیئے۔ مجیب الرحمٰن کہتے ہیں کہ خدا غیر جانبدار ہوتے ہوئے بھی جانبدار ہی ہوتا ہے۔ وہ نیکی کو پسند کرتا ہے۔ اور بدی کو سزا دیتا ہے۔ وہ فطرت کی آفات کے ذریعہ اپنی ناراضگی اور بہاروں کے ذریعہ اپنی خوشنودی دکھاتا ہے۔ اس طرح ایک فن کار کے لیے کیمیاء کے (Catalyst) معاون کی مثال بے جوڑ لگتی ہے کیمیاء میں چونکہ دو یا تین کیمیائی اجزاء یعنی گیس مادی ہوتی ہیں اور درمیان میں ایک دھات والا معاون ہوتا ہے اس لیے وہاں انسان کی انا کی سی جانبداری نہیں ہوتی۔ چونکہ کسی فن پارہ کی تخلیق میں انا کا رول سب سے زیادہ ہوتا ہے اس لیے انا فن پارے میں کسی نہ کسی طرح اپنی جانبداری دکھاتی ہی ہے۔ ٹی، ایس ایلیٹ کے فن کار کے سماجی طور پر غیر جانبدار رہنے کے نظرئے کو آج تک کسی نے پختہ دلیل کے ذریعہ نہیں کاٹا۔ یہ کام صرف مجیب الرحمٰن نے کیا ہے اس لیے وہ ایک طبع زاد تنقید نگار ہیں۔ ◻◻

حیدرآباد ۔کرناٹک میں اردو لوک گیت

ڈاکٹر حامد اشرف
صدر شعبہ اردو، مہاراشٹرا اودے گری کالج ،ادگیر

ہندوستان میں لوک گیتوں اور کہانیوں کی روایت بہت قدیم ہے۔انگریزی میں لوک گیت کو فوک سونگس اور اردو میں عوامی گیت کا نام دیا گیا ہے۔معروف نقاد کلیم الدین احمد نے فوک سونگس کی تعریف کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ

''عوامی گیت' روایتی گیت اور آہنگ جو عام لوگوں میں مروّج ہوتے ہیں اور ان کے مصنفین کا نام عموماً نہیں ملتا۔''

(فرہنگ ادبی اصطلاحات' ص ۸۹)

مشہور ادیب امیر علی بھی اپنی کتاب "Folk Love Of Buxur" میں رقمطراز ہیں کہ

Folk love of a community provides .The invisible universal stuff air, and the other, folk love makes the individual life fuller and richer.The folk love is the essence of community's wisdom told in simple term.

اردو کے فوک گیت جیتی جاگتی' بولتی بجتی' گاہ ہنستی گاہ مسکراتی' گاہ منہ بسورتی زندگی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ان گیتوں میں گڑھے مردوں کے بجائے زندہ انسانوں یعنی بانکے الھڑ جوان مرد و زن کو موضوع بنایا جاتا ہے۔یہ وہی گیت ہیں جسے بچہ ماں کی گود میں ہی سنتا اور بولتا ہے' بلکہ یہی گیت ماں کے دودھ کے ذریعے خون میں بھی دوڑ جاتے ہیں۔انہی گیتوں' کی وجہ سے ہندوستان کو لوک گیتوں کا خالق (جنم داتا) بھی کہتے ہیں۔اردو لوک گیتوں کا خمیر یہیں گوندھا گیا اور یہیں اُسے بال و پر بھی ملے۔ان گیتوں میں کہیں درد و الم کا اظہار ہوتا ہے تو کہیں طنز و مزاح کی

پھلجھڑی چھوٹتی نظر آتی ہے۔

مبارک قدم سے تو آئی میری سمدھن — سلامت قدم سے تو آئی میری سمدھن
سمدھن کے واسطے میں چانول منگائی — سمدھن کے واسطے میں پلاؤ پکائی
باورچن کے ٹھیکے سے آئی میری سمدھن — مبارک قدم سے تو آئی میری سمدھن
سلامت قدم سے تو آئی میری سمدھن — سمدھن کے واسطے میں گھڑے منگائی
سمدھن کے واسطے میں نے پانی بھرائی — بھشتن کے ٹھیکے سے آئی میری سمدھن
مبارک قدم سے تو آئی میری سمدھن — سلامت قدم سے تو آئی میری سمدھن
سمدھن کے واسطے میں پاناں منگائی — سمدھن کے واسطے میں بیڑے منگائی
تمبوان کے ٹھیکے سے آئی میری سمدھن — مبارک قدم سے تو آئی میری سمدھن

سلامت قدم سے تو آئی میری سمدھن

لوک گیتوں کی جڑیں ہماری معاشرتی زندگی میں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔انسانی احساسات و تخیلات لوک ادب اور لوک گیتوں کے سانچے میں صدیوں سے ڈھلتے آئے ہیں۔لوک گیتوں نے ہمارے جمالیاتی' ذہنی' جذباتی اور سماجی تقاضوں کی ہر دور میں ترجمانی کی ہے۔اس ادب میں ماحول کی مختلف کیفیتوں کا اظہار کرنے کی غیر معمولی صلاحیت موجود ہے۔وقت کی کروٹوں نے لوک ادب کو نئی معنویت عطا کی ہے' جن کے سبب وہ انسانی زندگی اور معاشرے کا مکمل ترجمان بن گیا ہے۔کچھ عرصہ پہلے تک اہل اردو اور ناقدان فن لوک ادب کو جاہل اوران پڑھ لوگوں کی بڑ اور اوٹ پٹانگ خیالات سے تعبیر کرتے تھے۔جب ہندوستان کی دوسری زبانیں لوک ادب سے ادبی اور معاشرتی ورثے کو مالا مال کرنے لگیں تو اردو کے قدیم کلاسیکی ادب سے چند تحریریں منظر عام پر آئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اردو ادب میں فوک گیتوں کا انبار لگ گیا۔آج بھی شادی بیاہ کی تقریب ہو یا رسم کا موقع' لڑکی پھول پہنے یا بچوں کا عقیقہ مسنون' عورتیں جمع ہوئیں۔نوجوان الھڑ لڑکیوں نے ڈھولک کو کھونٹی سے اتارا۔حنائی ہاتھوں کی تھاپ جب ڈھولک پر پڑی تو سب

کے گلے یکے بعد دیگر کھل گئے اور درجِ ذیل لوک گیت فضا میں ابھرتا ہے۔

دیلان میں پینائے ہار کیا خوشنما لگا کے

مالی نے لایا ڈونا مالن نے لائی ہار　　　اماں نے پینائے ہار کیا خوشنما لگا کے

دیلان میں پینائے ہار کیا خوشنما لگا کے

مالی نے لایا ڈونا مالن نے لائی ہار　　　باوا نے پینائے ہار کیا خوشنما لگا کے

دیلان میں پینائے ہار کیا خوشنما لگا کے

مالی نے لایا ڈونا مالن نے لائی ہار　　　بھینوں نے پینائے ہار کیا خوشنما لگا کے

دیلان میں پینائے ہار کیا خوشنما لگا کے

مالی نے لایا ڈونا مالن نے لائی ہار　　　بھایوں نے پینائے ہار کیا خوشنما لگا کے

دیلان میں پینائے ہار کیا خوشنما لگا کے

اردو زبان کا تعلق چونکہ درباروں سے وابستہ اشرافیہ طبقے سے بھی رہا ہے۔اس لیے کچھ نام نہاد نقاد یہ کہتے ہیں کہ اردو کا کوئی لوک ادب نہیں ہے۔اس سلسلے میں یہ اقتباس پیش ہے۔

''ان کے اس دعویٰ کو مان لیا جائے تو یہ کہنا پڑے گا کہ اردو والوں نے اپنی ماؤں کی لوریاں نہیں سُنیں،ان کی ولادت پر گیت نہیں گائے گئے۔سردیوں کی ٹھٹھرتی راتوں میں ان کی دادیوں اور نانیوں نے کہانیاں نہیں سنائیں۔ان کی گھریلو تقریبات پر ڈھولک کی تھاپ پر کنواریوں اور بیاہیوں نے گیت نہیں الاپے۔ڈومنیوں نے ان کی شادی بیاہ پر شادیانے نہیں گائے۔البیلے موسموں سے کبھی ان کے دلوں میں ترنگ نہیں پیدا ہوئی۔انہوں نے کبھی ساون میں جھولا نہیں جھولا۔''

(پیش لفظ۔اردو میں لوک ادب۔مرتب،پروفیسر قمر رئیس۔ص ۵۔ایڈیشن ۲۰۰۳ء)

ظاہر ہے کہ صدیوں سے اردو سماج میں یہ سب ہوتا آیا ہے۔شہروں اور دیہاتوں میں

بھی۔جھونپڑوں اور درباروں میں بھی۔دکنی عوامی ادب اور لوک گیتوں کی تاریخ بھی اسی مرحلے کا ایک حصّہ ہے۔ہندوستان کے دیگر علاقوں اور زبانوں کی طرح دکن اور دکنی زبان کا دامن بھی عوامی ادب کے ہیرے موتیوں سے بھرا پڑا ہے۔لیکن' تا حال اس موضوع پر جانفشانی سے ایسی تحقیق نہیں ہوئی۔جس کا لوک ادب متقاضی ہے۔ذیل کے لوک گیت میں ایک ماں کے جذبات اپنے لال (بیٹے) سے متعلق ملاحظہ کیجیے:

اللہ نے دیا مجھے لال رے	قدرت الٰہی کی شان رے
فجر کی نماز میں اللہ سے دعا مانگی میں	گود میں کھیلا میرا لال رے
اللہ نے دیا مجھے لال رے	قدرت الٰہی کی شان رے
ظہر کی نماز میں اللہ سے دعا مانگی میں	گلیوں میں کھیلا میرا لال رے
اللہ نے دیا مجھے لال رے	قدرت الٰہی کی شان رے
عصر کی نماز میں دعا مانگی اللہ سے	اسکول کو گیا میرا لال رے
اللہ نے دیا مجھے لال رے	قدرت الٰہی کی شان رے
مغرب کی نماز میں دعا مانگی اللہ سے	اللہ نے دیا مجھے لال رے
قدرت الٰہی کی شان رے	عشاء کی نماز میں دعا مانگی اللہ سے

دلہن بھی لایا میرا لال رے۔۔۔!!!

شادی بیاہ کے موقع پر دلہا دلہن کے اطراف رشتہ دار اور افرادِ خانہ جمع ہوتے ہیں اور دُلہے سے دُلہن کا اور دلہن سے دلہے کا نام پوچھا جاتا ہے۔لیکن شرط یہ ہوتی ہے کہ وہ دونوں مسئلے یا شعر میں ایک دوسرے کا نام لیں اور جب تک وہ ایک دوسرے کا نام کسی مسئلے یا شعر کی صورت میں نہیں لیتے ان کو ایسے ہی گھنٹوں بٹھایا جاتا ہے اور سبھی حاضرین اُن کی بے بسی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔بعض ہوشیار قسم کے نئے جوڑے (New Pairs) پہلے ہی سے اِن موقعوں کے لیے تیار رہتے ہیں اور فوراً ہی اپنی جان اس طرح چھڑا لیتے ہیں:

پھوٹ گگڑی پنگ کو پھوڑی　　　　فقرو میاں کی شال جھٹک کو اوڑھی

دال میں زیرہ میری سلمٰی ہیرا

بھائی اور بہن کی محبت دنیا کے تمام انسانوں کے لیے قدرت کا ایک حسین انعام ہے۔اس رشتے کے تقدس اور محبت کا مول پوری دنیا مل کر بھی نہیں لگا سکتی۔لوک گیتوں میں بھائی بہن کے جذبات واحساسات کا اظہار راکھی کے تہوار کے ضمن میں بطورِ خاص ملتا ہے۔

بھیا مورے راکھی کے بندھن کو نبھانا　　　　بھیا مورے چھوٹی بہن کو نہ بھول جانا

چُنے چُنے چاول کا کھانا پکائی　　　　کھائیو بھیا کھائیو میں لقمہ جمائی

بھیا مورے راکھی کے بندھن کو نبھانا　　　　بھیا مورے چھوٹی بہن کو نہ بھول جانا

پکّے پکّے پانوں کی بیڑیاں بنائی　　　　کھائیو بھیا کھائیو میں لونگ جمائی

بھیا مورے راکھی کے بندھن کو نبھانا　　　　بھیا مورے چھوٹی بہن کو نہ بھول جانا

کوری، کوری صراحی میں لیمن بھر لائی　　　　پی لو بھیا پی لو میں پیالے جمائی

بھیا مورے راکھی کے بندھن کو نبھانا　　　　بھیا مورے چھوٹی بہن کو نہ بھول جانا

کھلے کھلے پھولوں کے گجرے گوندھ لائی　　　　پہن لو بھیا پہن لو میں کڑیاں جمائی

بھیا مورے راکھی کے بندھن کو نبھانا　　　　بھیا مورے چھوٹی بہن کو نہ بھول جانا

علاقۂ حیدرآباد کرناٹک میں بہمنی سلطنت کے قیام کے بعد دکن میں پانچ نئی سلطنتیں وجود میں آئیں، جن میں گولکنڈہ اور بیجاپور کی عظیم سلطنتیں ادب نوازی اور فن پروری میں نمایاں اہمیت کی حامل تھیں۔ان سلطنتوں کے حکمرانوں کی علم دوستی نے بے شمار فنکاروں، ادیبوں اور شاعروں کو اظہارِ کمال کا موقع دیا اور یہیں سے دیگر اصناف سخن کے پہلو بہ پہلو لوک گیتوں کا باقاعدہ رواج شروع ہوا اور تبلیغ دین کی خاطر لوک گیتوں کا سہارا لیا گیا جو ایک کامیاب تجربہ ثابت ہوا، نتیجے میں فارسی زبان کا معیار دکنی غزل اور لوک گیتوں میں سما گیا، رفتہ رفتہ ہندوستانی عناصر لوک گیتوں میں جگہ پاتے گئے اور جذبہ و احساس کی زبان بن کر اپنے اپنے علاقے کی

پہچان بن گئے۔

سہیلی سیرت کواپنی سنوار، سہیلی سیرت کواپنی سنوار / کلمہ شہادت کا ہار تو

بُن لے / سینے کے اندر، اس کو پہن لے جسم وقبر تیرے روشن رہیں گے /

خوش ہوگا پروردگار۔۔۔۔ سہیلی سیرت کواپنی سنوار

حیدرآباد کرناٹک میں لوک گیتوں کا فروغ گلبرگہ، بیدر اور رائچور کو مشرق وسطیٰ کے دمشق، شیراز اور اصفہان جیسے علم وادب، فن وفکر اور اپنی اپنی تہذیب کے لیے مشہور شہروں کے ہم رتبہ ہونے کے طور پر متعارف کرواتا ہے۔ گلبرگہ اور بیدر کے ساتھ شریف لکھنے کی روایت اسی لیے ہے کہ یہ شہر نہ صرف صوفیائے باکمال اور علمائے بے نظیر کے مسکن تھے، بلکہ علوم وتصوف کے گہوارے بھی تھے۔ شہر گلبرگہ کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر ڈاکٹر راہی قریشی ایک جگہ رقمطراز ہیں کہ

> ''عظیم المرتبت سلطنتِ بہمنیہ کے دارالحکومت کی حیثیت سے شہر گلبرگہ کا انتخاب اس لیے مبارک ومسعود ہے کہ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودراز ؒ نے اس شہر کو شرف وافتخار بخشا۔ حضرت بندہ نواز نے یہیں وہ چراغ علم و معرفت فروزاں فرمایا، جس کی روشنی سے آج بھی علاقہ ہائے دور و نزدیک مستنیر ہیں۔''

(مضمون گلبرگہ کی ادبی سرگرمیاں ڈاکٹر راہی قریشی۔ مطبوعہ سووینیر۔ نذر کرناٹک ص۱۵ مرتبہ۔ اختر واجدی ۱۹۸۸ء)

مشہور محقق مبارزالدین رفعت نے حضرت خواجہ بندہ نواز ؒ کو بجا طور پر پہلا عوامی مصنف کہا ہے۔ آپ کے علاوہ حضرت برہان الدین جانم، حضرت امین الدین اعلیٰ، فاروقی، قاضی محمود بحری، خداوند ہادی، شاہ عبدالقادر، شاہ ظہیر، خواجہ رحمت اللہ، شاہ ابوالحسن قادری، کے چکی نامے، خوش نامے لگن نامے، سہاگن نامے، مولود نامے، چرخہ نامے، سہیلا، نوسر ہار، جھولنا، پالنا، بدھاوا وغیرہ ایسی اصناف ہیں جو لوک گیتوں کی تعریف پر پوری اترتی ہیں۔

احمد شاہ بہمنی نے بعض سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر ۸۳۲ ہجری میں گلبرگہ کے بجائے بیدر کواپنا پایہ تخت بنایا تو شہر ایران' عراق اور عرب کے کئی علاقوں کے علماء اور صوفیا کا مسکن بن گیا۔اس سلسلے میں پروفیسر ہارون خان شیروانی لکھتے ہیں:

''گلبرگہ شہر سے علم وادب کی شمع کو بیدر منتقل کر دیا گیا تھا' تاہم وہاں یہ شمع کچھ اور فروزاں ہوئی۔''

(دکن کے بہمنی سلاطین۔ہارون خاں شیروانی۔ص ۳۱۔ ۱۹۷۸ء)

سلطنتِ مغلیہ کے کمزور ہونے کے نتیجے میں بنگال' اودھ اور دکن میں وسیع اور عظیم سلطنتیں قائم ہوئیں۔دکن کی مشہور سلطنت جسے عرفِ عام میں مملکتِ آصفیہ کہا جاتا ہے' ۱۷۲۴ء میں نواب میر قمرالدین علی خاں نے قائم کی۔بعد کے دور میں دکن میں سلاطین آصفیہ نے اردو زبان وادب کی ترقی وتوسیع میں جو حصہ لیا وہ تاریخ ادب میں عدیم النظیر ہے۔کسی بھی علاقے یا شہر کی علمی وادبی ترقی کا اندازہ اس زمانے کے اکابرین اور ادباء وشعراء کے تخلیقی کارناموں سے ہوتا ہے۔علاقہ حیدرآباد۔کرناٹک کی ادبی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ یہاں تخلیقِ علم وادب کی کبھی کمی نہیں رہی۔حیدرآباد کرناٹک کے اضلاع گلبرگہ' رائچور اور بیدر کو عہدِ سلطنتِ خداداد اور عہدِ راجگان میں قدیم میسور کے اضلاع کی حیثیت حاصل تھی۔لیکن اب ان اضلاع کو علاقہء حیدرآباد۔کرناٹک کے نام سے ہی جانا پہچانا جاتا تھا۔فضل حق کمیشن کی سفارشات کے تحت جب ہندوستان کی ریاستوں کی تشکیلِ جدید عمل میں آئی تو گلبرگہ' رائچور اور بیدر کا انضمام ریاستِ کرناٹک میں ہوا۔یہاں کی ادبی روایتوں کے خوشگوار ذکر سے تاریخِ اردو' کا دامن آج بھی بھرا ہوا ہے۔ڈاکٹر انیس صدیقی رقمطراز ہیں:

''موجودہ ریاستِ کرناٹک کے اضلاع من حیث المجموع ' چاہے وہ گلبرگہ' بیدر ورائچور رہوں یا بیجاپور' دھارواڑ' بلگام یا پھر قدیم میسور' ہر علاقہ اردو زبان وادب کی اپنی مستحکم ادبی روایت اور تاریخ رکھتا ہے۔اس لیے

یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ ریاستِ کرناٹک میں اردو زبان و ادب کا ارتقا' اردو زبان و ادب کی تاریخ کا ایک روشن اور منور باب ہے۔

(کرناٹک میں اردو صحافت۔ڈاکٹر انیس صدیقی۔ص ۳۰۔افلاک پبلیکیشنز' گلبرگہ ۲۰۰۳ء)

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ دکنی اردو شاعری کے ساتھ ساتھ علاقۂ حیدر آباد کرناٹک میں لوک گیتوں کو قدرتی طور پر سرپرستی حاصل ہوتی رہی۔ذوق طبع کی تسکین کی خاطر اس علاقے کے شعرائے کرام نے جہاں رثائی کلام سپردِ قلم کیا وہیں اپنی تخلیقی و شعری صلاحیتوں سے لوک گیتوں کو صفحۂ قرطاس کی زینت بنا کر گلبرگہ' رائچور اور بیدر کے ادبی ورثے کو مالا مال کیا گیا۔ اس طرح دکن کا یہ علاقہ اپنی دیرینہ اور تابناک روایاتِ ادب کا امین اور پاسدار کل بھی تھا اور آج بھی ہے۔□□

حیدر آباد کرناٹک میں اردو تنقید

عبدالرب استاد

ایس۔جی۔ایل و ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو و فارسی، گلبرگہ یونیورسٹی گلبرگہ

حیدرآباد کرناٹک جو صرف تین اضلاع تک محدود تھا اب وہ پانچ اضلاع میں پھیل گیا ہے۔اس کی وسعت اضلاع کے اعتبار سے پھیل تو گئی ہے مگر جغرافیائی لحاظ سے آج بھی اتنی ہی ہے جتنی پہلے تھی۔ان میں ادب کی آبیاری جس طرح پہلے ہو رہی تھی آج بھی ہو رہی ہے۔علم کا دامن وسیع ہوتا جارہا ہے Specilisation کے اس دور میں Globlisation نے جہاں دنیا کو سمیٹ کر Global Village بنا دیا ہے وہیں میڈیا اور انفارمیشن ٹیکنالوجی نے صرف ڈاک ہی کو نہیں بلکہ knowledge کو بھی Door to Door کر دیا ہے۔اب اس سے کس کو کیا ملا یہ مقدر کی بات ہے۔

علاقہ حیدرآباد کرناٹک میں ضلع گلبرگہ ہر طرح سے ادبی سطح پر زرخیز نظر آتا ہے۔ میرے کہنے کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ دوسرے اضلاع زرخیز نہیں ہیں۔ یہ اس لئے بھی کہہ رہا ہوں کہ یہ شہر نہ صرف ضلعی ہیڈ کوارٹر ہے بلکہ حصولِ علم کی خاطر دیگر اضلاع اور مقامات کے افراد گلبرگہ ہی کا رخ کرتے ہیں کیونکہ تعلیمی اداروں کا یہاں گویا ایک جال سا ہے اور فی زمانہ پڑھے لکھوں کا ذریعۂ معاش سرکاری ملازمت ہی بنا ہوا ہے اس لئے ملازمین پیشہ حضرات نے نہ صرف یہاں سکونت اختیار کرنے کو ترجیح دی بلکہ اسے اپنا وطن ثانی بھی بنالیا ہے۔

ادب کی آبیاری میں اس علاقہ نے اہم رول ادا کیا ہے۔ مجھے ماضی میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ سقوط حیدرآباد کے بعد لسانی بنیادوں پر ریاستوں کی تشکیل جدید نے مملکت آصفیہ کو کرناٹک' آندھرا اور مہاراشٹرا میں ضم کر دیا۔اس طرح کرناٹک کا یہ شمالی حصہ جسے حیدرآباد

کرناٹک کا نام دیا گیا ہے مرکز اردو، حیدرآباد کے اثرات اپنے جلو میں لئے، ان یادوں کو نہ صرف زندہ رکھنے کی کوشش کی بلکہ اس وقار اور معیار کو برقرار رکھنے کی سعی میں سرگرداں نظر آتا ہے۔ اس لئے یہاں کے شعراء وادبا نے ہمیشہ ادب کی نئی جہتوں کو نہ صرف انگیز کیا بلکہ انہیں برتنے اور اس کے شانہ بہ شانہ چلتے ہوئے بڑی سادہ دلی اور کشادہ قلبی کے ساتھ ادب کی آبیاری میں جٹ گئے۔ اور اچھے سے اچھا شعری اور افسانوی ادب و نیز دیگر اصناف کی تخلیق کرتے ہوئے اپنا وجود کا احساس دلاتے رہے۔ جس کا اعتراف بیشتر نقادوں نے بھی کیا ہے۔ یہ ادب غمازی کرتا ہے ان کی اعلیٰ تنقیدی صلاحیتوں کی۔ کیونکہ معیاری اور اعلیٰ ادب عمدہ تنقیدی بصیرت اور صلاحیت کے باوصف ہی تخلیق پاتا ہے۔

ہاں یہ بات بھی مسلم ہے کہ اچھی تنقید بھی کسی عمدہ تخلیق سے کم نہیں ہوتی۔ چنانچہ اس علاقہ کے ادب پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں بھی تنقیدیں لکھی گئیں ہیں مگر ان میں عجز والے بھی ہیں، مست مئے پندار بھی ہیں، کامل بھی ہیں، غافل بھی ہیں، ہشیار بھی ہیں اور کئی ہیں کہ اس نام سے بیزار بھی ہیں۔

ان میں کئی نام آپ کو ملیں گے جنہوں نے اپنی ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔ ان تنقیدوں میں تخلیقی مضامین بھی ہیں، تجزیاتی مضامین بھی، تاثراتی مضامین بھی ہیں اور واقعی تنقیدی مضامین بھی۔ بعضوں نے اکیڈمک ضرورتوں کی تکمیل کے لئے بھی مضامین قلم بند کئے جو لکچر نوٹس کے مماثل نظر آتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تنقید یقیناً لکچر نوٹس تو بن سکتے ہیں مگر لکچر نوٹس ہرگز تنقید نہیں بن سکتے۔ چنانچہ یہاں تنقیدی مضامین لکھنے والوں میں رزاق فاروقی، لئیق صلاح، قیوم صادق، طیب انصاری، مجیب الرحمٰن، وہاب عندلیب، حمید سہروردی، خالد سعید، صغریٰ عالم، شمیم ثریا، حشمت علی، انیس صدیقی، فوزیہ چودھری، خلیل مجاہد، پیرزادہ فہیم الدین، خالدہ بیگم، ماجد داغی، حامد اشرف، عبدالرب استاد، غضنفر اقبال، وحید انجم، عبدالباری، سید اکبر حسینی، واجد اختر صدیقی، ہاجرہ پروین، منظور احمد دکنی، اطہر معز وغیرہ کے نام ملتے ہیں۔

قبل اس کے کہ اس علاقہ کے تنقید نگاران پر اظہار خیال ہو' مناسب یہ ہوگا کہ تنقید کی تعریف' علمائے ادب نے جس انداز سے کی ہے اس کا ذکر کرتا چلوں تا کہ بات واضح ہو جائے۔ ہڈسن نے تنقید کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

''تنقید وہ ادب ہے جو ادب کے متعلق لکھا گیا ہو اور جس میں خواہ ترجمانی کرنے کی کوشش کی گئی ہو' خواہ تعریف و توصیف یا تجزیہ و تشریح کی' شاعری' ناول' ڈرامہ اور افسانہ زندگی کی تشریح کرتے ہیں'' (شاعر، ہم عصر اردو ادب نمبر 1977ء ص64)

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تنقید ادب پارہ یا فن پارہ کو زندگی اور معاشرے کی خوب و زشت اور اتار چڑھاؤ سے تقابل کرتے ہوئے یا زندگی میں ہونے والے عوامل سے انسلاک کرتے ہوئے جائزہ لینے کا کام کرتی ہے۔ جبکہ اردو ادب کے معتبر نقاد پروفیسر آل احمد سرور کا کہنا ہے کہ

''اچھی تنقید ذہن کی تنظیم کر کے مہذب اور باشعور قاری پیدا کرتی ہے''۔

(شاعر، ہم عصر اردو ادب نمبر 98-1997ء ص234)

ایک اور جگہ سرور صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ

''شاعری کے لئے شیریں دیوانگی اور تنقید کے لئے مقدس سنجیدگی کی ضرورت ہوتی ہے''۔

(تنقید کیا ہے۔ آل احمد سرور، بحوالہ ادیب جنوری تا مارچ 1981ء ص9)

دراصل فن پارہ نقاد سے سنجیدگی کا تقاضہ کر رہا ہوتا ہے کہ جانبداری اور یکبارگی میں دو ٹوک فیصلہ نہ لیا جائے۔ تنقید نگار کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ کسی بھی فن پارہ کا جائزہ انتہائی سوچ بچار کے بعد لے اور فن کی کسوٹی پر پرکھے۔ جس سے اس تنقیدی مضمون کی اہمیت بڑھ جائے گی۔ تنقیدی مضمون سے متعلق شمس الرحمٰن فاروقی کا خیال ہے کہ:

''تنقیدی مضمون میں جتنی دماغی قوت اور جتنا وقت اور جس طرح کی محنت درکار ہوتی ہے وہ ایک غزل یا نظم کی محنت سے اور وقت اور دماغی قوت سے زیادہ ہوتی ہے''۔

(شاعر' ہم عصر ادب نمبر 98-1997ء ص 263)

ان اقتباسات کے تناظر میں حیدر آباد کرناٹک کے تنقید نگاروں کا جائزہ لیں تو سب سے پہلے نظر پڑتی ہے سید مجیب الرحمٰن کی شخصیت پر اور ان کی تنقیدی کاوش ماورائے شعور پر

سید مجیب الرحمٰن:

ماورائے شعور گو کہ سید مجیب الرحمٰن صاحب کی ایک ہی تنقیدی مضامین کی کتاب منظر عام پر آئی ہے مگر اس میں ان کی علمیت اور ذہانت جھلکتی ہے۔ ان مضامین میں ان کا علم' فلسفہ' منطق' جمالیات اور دیگر زبانوں سے ان کی واقفیت عیاں ہوتی ہے۔ ان میں بیشتر مضامین ان کے گہرے علم اور وسیع مطالعہ کی غمازی کرتے ہیں۔ غالبؔ پر آج تک بہت لکھا گیا۔ تحقیقیں ہوئیں' تنقید کی گئیں اور ہر پہلو سے ان پر لکھا گیا اور یہ عمل جاری ہے۔ مگر سید مجیب الرحمٰن نے غالب کو علم النفسیات اور تاریخی تناظر میں دیکھنے کی سعی کی ہے۔ ''غالبؔ ایک جینئس'' کے عنوان سے مضمون ملتا ہے۔ جس میں وہ جینئس کی تعریف اپنے انداز میں یوں کرتے ہیں:

''جینئس کی ایک تعریف یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے سارے ماضی کے تاریخی' ارتقائی عمل کا حصہ ہوتا ہے، جب ہی تو وہ زماں و مکاں کے بندھنوں کو توڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ ماضی کی بہترین قدروں کا وارث اور نئے Ethos کا پیغامبر ہوتا ہے''۔

(ماورائے شعور، سید مجیب الرحمٰن ص 43)

اس طرح ان کے بیشتر مضامین میں شعور اور لاشعور کی بحث ملتی ہے اور انسانی فکر کا دارومدار دراصل اس کے شعور و لاشعور کے گرد ہی محسوس ہوتا ہے جس سے وہ نہ صرف فن کار کو بلکہ

اس کے عہد اور فن پارہ کو بھی پرکھتے نظر آتے ہیں۔

ایک اور مضمون 'ہندوستانی زبانوں کے لئے مشترک اکائی عروض' اس میں جہاں وہ عربی' فارسی اور ویدک سنسکرت کی عروضیات کا احاطہ کرتے ہوئے ہندی پنگل کی وضاحت کرتے ہیں اور یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ آج کا شاعر انہیں مشکل جان کران سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہے، اس کے بالمقابل انہیں انگریزی عروض آسان لگتے ہیں۔ اس تناظر میں انہوں اردو کے ابتدائی زمانے کے شعراء کے اشعار کے ساتھ ساتھ عصری شعراء کی شاعری سے مثالیں بھی دی ہیں۔ اور یہ رائے دیتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ تمام زبانوں کے لئے خواہ وہ دراوڈی ہو کہ آریائی، ایک مشترکہ نظام ترتیب دیا جائے۔ جو تمام کے لئے آسان بھی ہو۔ اس سلسلے میں انہیں دراوڈی عروض کسی حد تک آسان لگتی ہے، کہ دراوڈیوں نے بجائے ریاضی کے موسیقیت کو ترجیح دی ہے۔ یہاں ریاضی سے مراد (غالباً) عربی یا فارسی کا وہ عروضی نظام ہے یا سنسکرت کا وہ چھند شاستر ہے جو افاعیل' ارکان اور ماتراؤں کی تعداد پر منحصر ہوتا ہے۔ حالانکہ شاعری بنیادی طور پر غنائیت لئے ہوئی ہوتی ہے۔ جس میں نغمگی اور شیرینی کا عمل دخل ہوتا ہے خواہ وہ دراوڈی ہو کہ آریائی، مغربی ہو کہ مشرقی، مگر ہر زبان کا اپنا مزاج ہوتا ہے، اس کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ بہرحال میری دانست میں یہ ممکن تو نظر آتا کہ تمام ہندوستانی زبانوں کے لئے مشترکہ اکائی کا عروض ترتیب دیا جائے اور مجھے یہ ماورائے شعور لگتا ہے۔ اسی طویل مضمون میں آپ نے قاضی سلیم کی آزاد نظم اور عادل منصوری کی نثری نظم بطور نمونہ دی ہیں اور ان کی تقطیع بھی فرمائی ہے۔ جبکہ قاضی سلیم کی نظم نمونہ کے طور پر دی ہیں اور اس کی تقطیع بھی فرمائی ہے۔ سید مجیب الرحمٰن کے دیگر مضامین میں عملی تنقید کے بارے میں، لاشعور کی منظم بدنظمی، انا کی نفسیات اور اس کی تہذیب، تلسی داس کے آس پاس وغیرہ ہیں۔ بہرحال ان کی تنقید میں جمالیات، نفسیات، فلسفہ، منطق، اور دیگر زبانوں کے متعلق معلومات ملتے ہیں جو ایک قاری کے ذہن کی تنظیم کرنے، انہیں مہذب اور باشعور کرنے و نیز شعور و ادراک میں ہل چل پیدا کرتی نظر آتی ہیں۔

وہاب عندلیب:

علاقہ حیدرآباد کرناٹک کے شہر گلبرگہ ہی سے تعلق رکھنے والی ایک اور معتبر شخصیت ہیں۔ جو پیشہ تدریس سے وابستہ ہے۔ تاہم انہوں نے خاکے بہت عمدہ لکھے۔ جبکہ تنقیدی مضامین ان کی بصیرت اور فکر کی غمازی کرتے ہیں۔ مضامین زیادہ تر تحقیقی طرز پر ہیں اس لئے انہوں نے اپنے مجموعۂ مضامین کا عنوان تحقیق و تجزیہ رکھا۔ گو کہ انہوں نے تنقید کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ مگر تحقیق ہو کہ تجزیہ، تنقیدی شعور کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ ان مضامین میں ان کی تنقیدی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔

حمید سہروردی:

اسی شہر گلبرگہ سے تعلق رکھنے والی ایک اور شخصیت جس نے دنیائے ادب میں اپنی شناخت بحیثیت افسانہ نگار کے تعین کر چکی ہے۔ یہ بھی پیشۂ درس و تدریس سے منسلک رہے اور افسانوں کے ساتھ ساتھ قصرِ شعری بھی تعمیر کیا۔

تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ ''بین السطور'' کے نام سے منظر عام پر آیا۔ جس میں نصف حصہ تنقیدی مضامین اور نصف حصہ تجزیوں پر مشتمل ہے۔ یہ تنقیدی مضامین دراصل اردو فکشن پر معلومات افزاء مضامین ہیں۔ کہ افسانہ نگار نے اپنے معاصر افسانوی ادب و نیز فکشن نگار قرۃ العین حیدر کی ناول نگاری پر اپنی تبحر علمی سے احاطہ کیا ہے۔ ان مضامین سے ہی اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ کس قدر تنوع ہے، عنوانات یہ ہیں۔

مختصر افسانہ، فعال صنف نثر، کرناٹک میں اردو افسانہ آزادی کے بعد، مراٹھواڑا میں عصری ادب، آزادی کے بعد اردو افسانہ' سمت و رفتار، اردو ناول پیش رفت، قرۃ العین حیدر کی ناول نگاری، یہ مضامین یقیناً اپنے قاری کو مطالعہ کی طرف مائل کرنے کا ہنر رکھتے ہیں۔ افسانہ کے متعلق ان کا خیال ہے کہ:

> ''عام طور پر یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ اردو افسانہ مغربی ادب کی دین ہے۔
> مگر یہ بات مکمل طور پر درست نہیں ہے کیونکہ اردو ادب میں افسانے سے

پہلے داستانوں کا رواج عام رہا ہے۔ خود پریم چند جو اردو کے اولین افسانہ نگار تصور کئے جاتے ہیں انہوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ انہیں افسانہ لکھنے کی تحریک طلسم ہوشربا کو پڑھنے کے بعد ہوئی۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ اردو افسانے کا پس منظر دراصل داستان ہے، تاہم یہ بات کہے بنا نہیں رہا جا سکتا کہ مغربی افسانے سے اس کو تقویت پہنچی ہے''۔

(بین السطور از۔ حمید سہروردی ص 43)

خالد سعید:

خالد سعید نے شاعری بھی کی، افسانے بھی اور تنقیدی مضامین بھی لکھے شاعری میں ایک مجموعہ ''شب رنگ ونمو'' اور تنقیدی مضامین کے تین مجموعہ تعبیرات'' 'پس تحریر' اور 'بارہ مضامین' قابل ذکر ہیں۔ ان مضامین سے خالد سعید کی تنقیدی فکر کا اندازہ ہوتا ہے کہ جس موضوع پر بھی انہوں نے قلم اٹھایا اسے بڑے ہی سائنٹفک انداز سے جانچا' پرکھا اور پیش کیا میری دانست میں اس علاقہ کا عمدہ تنقیدی ذہن رکھنے والی شخصیت کا نام خالد سعید ہے۔

تعبیرات گو کہ 80 کے دہے میں لکھی ہوئی کتاب ہے جس میں متنوع موضوعات پر پانچ مضامین ہیں جو اپنے قاری کو دعوت مطالعہ دیتے ہیں۔ پہلا مضمون ''نثری نظم کے باب میں کچھ گفتگو'' ہے۔ یہ اس وقت کے اعتبار سے موضوع بحث مضمون رہا، کہ نثری نظم کی اردو ادب میں آمد تھی اور بطور تجربہ کے درآئی تھی۔ کچھ نے خوش آئند تصور کیا تو کچھ نے مخالفت کی' بہر حال وقت گذرتا گیا اور نثری نظم اردو شعر وادب میں بڑی ردوقدح کے بعد راہ پا گئی اور آج کئی شعراء نے اس صنف کو وسیلۂ اظہار بنالیا ہے۔ اس عنوان کے تحت مضمون نگار نے نثری نظم کے آہنگ، عروض اور افاعیل سے بحث کرتے ہوئے جو مثالیں دی ہیں ان کی خوبی یہ ہے کہ حیدرآباد کرناٹک کے شعراء کی نظموں کو ہی منتخب کیا جن میں حمید الماس اور اکرام باگ ہیں اور بڑی مدلل بحث کی ہے۔ آخر میں نثر پارے اور نثری نظم کے فرق کو اس طرح سے واضح کرتے ہیں۔

اقتباس ملاحظہ ہو۔

''رکن کے تواتر اور تسلسل سے پیدا ہونے والی صوتی کیفیت کو میں موزونیت کہتا ہوں۔ اور ایک بار یہ بھی دہرادوں کہ نثری نظم میں موزونیت اور بیشتر موزونیت والی نشانی نثری نظم کی شناخت کرنے کا ذریعہ Tool ہے جس کی مدد سے ہم نثری نظم کو نثر پارے سے علاحدہ کر سکتے ہیں''۔

(تعبیرات از خالد سعید ص 32)

ان کے اور مضامین میں ''میلی چادر کے تانے بانے'' جو راجندر سنگھ بیدی کے مشہور ناولٹ ایک چادر میلی سی کا تنقیدی جائزہ پیش کرتا ہے۔ جبکہ تیسرا مضمون اردو کی معروف فکشن نگار، گیان پیٹھ ایوارڈی، قرۃ العین حیدر کے شرۂ آفاق ناول آگ کا دریا پر ہے۔ اس ناول پر دنیا بھر کے نقادوں نے لکھا، سراہا اور دادِ تحسین سے نوازا مگر خالد سعید کا اپنا انداز ہے۔

ان مضامین میں ایک اہم اور اچھا مضمون ''خلا میں بکھرے ہوئے حروف کی پہچان'' ہے جو حیدرآباد کرناٹک سے وابستہ' کرناٹک میں جدیدیت کے روح رواں اور اردو ادب کا ایک اہم شاعر حمید الماس کی شاعری پر لکھا ہوا مضمون ہے، جس میں خالد سعید نے حمید الماس کی شاعری اور نظموں کا احاطہ کرتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کیا ہے کہ حمید الماس نے اپنے عہد کی ناہمواریوں، تجربات اور حادثات کا ذکر اپنی نظموں کے ذریعہ کیا ہے۔ مگر کہیں بھی لہجہ درشت یا ادق نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ خالد سعید نے غزل کے اشعار پیش کرتے ہوئے نظم گو حمید الماس اور غزل گو حمید الماس کا تقابل کرتے ہوئے نظم گو حمید الماس کے حق میں یہ فیصلہ دیتے ہیں کہ وہ غزل کے نہیں بلکہ نظم کے شاعر ہیں۔ تجزیوں میں بلراج کومل اور محمود ایاز کی نظمیں' بہت عمدہ ہیں۔

دوسری تنقیدی مضامین پر مشتمل کتاب ہے پس تحریر' خود ان کے اپنے بیان کے مطابق مختلف موقعوں پر دیے گئے لکچرز ہیں ان میں بعض مضامین اچھی تنقیدی نظر رکھنے والے ہیں۔

سائنٹفک انداز سے سوچتے، غور کرتے اور نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔ زبان و بیان پر گرفت مضبوط ہے، الفاظ کی شستگی و چستگی، گھٹی ہوئی عبارت اور ان کا سلجھا ہوا ذہن ان کی تنقید میں بولتا ہوا نظر آتا ہے۔

صغریٰ عالم:

صغریٰ عالم اس علاقہ کی نہ صرف شاعرہ ہیں بلکہ انہیں اولین شاعرہ ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ اب تک شاعری میں چھ مجموعے منظرِ عام پر آئے ہیں جب کہ نثر میں ایک تحقیقی مقالہ اور تبصروں پر مشتمل ایک کتاب ''کفِ میزان'' نام سے چھپ چکی ہے جس میں سات (7) تبصرے اور 11 مضامین اظہارِ خیال کے تحت ملتے ہیں ان مضامین سے صغریٰ عالم کی تنقیدی فکر عیاں ہوتی ہے۔ کفِ میزان کے مشمولہ تمام مضامین شاعری کا احاطہ کرتے ہیں جس سے محسوس ہوتا ہے کہ محترمہ کا شاعرانہ مزاج ان مضامین سے جھانک رہا ہے۔ شاعری اور اس کے رموز واوقاف، خواہ وہ علم بیان ہو کہ علم عروض، علم معانی ہو کہ علم قافیہ پر کافی دسترس رکھتی ہیں۔ ساتھ ہی زبان و بیان کی جہاں تک بات ہے اس پر اچھی گرفت ہے۔

ان مضامین کے علاوہ ان کا تحقیقی مقالہ بعنوان ''پروفیسر عنوان چشتی محقق، ناقد اور شاعر'' بہت عمدہ اور معیاری ہے۔ ان کو پڑھنے سے تخلیق اور تنقید، تنقید اور تحقیق اور تحقیق اور تخلیق کے آپسی رشتے سمجھ میں آسکتے ہیں۔ ان مضامین اور اس تحقیق سے صغریٰ عالم کی تبحر علمی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور قاری محترمہ کی معیاری تحقیقی ذہانت، عمدہ تنقیدی بصیرت اور اعلیٰ تخلیقی ذکاوت کا قائل ہو جاتا ہے۔

جلیل تنویر:

جلیل تنویر افسانہ نگار اور شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ جبکہ انہوں نے بھی تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''فکر و نظر'' کے عنوان سے منظرِ عام پر آیا ہے۔ جس میں 25 مضامین مختلف شخصیتوں اور ان کے فن کا احاطہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جلیل تنویر نے ان شخصیتوں اور ان کے فن کو اپنے انداز سے پیش کیا ہے جس سے ان کی تنقیدی

کاوش کا اظہار ہوتا ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی تنقید نگار موجود ہیں۔ ان کے لئے ضروری ہے کہ اس علاقہ کے ادب پر نہ صرف لکھنا چاہیے بلکہ پھر لکھنا چاہیے۔ اور ان کے فن کی قدر کا تعین کرنا چاہیے۔ پھر دیکھئے اس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا' آنے والے دنوں میں یقیناً یہاں کے فن اور فنکار کو وقار، معیار اور مرتبہ ملے گا اور ضرور ملے گا۔ بقول آل احمد سرور:

''ادب کا تجوبہ یہ ہے کہ اس میں اکثر فوری انصاف نہیں ہوتا۔ مگر بالآخر ضرور ہوتا ہے۔ اقبال نے غلط نہیں کہا ہے کہ جب شاعر کی آنکھیں کھلی ہوتی ہیں تو اس کے دور کی آنکھیں بند ہوتی ہیں۔ اور جب شاعر کی آنکھ بند ہو جاتی ہے تو اس دور کی آنکھ کھلتی ہے''۔

(شاعر ہم عصر ادب نمبر 1999ء ص 235)

آخر میں سابق مدیر شاعر جناب اعجاز صدیقی کا اقتباس جو طویل ہے پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں جو اردو ادب کے تناظر میں 70 اور 80 کے دہے میں لکھا گیا ہے۔ جو اس علاقہ کی مناسبت سے بھی تعلق رکھتا ہے:

''یا تو ملکی اور عالمی زبانوں میں اردو شعر و ادب کا کوئی درجہ و مقام سرے سے ہے ہی نہیں اور اگر ہے تو ہمیں اس مجرمانہ غفلت پسندی کا اعتراف کرنا ہوگا کہ ہم ایماندارانہ خود احتسابی سے کام نہیں لے رہے ہیں ہمارا وقت کیچڑ اچھالنے میں ضائع ہوا ہے۔ اب تو ہم عالمی ادب میں مقام اقبال کے بھی منکر ہیں۔ دوسروں کا تو ذکر ہی کیا۔ تو کیا اردو شعر و ادب محض بکواس ہے؟ ترقی پسندی اور جدیدیت کی آویزش بڑھتے بڑھتے گالی گلوچ تک پہنچ چکی ہے۔ یہ اصطلاحیں تو ایک دوسرے کے خلاف دل کی بھڑاس نکالنے اور اپنی اپنی ہمہ دانیوں کے اظہار کے بہانے ہیں۔ اردو

شعر و ادب کی قدر و قیمت کا تعین ہم کہاں کر پائے ہیں، اس کے شہ کا روں کو عالمی ادب میں کوئی درجہ و مقام دلانے کی بات تو الگ رہی، اس کے محض اعتراف کی بھی جذباتی سطحیت رکھنے والوں سے توقع نہیں کی جاسکتی۔ جب بھی اظہار خیال ہوتا ہے تو مغربی ادب و شعر سے تقابل کر کے اردو شعر و ادب کی کمتری پر مہر تصدیق ثبت کر دی جاتی ہے، یہ جانتے ہوئے بھی کہ زبانوں کا مزاج، ان کا آہنگ، ان کی ساخت، اصوات و الفاظ و اسالیب، طریقہ ہائے اظہار سب الگ الگ ہوتے ہیں۔ اور خود ان پر زبانوں کی اپنی پہچان، ان کی اپنی انفرادیت۔ پھر یہ اصرار کیوں، کہ اردو میں کوئی شیلے، کیٹس اور بائرن پیدا نہیں ہوا، اور بھی بہت سے مغربی شاعروں اور افسانہ نگاروں سے اردو شاعروں اور افسانہ نگاروں کا موازنہ و مقابلہ کیا جاتا ہے۔ اردو ایک جدید زبان ہے اور وہ بھی ایسی زبان جو صرف ہندوستان تک محدود رہی (اور اب پاکستان ہے) انگریزی زبان اردو سے کہیں زیادہ قدیم اور بین الاقوامی زبان ہے پوری دنیا پر چھائی ہوئی ہے۔ اردو تو ایشیا کی بھی بعض زبانوں سے جدید تر ہے۔ اس کے باوجود (یہ خوش فہمی نہ سمجھی جائے) اردو میں ایسا ادبی و شعری سرمایہ ضرور موجود ہے، جس کا ذکر عالمی سطح کے اچھے ادب کے ساتھ ہوسکتا ہے"۔ ◻◻

(شاعر ہم عصر ادب نمبر 1977ء ص 17)

حیدر آباد کرناٹک کے ادب میں
''تحریکات و رجحانات''

کوثر فاطمہ
لیکچرار، شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج، گلبرگہ و
ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو و فارسی، گلبرگہ یونیورسٹی، گلبرگہ

لاشعوری طور پر ادباء و شعراء کی اپنی تخلیقات میں تغیر کی خواہش یا تغیر کی تکرار ایک نئے رجحان کو جنم دیتی ہیں۔ یہی طاقتور رجحان آ ہستہ روی سے کئی خیالات کو منقلب کر کے انہیں اپنا ہم نوا بنا لیتے ہیں۔ اور ادب کے جمود اور یکرنگی کو ہمہ رنگی اور تنوع میں تبدیل کرتے ہیں اس عمل کو تحریک کہتے ہیں۔

برصغیر میں بیسویں صدی کا آغاز ہوا تو ہندوستان پر انگریزوں کے شب خون کو 43 برس گذر چکے تھے، مسلم اقتدار کا زوال جہاں کچھ لوگوں کیلئے آزردگی کا سبب بنا وہیں کچھ دور اندیش، شخصیتوں نے ماضی کو فراموش کر کے مستقبل کو بہتر اور بامعنی بنانے کی کوشش کی۔ سرسید احمد خاں نے ایک مصلح کی حیثیت سے وقت کے تقاضوں کے مطابق بنیادی تصورات اور مطالبات میں ایک نقطۂ نظر کی تبدیلی کو اپنا مسلک قرار دیا اور ان کے رفقائے کار نے ان کے اس مقصد کو کامیابی بخشی۔ اس تحریک کو سرسید تحریک کا نام دیا گیا۔ روایت پرستی کے خلاف مقصدی اور مفید ادب کی تخلیق اس تحریک کی اساس تھی۔ اس تحریک کے زیر اثر ادب نے موضوعات میں وسعت، بیان کی سلاست و سادگی کو ایک نئے رنگ سے آشنا کیا۔ مسدس حالی اس خیال کی بھرپور نمائندگی کرتی ہے۔ ان کا مقدمہ، مقدمۂ شعر و شاعری اس اصلاحی تحریک کی رہنمائی کا ذریعہ بنا اور یہیں سے ادب زندگی سے ہم آہنگ بھی ہوا۔

اردو کا ابتدائی ادب کلاسیکی ادب کہلاتا ہے۔ کلاسکیت کی حیثیت صرف ایک طویل تر زمانے پر پھیلے ہوئے رجحان کی تھی۔ حیدرآباد کرناٹک کے علاقوں میں شہر گلبرگہ ''اردو زبان اور تہذیب'' کا علاقہ کہلاتا ہے۔ آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد بھی اس سرزمین پر نامور (شعراء اور ادباء) فنکار اپنے فن کے چراغ جلائے جسکا سلسلہ آج بھی برقرار ہے۔ اس علاقے نے جہاں کلاسیکی شعراء و ادباء کے فن کو جلا بخشی وہیں مختلف تحریکات و رجحانات کے اثرات بہترین ادب کی تخلیق کا باعث بنے۔ تاب سہروردی، چاق گلبرگوی، مختار ہاشمی، سرور مرزائی، شور عابدی، صابر شاہ آبادی جیسے شعراء نے کلاسیکی شاعری سے صنف شاعری کو بام عروج تک پہنچایا۔ وہیں سلیمان خطیب جو دکنی لہجے کے منفرد شاعر تھے۔ انہوں نے اصلاحی و کلاسیکی انداز کو برتتے ہوئے ایک واعظ و فلسفی کی طرح روزمرہ زندگی کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا اپنے بلند خیالات کے جذبے کو خلوص میں ڈال کر زبان کی انتہائی سادگی و صفائی سے اپنی شاعری کو خطیبانہ لہجہ دیا۔

تحریکات نے جہاں ادب اور سماج کے مختلف صیغوں پر اپنا اثر ڈالا وہیں رومانی ادیبوں اور شاعروں نے ایسے حسن کی خواہش کی جو ذوق سلیم کی آبیاری کرے۔ اس سے فرد جمالیاتی خود فراموشی کے سحر میں مبتلا ہو گیا۔ سماج کی تلخ حقیقتیں اور اسکی چبھن دب گئی۔ لیکن سائنسی اور صنعتی ترقی کے نتیجے کے طور پر انسان کا حقیقت پسندی کی طرف رجحان بڑھ گیا جسکے اثرات مختلف شکلوں میں بیسویں صدی کے اواخر تک نمایاں ہوئے اور ادب بھی اسکی زد سے بچ نہ سکا۔ سماجی ناانصافی، بے روزگاری، نظام تعلیم کی ناہمواری، انسانی کرب و دکھ درد کے خلاف احتجاجی طور پر جن اہل قلم حضرات کا قلم جنبش میں آیا۔ ان میں شاہد فریدی، شکیب انصاری، جلیل تنویر، وحید انجم، حنیف قمر، عبید اللہ، مختار احمد منو، حمیرا حیدر، کوثر پروین، ناظم خلیلی کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ ان تخلیق کاروں نے مشاہدہ اور خارجی تجزیہ سے اپنے تخلیقات اور موضوعات میں تنوع پیدا کیا۔ ان کی تخلیقات روایتی ہونے کے باوجود عصری تقاضوں کو پورا کرتی ہیں۔ ہجرت کے کرب کا شدید احساس، فراق اعزواحباب اور تہذیبی المیہ کے احساسات کی جھلک ہمیں نیاز گلبرگوی،

فضل گلبر گوی اور ابراہیم جلیس کے یہاں ملتی ہے۔

انقلابِ روس نے دنیا بھر کے حساس ،درد مند شاعروں اور ادیبوں کو محنت کش کی حمایت ،نسلی تعصب ،فرقہ پرستی ،انسانی استحصال کے خلاف آواز اٹھانے پر مجبور کیا۔ مقصدی ادب پر زور دیا گیا تا کہ ادب کے ذریعہ عوام تک رسائی ہو اس مقصد کے حصول کیلئے انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی گئی ۔حیدر آباد میں مخدوم محی الدین اور گلبر گہ میں ابراہیم جلیس اس تحریک کے طاقتور ستون بن گئے یہ دور ترقی پسند تحریک کے شباب کا دور تھا۔ابراہیم جلیس نے ترقی پسند تحریک کے اہم افسانہ نگار کی حیثیت سے اپنی شناخت محفوظ کر لی تھی ،ان کا دور اردو نثر کا تابناک دور کہلایا ۔ابراہیم جلیس کے بعد جن شخصیتوں نے ترقی پسند تصورات کو اپنی تحریروں میں جگہ دی ان میں محبوب حسین جگر ، غلام حسین ساحل ، نیاز گلبر گوی ،عبدالقادر ادیب ،عبدالرحیم آرزو ،مجتبیٰ حسین وغیرہ ہیں۔

ترقی پسند تحریک کے عروج کے زمانے میں ہی ایک رجحان نے قدم جما لیئے تھے اس رجحان نے ادب میں انفرادیت کو ترجیح دی ۔ادب کا مواد زندگی سے حاصل کر کے فرد کو زندگی کی آرائشوں سے بلند ہوئے اور متخیلہ کی گمبھیر گہرائیوں سے انکشافِ حیات اور عرفان ذات پر مائل کیا۔اس تحریک کو حلقہ ارباب ذوق کے نام سے جانا جاتا ہے۔حمید الماس اس علاقے کے واحد شاعر ہیں جنہیں حلقہ اربابِ ذوق کا معروف شاعر تسلیم کیا گیا۔

کلاسکیت اور جدیدیت کا حسن امتزاج جن شعراء کے ملتا ہے ان میں راہی قریشی ، خمار قریشی ،تنہا تماپوری اور محبّ کوثر وغیرہ نے منفرد لہجہ و آہنگ سے اپنی انفرادیت کو قائم رکھا۔

1965ء میں اردو میں جو رجحان ابھرا اس نے جدیدیت کی شکل اختیار کی ۔کلاسکیت سے انحراف اور رومانیت کو ترجیح جدیدیت کہلاتی ہے اس رجحان نے ذہنی آزادی کو فوقیت دی ۔اس میں انسانی تجربہ کی بہت اہمیت ہے زبان کے جوہر پر امراء اس تحریک کے فن پاروں کو خاص حسن بخشتے ہیں ۔بقول ڈاکٹر محمود یٰسین

''عام طور پر جدیدیت کا خیال آتے ہی ہمارا ذہن جدید میلانات و رجحانات کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ادب میں جدیدیت کسی خاص تحریک سے زیادہ اظہار خیال کا ایک مخصوص اور شاید اچھوتا انداز ہے اسکا مقصد موضوع اور تکنیک میں انقلاب اور تنوع، نئے افکار و خیالات کی ترجمانی ہے۔ جدیدیت ادب اور زندگی کے بدلے ہوئے معیاروں اور قدروں کے درمیان ہم آہنگی کی کوشش ہے''۔

حیدرآباد کرناٹک میں گلبرگہ ہی وہ مقام ہے جہاں جدید ادب کے گہرے اثرات نظر آتے ہیں یہاں کے فنکاروں نے جدید حسیت سے متاثر ہو کر افسانے، نظمیں اور غزلیں لکھیں۔ جدیدیت کی لہر نے ادب کے میدان کو مالا مال کیا۔ جدید فنکاروں نے اجتماعی نظریات کے بجائے انفرادی نظریات کی حمایت کی اور زندگی سے اپنا رشتہ جوڑا، ذات کے وسیلے سے حیات و کائنات کے اسرار رموز تک رسائی حاصل کی۔اس علاقہ کے جدید فنکاروں نے اظہار و ہیئت کے گوناگوں تجربات کئے۔اکرام باگ، حمید سہروردی، حکیم شاکر، حامد اکمل، خمار قریشی، جبار جمیل، تنہا تماپوری، لطیف حزیں، راہی قریشی، محبّ کوثر، محسن کمال اور اکرم نقاش قابل ذکر ہیں۔

زندگی کی محرومیاں، تلخ حقائق کی چبھن، شکیب انصاری اور شاہد فریدی کے افسانوں کا موضوع بنے تو لاچاریوں اور محرومیوں کو جبار جمیل نے اپنی شاعری میں جگہ دی اور سماجی سیاسی، تہذیبی مسائل صغریٰ عالم کی شاعری کا محور قرار پائے۔

زندگی کی نئی قدروں اور نئے اسلوب سے آگاہی نے فن کی نئی راہیں کھولی۔ترقی پسندی کے زیر اثر ادب نے ایک نیا موڑ لیا تو ابہام اور علامت نگاری اسکا حصہ بن گئے۔اکرام باگ اور حمید سہروردی نے اپنی تحریروں میں علامت، تجرید اور ابہام کے ذریعہ فن پاروں کو ایک نئی سمت و رفتار عطا کی۔بعد کو نجم باگ، ریاض قاصدار، علیم احمد اور بشیر باگ نے بھی علامتی و تجریدی افسانے لکھے۔

علامتی طرز کے اظہار کا سلسلہ شروع ہوا تو مروجہ علامتوں اور استعاروں کو رد کر کے جدید شاعری میں نئے علامات اور نئی لفظیات کا استعمال ہونے لگا۔ تنہائی کا کرب، خوف و ہراس، زندگی سے بیزاری کا احساس، سماجی و معاشی مسائل، معاشی عدم توازن، سیاست، اقدار کا زوال نئی شاعری کے موضوعات بنے انوکھی نظمیں۔ ان چھوٹے الفاظ، استعاروں اور پیکر تراشی کی خوبصورتی نے اس علاقہ کے شعراء کو جدید اور منفرد شاعروں کی صف میں کھڑا کیا۔

جدید نظم نگاری میں حمید الماس کا نام نمایاں رہا ہے۔ اکرام باگ، جبار جمیل، لطیف، صابر فخر الدین اور تنہا تماپوری اور حمید سہروردی نے بھی نظموں میں کامیاب تجربے کئے۔ یہ نظمیں مواد اور موضوع کے اعتبار سے بہترین نظمیں کہلائیں۔

ترقی پسند تحریک ہی کے زیر اثر ادب میں ہیت کے کافی تجربے کئے گئے۔ آزاد نظم کی روایت سردار جعفری اور جاں نثار اختر کے ہاتھوں پڑی، عصری موضوعات اور مسائل کو فلسفیانہ آہنگ میں ڈھالا جسکی پیروی اس علاقہ کے شعراء نے بھی کی۔

بیسویں صدی مختلف تحریکات و رجحانات کی صدی کہلاتی ہے اس علاقہ کے ادب پر ان تحریکات و رجحانات کا راست یا بالراست اثر پڑتا رہا ہے اور ادب میں تغیر و تبدیلی آتی رہی۔ □□

ضلع بیدر میں اردو افسانہ

محمد شمس الدین حکیم

ریسرچ اسکالر (جے۔آر۔ایف)،شعبہ اردو، یونیورسٹی آف حیدرآباد، حیدرآباد

ضلع بیدر ریاست کرناٹک کا چھوٹا مگر اہم ضلع ہے جہاں پر عہد بہمنی کی یادگاریں اپنی وہی شان وشوکت سے کھڑی ہیں اور یہاں فخر دین نظامی نے اردو زبان کا پہلا ادبی فن پارہ مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' تخلیق کر کے اردو زبان کو ادبی زبان میں منتقل کیا۔

ضلع بیدر میں بہ نسبت نثر کے شاعری پر زیادہ توجہ دی گئی، نتیجتاً نثری کارنامے بہت ہی کم ہیں۔ جہاں تک افسانہ کا تعلق ہے کچھ ہی افسانہ نگار ہیں جو افسانے میں قلم کشائی کر رہے ہیں جن میں اکرام باگ کا نام اہم رہا ہے۔

8 ستمبر 1948ء کو ضلع بیدر کے تاریخی شہر وتعلقہ بسوا کلیان میں اکرام الدین باگ کی پیدائش ہوئی، آپ کا پہلا افسانہ ''دم افعی'' شب خون کے شمارے 15 میں 1967ء کو شائع ہوا۔ کوچ ان کا افسانوی مجموعہ ہے جو 1986 میں سلامتی پبلیکیشنز گلبرگہ سے شائع ہوا۔

اکرام باگ کی بے باک شخصیت اور حقیقت پرستی کی جھلک ان کے افسانوں میں ملتی ہے جو زندگی کو ہر وقت ہر طرح کے تجربات کیلئے زینہ مشق بنائے رکھی ہے۔ اکرام باگ کی زندگی ایک تجرباتی زندگی ہے جس میں قول وعمل میں یکسانیت یگانگت، حقیقت وسچائی بدلتے حالات میں سوچ وفکر کی بدلتی نہج کو اپنے افسانوں میں تجربہ کے طور پر پیش کیا ہے۔ برصغیر کی بدلتی صورتحال مسلمانوں کی شکست وریخت اخلاقی اقدار کی پائمالی اور ان کا علمی وعملی سطح پر زوال وغیرہ احوال کو مختلف تجربات وتکنیک کے ذریعہ اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔

ان کے افسانوں کی اہم خصوصیت ان کی تکنیک ہے جس میں جیومیٹریکل Geometrical تکنیک کے تحت افسانے ''رخش پا۔ عکس فنا'' پیش کئے جاسکتے ہیں ۔علم الاعداد کی تکنیک میں ''اسیر ہندسہ اور ہندسہ عبث'' افسانے اہم ہیں اور کچھ افسانوں میں ڈرامے کی تکنیک پائی جاتی ہے جیسے افسانہ ''چپی'' تصیح ،ادھورا پیہ، کوچ اور اندیشہ وغیرہ اور جدیدیت کی تکنیک جس میں شعور کی رو Stream of Unions میں اقلیما سے پرے تقیہ بردار، زوال رفت میں پچھلی دھند وغیرہ اہم افسانے رہے ہیں۔

ضلع بیدر میں کوچ افسانوی مجموعہ کے بعد کوئی اور افسانہ مجموعہ منظر عام پر نہیں آیا ہاں کچھ افسانہ نگار اس فن میں اپنی کوششیں جاری رکھے ہوئے ہیں اور کچھ اب خاموش ہیں جن میں ارشاد انجم کا نام بھی آتا ہے آپ کا اصلی نام محمد ارشاد الحق ہے اور قلمی نام ارشاد انجم ۔ وہ کبھی کبھی اپنی بیگم صابرہ کے نام سے اور کبھی م انجم کے نام سے بھی چھپتے رہے ہیں، آپ کا تعلق مقام ہمنا آباد سے ہے۔ ارشاد انجم نے 1961ء میں ادبی زندگی کا آغاز کیا اور شاعری اور افسانہ نگاری میں زورِ قلم آزماتے رہے لیکن آپ کو افسانہ میں زیادہ دلچسپی رہی ہے۔ آپ کے افسانے مختلف رسائل و اخبارات میں چھپتے رہے ہیں ۔جیسے افسانہ ''پھر وہی زلفیں'' ماہانہ عکس ممبئی 1961ء میں (ص 41) میں شائع ۔دولت کے پجاری، عکس ممبئی 1962ء اگست (صفحہ 9) ہارٹ فیل بیسوی صدی دہلی دسمبر 1963ء (صف 83) پھول مرجھا گیا ۔ ماہانہ خاتون دکن حیدرآباد۔ اگست 1965 وغیرہ۔ آپ نے روایتی موضوع کو لیتے ہوئے حسن وعشق کے جذبات فراق ووصال کی مثالیں اپنے افسانوں میں پیش کی ہیں۔ عصر حاضر کی سماجی و معاشرتی بگاڑ پر کچھ طنز بھی کرتے ہیں۔ اپنے کردار کو حقیقی انداز میں حسن وعشق کے ولولے وجذبے سے سرشار کے تحت پیش کرتے ہیں۔ قصہ پن کا خاص لحاظ رکھتے ہوئے سادہ وسلیس زبان استعمال کرتے ہیں۔ ان کا اہم افسانہ ہارٹ فیل ہے جس میں زندگی کے المیہ کو پیش کیا گیا ہے، دولت حاصل کرنے کیلئے انسانی ذہین میں جو کشمکش پیدا ہوتی ہے اس کا مکمل اظہار اس افسانہ میں ملتا ہے۔

پروفیسر خالد کا تعلق بھی طویل عرصہ تک بیدر سے رہا ہے اور ایک زمانے میں خالد سعید بھی افسانے تخلیق کرتے تھے لیکن بہ قول افسانہ نگار، اب ان کے افسانے نایاب ہیں۔

ظہیر احمد خان بھی شہر بیدر کی ایک اہم شخصیت ہیں آپ کرناٹک کالج میں اردو کے استاد ہیں آپ نے بھی افسانے لکھے ہیں جو بقول ان کے حیدرآباد کے مختلف اخبارات میں شائع ہوتے رہے۔ ''پشیماں'' آپ کا زیر ترتیب افسانوی مجموعہ ہے، آپ کے افسانوں میں معاشرہ کے اصلاحی پہلو اور مذہبی تعلیمات ملتے ہیں۔آپ نے اچھے افسانوں میں ضمیر کا فیصلہ، شک، امید کی کرن اور پشیماں کے نام لئے جاسکتے ہیں۔

محمد یوسف اپنا قلمی نام محمد یوسف رحیم بیدری نثر کیلئے میر بیدری شاعری کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ 2/اگست 1969ء کو موضع بھاتمرہ تعلقہ بھالکی ضلع بیدر میں پیدا ہوئے۔ ان کا آبائی وطن الوائی تعلقہ ہمنا آباد ضلع بیدر ہے مگر ایک عرصہ سے ان کا خاندان بیدر منتقل ہوا ہے۔ ادب کا شوق و مشق نے ان کے فن کو پروان چڑھایا ہے۔موجودہ ماحول میں شہر بیدر کی اہم ادبی شخصیت کے طور پر ابھرے ہیں یاران ادب بیدر اپنی انجمن کے بانی و سکریٹری ہیں اور ناقدانہ نظر بھی رکھتے ہیں۔

یوسف رحیم کا پہلا افسانہ ''قلمی دوستی'' ہفت روزہ فلم اڈوانس بنگلور میں 1986ء میں شائع ہوا۔ تجریدیت اور علامتوں کا ماحول ان کے افسانوں میں نہیں ہے۔ زبان کی الجھن و پیچیدگی ان کے ہاں نہیں ملتی۔ یوسف رحیم اپنے فن کی چابکدستی سے معاشرے میں پھیلی ہوئی بدعنوانیوں اور برائیوں پر بے خوف وخطر وار کرتے ہوئے قاری کو ان برائیوں سے آشنا کراتے ہوئے اصلاح کی ترغیب دیتے ہیں، ان کے کردار بڑے جاندار ہوتے ہیں۔کردار کی نفسیات پر ان کی مکمل قدرت حاصل ہے۔ کرداروں کو اس کے سیاق وسباق میں پیش کرتے ہیں۔عمدہ مکالمہ نگاری بھی ان کے افسانوں کا اہم وصف ہے۔ معاشرے میں پھیلے ہوئے ہر طرح کے انسانوں کو اپنے افسانوں میں انہوں نے پیش کیا ہے ان کے افسانوں میں پلاٹ اور بیانیہ کا بھرپور استعمال

ہوتا ہے۔ اسلوب کی عمدگی اور زبان و بیان میں شائستگی و شستگی نے ان کے فن کو اور نکھارا ہے۔ موضوعات کا تنوع ان کے ہاں ملتا ہے۔

رخسانہ نازنین اپنے اصل نام سے ہی افسانے لکھتی ہیں آپ کی پیدائش 28/اگست 1972ء کو شہر بیدر میں ہوئی۔ مڈل کلاس تک ہی تعلیم پائی لیکن ادب کے مطالعہ سے ادبی ذوق کو جلا بخشی ہیں۔ آپ نے ''مسکرا اٹھی حیات'' افسانہ اپریل 1992ء کو مشرقی دلہن میں شائع کیا۔ یہاں سے افسانوں کی رفتار چلتی رہی تقریباً 86 افسانے اب تک مختلف رسائل و جرائد و اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں ان کا افسانوں کا موضوع اصلاح معاشرہ ہے۔ توہم پرستی، بے جا رسم و رواج، عدم مساوات، عشق و محبت کی داستانیں، جہیز کی لعنت، شادی و بیاہ میں بے جا اصراف، آزادی و تعلیم نسواں، جنسی بے راہ روی، حسن و جمال کی تعریف، خودداری، انا کی پاسداری کا احساس، HIV کے اثرات، بیٹے کی چاہت، امیر و غریب کے معاملات وغیرہ موضوعات پر رخسانہ نازنین نے افسانے خلق کی ہیں۔

ہر افسانے میں مقصد کو بڑی اہمیت دیتی ہیں۔ زندگی کے ہر پہلو کو اپنے افسانوں میں پیش کرتی ہیں۔ روزمرہ کے حالات پر ان کی گرفت ہے اور ان حالات کو افسانوی موضوع بناتی ہیں۔ کرداروں کو موقع و محل کی مناسبت سے پیش کرتے ہوئے زبان و بیان کا استعمال کرتی ہیں۔ عام و خواص دونوں تہذیب کی نمائندگی ان کے کردار کرتے ہیں، ہلکے پھلکے واقعات کو چست پلاٹ میں کہتی ہیں اور اسلوب بیان کی عمدگی اور سادہ و سلیس زبان کا استعمال ان کے افسانوں کا اہم وصف ہے۔ انگریزی الفاظ بھی بڑی خوبی سے افسانوں میں استعمال کرتی ہیں۔

ریحانہ بیگم 20 مئی 1961ء کو شہر بیدر میں پیدا ہوئیں، آپ دراصل شاعرہ ہیں اور ریحانہ تخلص استعمال کرتی ہیں اور کچھ افسانوں میں اردگرد کے ماحول کو پیش کرتی ہیں۔ معاشرہ میں پھیلی ہوئی افراتفری، رشتوں کی ٹوٹتی ہوئی آواز دھوکہ بازی، مکاری، جیسے معاملات کو اپنے افسانوں میں موضوع بحث بنایا ہے۔ خلوص و محبت، ایثار و قربانی انسانی ہمدردی کو تلاش کرتے نظر آتی ہیں۔

بے جوڑ شادیاں، سوتیلی ماں کا ظلم، شک کا ماحول اور اس کے نتائج وفا و جفاء کی کشمکش، عورتوں کی خود پرستی اور حسن پرستی کو اپنے افسانوں میں بڑی اہمیت دیتی ہیں۔ ان کے کرداروں کی دوا تلاش کرتے ہوئے دکھائے دیتے ہیں۔ گھریلو ماحول میں ساس بہو، نند و بھاوج کے مسائل پر ان کی نظر ہے۔

معمولی انداز کے کردار خلق کرتی ہیں۔ سادہ اسلوب بیان ان کے افسانوں کا وصف ہے۔ گھریلو مسائل کو کرداروں کے ذریعہ اور کبھی کبھی سوال و جواب کے انداز میں پیش کرتے ہوئے کہانی کو آگے بڑھاتی ہیں۔ پلاٹ میں جھول نظر آتا ہے۔ منظر کشی کا فقدان ان کے افسانوں میں ہے۔ لیکن کہانی پن کا تاثر مل جاتا ہے۔ موضوعات میں نیا پن نہیں ہے ان کے افسانوں میں۔ کون یہ شخص، درد کا رشتہ، بڑے گھر کی بیٹی ہیں ان میں درد کا رشتہ اہم افسانہ ہے۔

مشتاق احمد مشتاق کا تعلق ضلع بیدر کے مقام بگدل سے ہے آپ نے بھی کچھ افسانے لکھے ہیں اور ان کا افسانہ ''راز'' روزنامہ منصف مین شائع ہوا ہے اس افسانہ میں تہذیبی تصادم اور ذہنی وفکری خلیج نظر آتی ہے جس میں اولاد کی نافرمانی کا منظر پیش کیا گیا ہے۔

شاہ فصیح اللہ قادری عرف مقیت قادری وظیفہ یاب ٹیچر ہیں، شہر بیدر سے ان کا تعلق ہے کچھ افسانے لکھے ہیں طنز و مزاح اور انشائیہ نگار بھی ہیں۔ ان کا ایک مختصر ترین افسانہ ''نا جانے تم کب آؤ گے'' روزنامہ منصف میں شائع ہوا۔ جس کا موضوع بعد شادی کے خلیج ممالک جانے والے کی داستان ہے

چلتے چلتے کچھ اور افسانہ نگاروں کا تذکرہ ضروری سمجھتا ہوں، شہر بیدر میں مرحومہ طہورہ بیدری کا نام آتا ہے جن کے افسانے رسالے ہیروازم میں تقریباً 1980ء کے قریب شائع ہوئے اور پھر مرحومہ قریشیہ نکہت کا بھی نام آتا ہے جو ہفت روزہ آفتاب بیدر میں شائع ہوتی رہیں۔ مرحومہ شرف النساء بیگم زوجہ نثار احمد کلیم نے افسانے لکھے تھے۔ ریحانہ تبسم تاج بھی لکھتی ہیں ان کا افسانہ ''جواب دو'' فروری 1983ء کو زرین شعاعیں میں شائع ہوا تھا۔ وکیل ساجد شمیم نثار ارم، صبیحہ خانم، عبداللہ مدثر کے نام آتے ہیں اور بسواکلیان کے شاعر ڈاکٹر مقیم باگ نے بھی افسانے لکھے ہیں۔ ☐☐

حیدرآباد کرناٹک میں اردو رباعی گوئی

ڈاکٹر منظور احمد دکنی

مہمان لیکچرار، شعبۂ اردو و فارسی، گلبرگہ یونیورسٹی، گلبرگہ

رباعی کی اہمیت ہر دور میں محسوس کی جاتی رہی ہے۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کلاسیکی صنف سخن میں بات کو اختصار سے پیش کیا جاسکتا ہے جو انسان کی ضرورتوں کے عین مطابق ہے۔اس لئے یہ کلاسیکی صنف آج بھی زندہ و تابندہ ہے۔رباعی کو ترقی یافتہ بنانے میں شیخ ابوالحسن خرقانی، ابوسعید ابوالخیر، فریدالدین عطار، رومی، رودکی، خیام اور سرمد کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ان حضرات نے فارسی زبان میں رباعی کی ابتداء کی اور اس میں کمال پیدا کیا۔فارسی کی یہ روایت بھی دوسری اصنافِ سخن کی طرح اردو میں رائج ہوئی۔صنفِ رباعی کی روایت کے ضمن میں ڈاکٹر سلام سندیلوی لکھتے ہیں:

> ''یہ امر مسلمہ ہے کہ اردو رباعیات نے اپنا چراغ فارسی سے روشن کیا لہٰذا اردو رباعی میں بھی یہی سارے مضامین داخل ہو گئے، لیکن اس کا مطلب یہ بالکل نہیں ہے کہ اردو رباعی فارسی رباعی کا مکمل چربہ ہے اردو رباعی فارسی کی محض آواز بازگشت ہے اردو رباعی کی رگوں میں فارسی کا خون ضرور دوڑ رہا ہے مگر اس نے سانس ہندوستان کی فضا میں ہی لی ہے۔لہٰذا ہندوستانی اثرات سے بچنا اس کے لئے محال تھا اردو رباعی ہندوستان کے ہر دور کی خصوصیات تغیرات اور انقلابات کی سچی تصویر رہی ہے۔اگرچہ اردو رباعی میں ہندوستان کا رنگ اور اس کا مزاج شامل ہے پھر بھی اس

حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو رباعی کے قالب میں فارسی کی روح جلوہ گر ہے''۔

(اردو رباعیات۔ از ڈاکٹر سلام سندیلوی ص ۔۱۰۴۔)

دکنی دور میں کئی شعراء اس صنف میں طبع آزمائی کرتے رہے۔ اس سلسلہ میں محققین نے حضرت بندہ نواز اور ان کے ہم عصروں کے چکی ناموں، گیتوں کے علاوہ رباعی کی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ اس عہد میں مخدوم بندہ نواز کی رباعیوں کے علاوہ فیروز شاہ بہمنی کی ایک رباعی کا نمونہ ملتا ہے تذکرہ نگاروں کا خیال ہے کہ فیروز شاہ بہمنی فارسی اور دکنی دونوں زبانوں میں شاعری کرتا تھا اور اس کا ایک دیوان بھی تھا جو زمانے کی نذر ہو چکا ہے۔ فیروز شاہ کی رباعی کا نمونہ ملاحظہ فرمایئے:

تجھ مکھ چندا جوت دے سارا جیوں　　　تجھ کان پہ موتی جھلکے تارا جیوں
فیروزی عاشق کوں ٹک لک چا کن دے　　　تج شوق ادھر لب سے شکر یارا جیوں

عہد بہمنی میں حضرت گیسودراز کی گلبرگہ آمد نے یہاں کے علمی و ادبی ماحول کو اعتبار بخشا۔ اگرچہ محققین کلام بندہ نواز کو منسوب شدہ کلام قرار دیتے ہیں تاہم تذکرہ نگاروں نے ان سے منسوب رباعیوں کی مثالیں بھی درج کی ہیں:

پانی میں نمک ڈال بسا دیکھنا اسے　　　جب گھل گیا نمک تو نمک بولنا کسے
یوں کھوئے خودی اپنی خدا سات محمد　　　جب گھل گئی خودی تو خدا بولنا کسے

بہمنی دور کے دیگر اکابر شعراء میں سید محمد اکبر حسینی، فخر دین نظامی،، صدر الدین، عبداللہ حسینی،،، شیخ آذری، فیروز بیدری، مشتاق بیدری،، لطفی، ملا نظیری،، ملا سامعی، اور محمود بن ابراہیم وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ بعد کے ادوار میں بھی رباعی گوئی کا سلسلہ رہا ہوگا۔ ان ادوار میں اس علاقے سے، سید محمد حسینی، سیوا، راماراؤ، اور قاضی محمود بحری وغیرہ کے نام تاریخ ادب اردو میں محفوظ ہیں۔ مگر ان کا چیدہ چیدہ کلام دستیاب ہوا ہے جس میں رباعیات کے نمونے

نہیں ملتے ؟۔سُقوطِ بیجاپور کے بعد گلبرگہ آصف جاہی سلطنت کا حصہ بنا رہا۔

سلطنتِ آصفیہ کے قیام سے پولیس ایکشن کے طویل عرصہ میں حیدرآباد کرناٹک میں کئی نامور شخصیات کی آمد ہوئی جس کی وجہ سے یہاں کی ادبی وتخلیقی فضا کو اعتبار ملا۔ چنانچہ آصف جاہی دور میں شاہ معین الدین خاموش، غلام مصطفیٰ عشقی، رفیع الدین رفعت، حبیب اللہ وفا، گل محمد شور' احمد شاب' چاق گلبرگوی، تاب سہروردی، اسمٰعیل شریف ازل، جذب عالم پوری، نامی کہسواری کے علاوہ احمد حسن طالب منہاج الدین شوکت، مختار ہاشمی، حافظ عبدالرشید، فضل گلبرگوی، نیاز گلبرگوی، وغیرہ نے سقوطِ حیدرآباد تک اس علاقے کی ادبی وشعری منظر نامے کو عروج بخشا۔ ان شعراء میں کچھ شاعروں نے آزادیٔ ہند کے بعد بھی اس علاقے کی نمائندگی کرتے رہے اور کچھ اس کارواں میں شامل بھی ہوتے رہے۔ جن میں شور عابدی، سلیمان خطیب، عطا کلیانوی، دامودر پنت ذکی' رشید احمد رشید، عبدالغفور خاک، قتال احمد بلہار، مدنا منظر، رحمٰن جامی، سرور مرزائی' وقار خلیل، نثار احمد کلیم، خالد سعید، حامد اکمل، صغریٰ عالم، خلیل مجاہد، ماجد داغی وغیرہ نمایاں رہے۔ ظاہر ہے ان شعراء نے نظم اور غزل کے ساتھ ساتھ رباعیات میں بھی اپنے فن کے نقوش یا دگار چھوڑے ہیں مذکورہ بالا شعراء میں چند ایک کے انتخاب (شعری) شائع ہو چکے ہیں جن میں رباعیات کے چند نمونے بھی مل جاتے ہیں۔ جس کی کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

جب یہ ہے کہ انسان کی بنیاد ہی مٹی   مٹنے سے بچے کیسے یہ کیونکر نہ ہو مٹی
مٹنا جو نہ چاہئے تو کرے کام یہ اچھے   ہے ہوش اے انسان کہ گم ہے تیری مٹی

(تاب سہروردی)

جلوہ ہے ہر اک گل میں نمایاں تیرا   ہر خار میں اک رمز ہے پنہاں تیرا
کہتے ہیں جسے دہر میں نامی سب لوگ   اس باغ میں ہے مرغِ خوش الحاں تیرا

(نامی کوہ سواری)

کہتی ہے یہ مے نوش کو مے جوش میں آ
ساقی کا یہ کہنا ہے کہ تو ہوش میں آ
میں کہتا ہوں ہوش و جوش کہتے ہیں کسے
بتلاؤں تجھے ذرا تو آغوش میں آ

(اسمٰعیل شریف ازل)

جسم و لحم و پوست کو وجود نہیں کہتے
صورت و شکل کو شہود نہیں کہتے
یہ بتائے گئے ہیں سب برائے نمود
معدوم و بود کو بود نہیں کہتے

(مختار ہاشمی)

جگ میں انساں پاک باز و پاک طینت چند ہیں
صاحبِ خلق و مروت نیک سیرت چند ہیں
حاملِ اوصافِ حسنہ، خیر خواہِ ملک و قوم
عدل گستر، امن پرور، رائے کیرت چند ہیں

(منہاج الدین شوکت)

اس دختِ زر کے دام ہم سے پوچھو
میخانوں کے سارے نام ہم سے پوچھو
انگور کی بیٹی ہوئی کس کس پہ حلال
کس کس پہ ہوئی حرام ہم سے پوچھو

(شور عابدی)

علی کا نام نامی نامِ داور
علی کا نور ہم نورِ پیمبر
علی کی شان شانِ حق کی مظہر
علی کا مرتبہ اللہ اکبر

(طالب سہروردی)

فرقتِ نصیب غم نہ اٹھائیں تو کیا کریں
بزمِ خیال و دل نہ سجائیں تو کیا کریں
مانا کہ تم قریب ہو، آنکھوں میں دل میں ہو
پھر دولتِ وصال نہ پائیں تو کیا کریں

(سلیمان خطیب)

وہ دل جسے حاصل نہیں نسبتِ دل سے
تعبیر کیا جائے گا مشتِ گل سے
اور قبلہ خامیانِ طلب ہے وہی دل
جو ذرہ ہے مربوط مہہ کامل سے

(سرور مرزائی)

بے درد سے حالات کا رونا روئیں
اب کون سے صدمات کا رونا روئیں
ہر بات میں ہونے سے رہی تبدیلی
کس شخص سے کس بات کا رونا روئیں
(رحمٰن جامی)

آئینے سے الجھو یا سر پیش کروں
قاتل سے نہ خود کو کم تر پیش کروں
سر جائے کہ رہ جائے تماشا کیسا
قامت رہے باقی وہ ہنر پیش کروں
(خالدسعید)

تصویر تری مجھ کو سمجھتا ہے جہاں
ایقان سے بڑھ کر ہے یہ بے دیدہ گماں
ایسا تو کوئی روپ عطا کر مجھ کو
بے مورتی، بے سمتی ہو جس کی پہچان
(حامدا کمل)

جب کبھی آتا ہے قوموں پر زوال
نیک و بد سمجھیں گے کیا امر محال
منتشر علماء رہیں ہو بے حیائی کو فروغ
علم و عزت چھین لے گا ذوالجلال
(خلیل مجاہد)

انصاف کا آئینہ اٹھا کر دیکھو
سچائی ہے آنکھیں نہ چرا کر دیکھو
تنقید ہو، تحقیق یا داغی تاریخ
جو دیکھنا ہو بیر ہٹا کر دیکھو
(ماجدداغی)

مندرجہ بالا رباعیات کے مطالعہ سے یہ بات مترشح ہورہی ہے کہ اردو رباعیات ،میں فارسی کے موضوعات کا اثر زیادہ ہے۔ وہ تمام موضوعات جو فارسی میں مروج ہیں اردو رباعی میں بھی اس کی جھلک نظر آتی ہے۔عشقیہ رباعیوں میں تصوف وتغزل، مذہبی رباعیات میں صوفیانہ وعرفانی کیفیات، فلسفیانہ رباعیوں میں حیات وکائنات، فناوبقا کے رموز کے ساتھ ساتھ پند و نصائح ، اخلاق واقدار، سماجی حالات وواقعات ،فکرواحساس، جدت وندرت، روایت وجدت اورزبان وبیان کی تازگی نمایاں طور پر نظر آتی ہے

بیسویں صدی کے شعری منظر نامہ میں کئی شعراء ادبی اُفق پر نمودار ہوئے۔ جن میں

غزل گو بھی تھے اور نظم نگار بھی اور کچھ شاعر صنفِ رباعی کی طرف بھی مائل رہے۔اس دور کے شعری منظر نامے میں ایسے رباعی گو شاعر جن کی رباعیات کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں ان میں راگھویندر راؤ جذب عالم پوری، عطا کلیانوی، راہی قریشی ،اور اکرم نقاش شامل ہیں۔

عربی، فارسی اور سنسکرت زبانوں کے ماہر راگھویندر راؤ اور جذب تخلص، عالم پور (رائچور) کے متوطن رہے ہیں۔جن کی کئی شعری تصانیف منظر عام پر آ چکی ہیں۔۔جذب کو رباعی گوئی میں دسترس حاصل تھی۔ رباعی کے دو مجموعے ،ارمغان جذب (۱۹۳۷ء) اور رباعیاتِ جذب (۱۹۴۱ء) شائع ہو چکے ہیں۔ان کی رباعیوں میں فکر، فلسفہ اور زبان کی شستگی نمایاں ہیں۔بقول نصیر الدین ہاشمی:

> ''صوفی مشرب ہیں۔ہندو ویدانت کا خوب مطالعہ کیا ہے۔اس طرح تصوف اور ویدانت کو ملا کر رباعی موزوں کرتے ہیں۔اب تک دو تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔کلام میں اثر ہے۔ان کی رباعیوں میں اخلاق اور نصیحت کے انمول نگینے ہیں۔کلام صاف اور عام فہم ہوتا ہے۔''

(دکن میں اردو، نصیر الدین ہاشمی (۱۹۸۵) ص ۷۰۲)

کر جاتی ہے تاثیر بروں کی صحبت　　یعنی کہ بگڑ جاتی ہے اچھی خصلت
ملتے ہی سمندر میں وہ کھاری ہوگا　　گنگا کا وہ پانی ہے جو میٹھا ہوگا

جس میں من و تو نہ ہو وہ من پیدا کر　　اقوام کا خادم ہو وہ من پیدا کر
وہ شمع جلا کہ جو کبھی نہ بجھ سکے　　جس کو نہ خزاں ہو وہ چمن پیدا کر

ہوتی نہ تری ذات تو رب کوئی نہ تھا　　تسکین دو عالم کا سبب کوئی نہ تھا
اس وقت بھی ہوگا نہ رہے جب کوئی　　اُس وقت بھی موجود تھا جب کوئی نہ تھا

عطا کلیانوی منفرد رباعی گو کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔اگر چہ غزل میں بھی طبع آزمائی کرتے رہے تاہم رباعی گو کی حیثیت مسلم رہی ہے۔ ان کی رباعیوں کا مجموعہ وجود و شہود (۱۹۷۳ء) شائع ہو چکا ہے۔اس کے علاوہ موصوف کی کئی رباعیات (اردو و فارسی) غیر مطبوعہ ہیں ۔عطا کلیانوی کی رباعیات فکر وفن کے ساتھ ساتھ متصوفانہ رنگ و آہنگ سے مزین رہی ہیں۔اس سلسلہ میں ڈاکٹر اکرام باگ رقم طراز ہیں:

''عطا کلیانوی کا شعری کینوس امجد کے مقابلہ میں زیادہ وسیع، گہرا اور آفاقی ہے۔امجد کے ہاں اخلاقیات اور رشد و ہدایت کا منظر نامہ ملتا ہے۔جبکہ عطا کلیانوی کے ہاں تصوف ،عرفان کی کائینات روشن ہے۔وجود سے متعلق عطا کا اپنا مخصوص فکر ونظر ہے۔ان کی شاعری کا سرسری جائزہ ہی اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ شاعر کوتصوف اوراس کے متعلقہ مضامین سے گہری وابستگی ہے۔''

(عطا کلیانوی،ڈاکٹر اکرام باگ،ص ۱۰۱)

ہیں علم کے اسرارِ نہاں زیروزبر — اک پیش کی خاطر ہے یہاں زیروزبر
میں زیروزبر کے راز کہہ دوں تو سہی — ڈر ہے کہ نہ ہو جائے جہاں زیروزبر

ٹھہرا میری گویائی کا مرکب جبریل — انفاس میں صور بن گیا اسرافیل
جنبش نہ ہوئی عمرِ ابد کو میری — دیتا رہا موت کو صدا عزرائیل

اظہار سے قاصر ہوں کہ کیا کیا دیکھا — اللہ کی قدرت کا تماشہ دیکھا
کہتا ہوں قسم کھا کے میں بت کی زاہد — بت خانہ میں جلوہ خدا کا دیکھا

راہی قریشی اس عہد کے اہم رباعی گو کی حیثیت رکھتے ہیں جن کا ایک رباعی کا مجموعہ

''چارسو'' 1995ء میں شائع ہو چکا ہے جس میں 186 رباعیاں شامل ہیں۔خیال اغلب ہے کہ حیدرآباد کرناٹک سے عطا کلیانوی کے بعد رباعی گوئی میں راہی قریشی کی اہمیت مسلم رہی ہے ان کی رباعیاں کلاسیکی فکر کی غمازی کرتی ہیں۔ان کی رباعیوں کے مضامین میں تنوع پایا جاتا ہے جس میں ان کا تجربہ سماجی شعور اور فکر ان کی قادرالکلامی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔چند رباعیات پیش کی جاتی ہیں:

اک خوف یہاں شام وسحر لگتا ہے　　صحرا کی طرح اپنا ہی گھر لگتا ہے
کیا وقت کی گردش ہے کہ اب دنیا میں　　مرنے سے نہیں جینے سے ڈر لگتا ہے

یہ زیست عجب رنگ دکھانے آئی　　ماحول کی ظلمت کو بڑھانے آئی
ہر صبح اجالوں کی بنی ہے قاتل　　ہر رات چراغوں کو بجھانے آئی

اخلاص وروابط ہے زیادہ لوٹا　　تنہائی بڑی تھی ساتھ سبھی کا چھوٹا
کس طرح مراسم کا تحفظ کرتے　　اک لمحے میں اک عمر کا رشتہ ٹوٹا

ہمارے علاقے کے منفرد غزل گو اکرم نقاش ادھر چند سالوں سے نظمیں اور رباعیات کہہ رہے ہیں۔ان کی رباعیات کا مجموعہ ''یہ حشر سی برسات'' کے نام 2010ء میں شائع ہو چکا ہے جس میں 100 رباعیاں شامل ہیں۔ان کی رباعیاں جدید فکروفن کی آئینہ دار ہیں:

آواز دوں خود کو بھی پکاروں اک دن　　کھائی میں ذرا پاؤں اتاروں اک دن
چیخوں سے اٹے دشت سے الجھوں کب تک　　جنگل میں کوئی شام گزاروں اک دن

بہتی تھی کوئی آبِ رواں پر کشتی　　کچھ دور بسا کرتی تھی کوئی بستی
بے رنگ فضا چار طرف دور تلک　　بے روح بدن کھینچ رہی ہے ہستی

صحرا میں گلا بوں کو کھلانا چاہے پانی پہ کوئی نقش بنانا چاہے
لیتا ہے کہاں ہوش کے ناخن یہ دل ویرانے میں آواز لگانا چاہے

❖

غرض حیدرآباد کرناٹک کی رباعی گوئی کے مطالعہ کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ ان رباعیوں میں جہاں فنی محاسن بدرجہ اتم موجود ہیں، وہیں موضوعات میں تازگی، جدت وتنوع بھی پایا جاتا ہے۔ بہر کیف اردو کی شعری کائنات روز بروز وسعت اختیار کر رہی ہے اور اصناف سخن میں جدت کا عمل بھی جاری ہے اس جدت سے کچھ اچھے نتائج بھی برآمد ہو رہے ہیں لیکن ان اصناف میں رباعی ایک مرصع ساز صنف سخن رہی ہے جو آج بھی اپنے عاشقوں کا انتظار کر رہی ہے۔ ◻◻

حیدرآباد کرناٹک کا اردو افسانہ

ڈاکٹر ہاجرہ پروین
لیکچرار، شعبہ اردو، سی۔ کیا ب ڈگری کالج فار ویمنس، بیجاپور

دو دہے قبل شمس الرحمٰن فاروقی نے یہ شوشہ چھوڑا کہ

(۱) یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے کہ افسانہ ایک فروعی صنف ادب ہے۔

(۲) افسانہ ایک چھوٹی صنف ادب ہے

(۳) افسانہ ایک معمولی صنف ادب ہے۔

(۴) اصل الاصول تو یہ ہے کہ افسانہ اتنی گہرائی اور باریکی کا متحمل ہی نہیں ہوسکتا جو شاعری کا وصف ہے۔ (افسانہ کی حمایت میں: 1982)

تب افسانوی تنقید کے ٹھہرے پانیوں میں ایک طوفان سا آ گیا اور اس کے ردعمل میں افسانوی تنقید کا باضابطہ آغاز ہوا۔ وارث علوی نے شمس الرحمٰن فاروقی کے بیانات کے جواب میں ایک پوری کتاب ''فکشن کی تنقید کا المیہ'' تحریر فرمائی۔ پھر تو افسانوی تنقید کا باب کھل گیا۔ فاروقی سے پہلے بھی اہم افسانوی مضامین گوپی چند نارنگ نے تحریر کئے تھے مگر باضابطہ سنجیدہ مطالعہ کا آغاز بہرحال مذکورہ شوشہ کو جاتا ہے۔ فاروقی کے بیان کو میں نے شوشہ اس لئے کہا کہ خود فاروقی نے بعد میں لکھا ہے کہ

''انسانی سائے کی جتنی باریکیوں کا، جتنی باریکی کے ساتھ افسانہ خبر لاتا ہے، اتنی گہری خبر شاعری سے ممکن نہیں ہے''

اردو کی دیگر اصناف کی طرح افسانہ کوئی جامد صنف نہیں رہا۔ حالات اور رجحانات کے زیر اثر اس میں تبدیلیاں وقوع پذیر ہوتی رہیں۔ اردو افسانہ کی ایک صدی اس حقیقت کی شاہد ہے۔

حیدر آباد کرناٹک کے افسانے میں بھی روایتی، ترقی پسند، جدید اور مابعد جدید نظریات اور عناصر کو دیکھا جاسکتا ہے۔

ادب کو کسی جغرافیائی یا علاقائی حدود میں قید نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے بعض اوقات کسی خطہ یا علاقہ کو وہ اہمیت نہیں دی جاتی جس کا وہ بلاشبہ مستحق ہوتا ہے پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حیدر آباد کرناٹک کے افسانہ نگار نے بھی ادب کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دی اور دے رہے ہیں۔

صنف افسانہ کے بارے میں پہلی بات یہ کہی جاسکتی ہے، افسانہ ایک نثری فن پارہ ہے۔ ناول فرد کے اطراف پھیلی ہوئی زندگی اور معاشرے کا آئینہ دار ہے جبکہ افسانہ فرد کے واسطے سے زندگی اور معاشرے کی صورتحال کو پیش کرنے کا نام ہے۔ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو ناول نگار زندگی اور معاشرے کا مشاہدہ دوربین سے کرتا ہے۔ افسانہ نگار اسی عمل کو خوردبین کے ذریعہ پیش کرتا ہے۔ انسان کی زندگی اور کائنات سے قریبی تعلق پیدا کر کے زندگی کو سمجھنے اور اس کو بہتر طور سے گذارنے کا ہنر سب سے زیادہ افسانہ نے عطا کیا ہے۔ شرط اس بات کی ہے کہ اس میں معنی ہوں۔

دل وہ معصوم کہ ہر شب کو کہانی مانگے　　　عقل ہر صبح کہانی میں معانی مانگے

حیدرآباد کرناٹک کا روایتی افسانہ:

روایت ایک ورثہ ہے جو نسل در نسل منتقل ہوتا رہا ہے۔ یہ ایک مستقل امر ہے۔ اردو نثر کی تاریخ میں گلبرگہ کو تاریخی تناظر میں اولیت کا مقام حاصل ہے۔ حیدر آباد کرناٹک میں بھی گلبرگہ، بیدر، رائچور کو تاریخی امتیاز حاصل رہا ہے۔

مولوی سید عباس حسین لطفی 32-1930 کے ادیب رہے وہ افسانہ نگار بھی تھے اور شاعر بھی ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے ہم مکتب تھے اور انہیں افسانہ نگاری سے فطری شغف تھا۔ مگر ان کا کوئی افسانہ تلاش کے بعد مجھے حاصل نہ ہوسکا۔ درجہ انہیں حیدر آباد کرناٹک کا پہلا افسانہ

نگار قرار دینے میں کوئی قباحت نہیں اور اس ضمن میں تلاش وتنقید کا باب کھلا ہے۔ آزادی سے پہلے فضل گلبر گوی اور نیاز گلبر گوی کو افسانے میں شہرت حاصل تھی۔

بیدر کی ریحانہ تبسم بھی ایک اچھی افسانہ نگار تھیں مگر ان کا کوئی افسانوی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ آعظم عرفان کا تعلق رایچور سے ہے جن کا افسانوی مجموعہ ''سنگلاخ زمینوں کا چاند'' 1980 کے قریب شائع ہوا۔ خالد سعید نے شاعر اور نقاد کی حیثیت سے ملک گیر شہرت حاصل کی۔ بہت کم افسانے لکھے، مگر افسانوں میں پختگی نمایاں ہے۔

شریف اسلم کا تعلق بھی رایچور سے ہے۔ م صبوحی بھی کا تعلق رایچور سے ان کے افسانے بیسویں صدی میں شائع ہوتے تھے۔ روبینہ تسنیم قادری نے اچھے اور کامیاب افسانے لکھے اور لکھتیں تو شاید بہت آگے جاتیں۔ خالد قریشی کے افسانے اخبارات میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

سمیرا ناظم حیدرآباد کرناٹک کے افسانے کا ایک اہم نام ہے۔ ان کا افسانوی مجموعہ ''خواب گہن اور کلیاں'' اور دوسرا ''خرمذی رشتے'' شائع ہو چکے ہیں اور ان مجموعوں کو کافی مقبولیت بھی حاصل ہوئی ہے۔ لفظوں کی صناعی کا شاہکار ہیں ان کے افسانے۔ ابھرتی ہوئی فن کارہ میں کرداروں کی تشکیل غیر معمولی طور سے کرتی ہیں۔ جزئیات نگاری میں ان کو کافی مہارت حاصل ہے۔

شمیم ثریا نے افسانہ نگاری میں بہت دیر سے قدم رکھا۔ ان کے افسانے نقادانِ ادب کو متحرکرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں مگر انہوں نے افسانوی سخن کو جاری نہیں رکھا۔ وحید انجم کا تعلق گلبرگہ سے ہے افسانوی مجموعہ ''کڑی دھوپ کا سفر'' شائع ہوا۔ افسانوں کی نمایاں خصوصیت زور دار مکالمہ نگاری ہے۔ شاہد فریدی کا افسانوی مجموعہ ''کانٹوں کا سفر'' بھی شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ نفیس بانو، رعنا متین، آفتاب صمدانی وغیرہ نے بھی افسانے لکھے۔ اور ان کے افسانے آل انڈیا ریڈیو گلبرگہ سے نشر ہوتے رہے۔

حیدرآباد کرناٹک کا ترقی پسند افسانہ :

اردو زبان کی ترقی پسند افسانے کے آغاز میں گلبرگہ کا اہم رول رہا ہے۔افسانے کے باب میں ابراھیم جلیس کا نام لیا جاتا رہا ہے۔جلیس کا تعلق گلبرگہ سے تھا اور انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز یہیں سے کیا۔ان کی پہلی تخلیق زرد چہرے 1943ء میں منظر عام پر آئی پھر ان کا قلم نہیں رکا۔کئی افسانوی مجموعہ منظر عام پر آئے۔ان کے افسانے ہنگامی نوعیت کے ہوتے تھے ان پر جزباتیت اور خطابت کے پیرائے غالب تھے اور وہ ترقی پسند نظریات کے حامی تھے۔

زینت ساجدہ ابتداء ہی سے ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہیں وہ ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے اس وقت منظر عام پر آئیں جب جیلانی بانو اور واجدہ تبسم کو کوئی نہیں جانتا تھا۔پہلا افسانوی مجموعہ ''جل ترنگ'' 1947ء میں شائع ہوا۔پھر وہ مسلسل افسانے لکھتی رہی ان کے افسانوں کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے نسوانی کرداروں کو ایک ہیر کے روپ میں اجاگر کیا۔

شکیب انصاری نے بہت کم افسانے لکھے۔افسانوں کا لب ولہجہ شائستہ انداز بیاں قاری کو متوجہ کرتا ہے افسانہ ''بقا کے ستون'' نمائندہ افسانوں میں شامل کیا جا سکتا ہے کوئی مجموعہ تا حال شائع نہیں ہوا۔

ریاض قاصدار گلبرگہ کے نامور افسانہ نگاروں میں سے ہیں، پہلا افسانہ ''شب خون'' 1966ء شائع ہوا۔تا حال کوئی افسانوی مجموعہ شائع نہیں ہوسکا۔ان کے افسانوں میں ناصحانہ اور صحافیانہ رنگ جھلکتا ہے۔

جلیل تنویر کا تعلق بیدر کے ضلع ہمنا آباد سے ہے افسانوی مجموعہ ''حصار'' 1983ء شائع ہوا۔ترقی پسند رجحانات سے متاثر رہے۔انسانی دردمندی اور انسانی المیہ کو معاشرتی حالات میں دیکھتے ہیں جہاں مجبوری اور بے بسی نظر آتی ہے تو ان کے افسانوں کے کردار احتجاج پر اتر آتے ہیں۔

کوثر پروین شمالی کرناٹک کی جیلانی بانو کی حیثیت سے جانی جاتی ہیں۔گلبرگہ کی پہلی صاحب افسانہ خاتون میں جن کے دو افسانوی مجموعہ ''ہلچل سی کوئی'' اور ''بن باس'' شائع ہو چکے ہیں۔طویل افسانوی سفر جاری ہے۔افسانوں کی نمایاں خصوصیت روایت اور عصریت کا فنکارانہ امتزاج ہے۔وہ مسائل کو اپنے ساجی اور تہذیبی معاشرے سے ابھارنے کا سلیقہ خوب جانتی ہیں اور موضوع کے تناظر میں کہانی کے ارتقاء کے ہنر سے بھی واقف ہیں۔

ناظم خلیلی حیدرآباد کرناٹک کے افسانے کا ایک اہم نام ہے ان کے افسانوں کے اکثر کلائیمکس چونکا دینے والے ہوتے ہیں تا حال کوئی افسانوی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔حیدرآباد کرناٹک میں آج بھی ترقی پسند افسانہ لکھا جارہا ہے۔

جدید مابعد جدید افسانہ:

گلبرگہ میں اردو کا ماضی سرسبز رہا ہے، یہاں حال اور مستقبل بھی بہتر ہے یہاں ایسے کئی افسانہ نگار موجود ہیں جنہوں نے جدید اور مابعد جدید افسانے کیلئے ملک گیر شناخت بنوائی ہے۔اس سلسلہ میں ایک نام اکرام باگ کا ہے،افسانوی مجموعہ ''کوچ'' ۱۹۸۶ء منظر عام پر آچکا ہے اور افسانے شب خون میں شائع ہوتے رہے ہیں۔اکرام باگ نے اس طویل مدت میں بہت کم لکھا۔افسانوی فارم ہیت میں زبردست اور انوکھے تجربے کیئے۔ان تجربوں نے جدید افسانوی فن میں جدید تجرباتی افسانوں کی بنیاد ڈالی۔افسانوں کو ریاضیات اور حیاتیاتی اصطلاحات سے سنوارا گیا جو اپنے آپ میں منفرد مثال ہے۔

حکیم شاکر کا پہلا افسانہ طاقت پرواز شب خون سے شائع ہوا۔دو تین افسانے لکھے مگر شاعری کی طرف راغب ہو گئے۔حمید سہروردی جدید افسانے کا ایک اور نام ہے جن کے تین افسانوی مجموعہ شائع ہو چکے ہیں۔(۱) ریت ریت لفظ 1980 (۲) عقب کا دروازہ 1987 (۳) بے منظری کا منظر نامہ 1997۔غیر مطبوعہ افسانے کافی تعداد میں ہیں۔ان پر یہ الزام بھی لگایا جاتا رہا ہے کہ ان کے افسانے نثری نظموں کے فارم لیے ہوئے ہیں۔یہ صحیح ہے کہ حمید سہروردی

نے کئی افسانوں میں شعری اسلوب کا سہارا لیا ہے۔

بشیر باگ کا پہلا افسانہ شب خون میں شائع ہوا۔ (1968) جدیدیت کی لہر میں آپ نے کئی افسانے لکھے، ادبی دنیا کو اپنے انوکھے اسلوب سے متوجہ کیا۔ بہت سالوں سے خاموش ہیں۔لطیف بنیادی طور پر شاعر ہیں لیکن افسانے بھی انہوں نے لکھے۔ان کے افسانوں میں وہ سارے عناصر موجود ہیں جنہیں تجریدی افسانے کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

حامد اکمل نے بھی اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا۔ پہلا افسانہ 1968 میں شائع ہوا۔ بہت کم افسانے لکھے۔ان کے یہاں ہر طرح کے افسانے مل جاتے ہیں ''کرفیو کا لک کتا'' مشہور افسانہ جس کا موضوع فسادات ہیں۔علیم احمد نے اپنا افسانوی سفر 1973 میں شروع کیا۔افسانے مختلف رسالوں میں شائع ہوتے رہے۔ مابعد جدید افسانہ نگار ہیں۔مابعد جدید افسانے کی نمائندہ مثال نجم باگ بھی ہیں پہلا افسانہ شب خون میں شائع ہوا۔ افسانوں میں کردار نگاری کا جوہر اور مکالمہ نگاری کا حسن ملتا ہے۔کوثر پروین ہمیرا ناظم کے افسانے بھی توجہ طلب ہیں۔

امجد جاوید مابعد جدید افسانہ نگار ہیں۔1985 سے افسانہ نگاری کی ابتداء کی۔شب خون میں افسانے شائع ہوتے رہے۔افسانوی مجموعہ زیر ترتیب ہے۔ مابعد جدید افسانے کے لوازمات پوری طرح واضح ہیں نظریاتی وابستگی کے بغیر افسانے خلق کرتے ہیں۔اکرام باگ اور حمید سہروردی نے ابہام کی جو فضاء پیدا کی تھی اسے توڑنے میں امجد جاوید کا بڑا ہاتھ ہے۔افسانوں کی نمائندہ خصوصیت فرد کی نفسیات کا آزادانہ مطالعہ ہے۔کردار نگاری بھی کمال کی ہے۔

حیدرآباد کرناٹک میں روایتی، ترقی پسند، جدید مابعد جدید افسانے لکھے جاتے رہے ہیں اور ساتھ ہی مندرجہ ذیل نکات کا احساس ہوتا ہے:

(۱) ابراہیم جلیس وہ افسانہ نگار تھے جن کی کتابوں پر سیاسی وجوہات کی بناء پر پابندی عائد کی گئی۔

(۲) اکرام باگ نے اردو میں پہلی بار افسانوی تکنیک میں جیومٹری اور ریاضیات کو روشناس کروایا۔

(۳) جدید افسانہ میں اینٹی اسٹوری کے باب میں حمید سہروردی کے رول کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

مختصر یہ کہ افسانہ چاہے کسی زمانے کسی علاقے کا کیوں نہ ہو وہ افسانوں کی سرگذشت ہے۔ افسانہ نگاری بھی انہیں انسانوں کے درمیان پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا کہا جاسکتا ہے فن سے فن کار کی شخصیت کا اظہار ہوتا ہے۔ بقول احمد ندیم قاسمی کے یہ شخصیت کسی دور آفت و پہاڑ کی گپھا کی صورت میں وقوع پذیر نہیں ہوتی بلکہ اس خاندان طبقہ اس معاشرے اس قوم اور اس دور کے اثرات کا مجموعہ ہوتی ہے جو ہر انسان پر پڑتے ہیں مگر فن کار پر شدت سے پڑتے ہیں کیونکہ وہ تمام انسانوں سے زیادہ حساس ہوتا ہے۔ یہ تمام باتیں حیدرآباد کرناٹک کے افسانے پر بھی پوری طرح سے صادق آتی ہیں۔ امید ہے حیدرآباد کرناٹک کا افسانوی سفر یوں ہی چلتا رہے گا۔ ▢▢

ضلع بیدر میں اُردو شعر و ادب

(1956ء کے بعد)

ڈاکٹر سیدہ انجم آرا

مہمان لیکچرار، شعبہ اردو و فارسی، پوسٹ گریجویٹ سنٹر، بیدر۔ گلبرگہ یونیورسٹی گلبرگہ

اُردو ادب کی ترقی و اشاعت کیلئے جسطرح جنوبی ہند کا نام تاریخ اردو ادب میں اہمیت کا حامل رہا ہے اسی طرح جنوبی ہند کا دارالسلطنتِ بہمنیہ محمد آباد (بیدر) بھی اردو کی ترقی و اشاعت اور بقاء کیلئے اپنا ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔

بیدر کی قدیم وجہ تسمیہ یہ بتلائی جاتی ہے کہ یہاں کے لوگ بڑے جرجی اور نڈر ہوتے ہیں اس لئے پہلے اس کو بیڈر پکارتے تھے بعد میں بیدر ہوگیا۔ یا ایک کہاوت یہ بھی ہے کہ یہاں بیدر کے بڑے بڑے جنگل تھے۔ اس لئے اس کی مناسبت سے بیدر کہلایا۔ بقول محسن کمال

"یہ شہر محض خوابیدہ تمناؤں کا مدفن نہیں ہے بلکہ تہذیب کے گل رنگ نظاروں کا محل بھی ہے

خوابیدہ تمناؤں کا مدفن نہیں اے دوست — تہذیب کے گل رنگ نظاروں کا محل ہے

صدیوں کا بدن ٹوٹ کے دیتا ہے یہ آواز — بیدر ہے جس کا نام وہ اک شہرِ غزل ہے"

شاعر کا بیدر کو شہرِ غزل قرار دینا محض خوش خیالی نہیں بلکہ یہ اس سرور کا سبب ہے جو کسی بھی فرد میں اپنے ماضی کے احساس و ادراک کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے اور جس کی نظر حال کی نیرنگیوں پر ہوتی ہے اسی احساس و شعور نے فرد و افراد میں کچھ کر گذرنے کا حوصلہ پیدا کرتا ہے اور ان میں اپنے ماضی کو محفوظ کرنے کی خواہش کو جنم بھی دیتا ہے۔

ہزاروں سال کی تاریخ اپنے پہلو میں سموئے شہر بیدر آج بھی عظمت شاہان باوقار اور

شوکت ماضی کا آئینہ دار بنا ہوا ہے خلجی، بہمنی اور بریدی خاندانوں کی حکومتوں نے اس شہر کو سنوارنے اور علم وحکمت سے آراستہ وپیراستہ کرنے میں اپنی ساری توانائیاں صرف کیں۔

۸۷۵ھ میں سلطان ہمایوں شاہ بہمنی کے عہد میں بیدر کی خاک نے اردو کے کئی منصب دیوان شعراء، علماء وادباء کو جنم دیا جس میں قابل ذکر ادبی خدمات کا نتیجہ ذیل میں ان شعراء وادباء جو بیدر سے وابستہ ہے۔ ملاداؤد بیدری، ملاء محمد طاہری، لطفی بیدری، ملانظیری، شیخ آزری، نظامی بیدری، خواجہ جہاں محمود گاوان، فیروز بیدری وغیرہ۔

سلاطین بہمنیہ کے ادبی خدمات کا ذکر محمود گاوان کے بغیر نامکمل ہوگا بہمنی دور کا زرین باب خواجہ عمادالدین محمود گاواں کی جامع کی مدت شخصیت اوراس کے کارناموں کی تفسیر ہے اس دور کے اکابر و مشاہیر میں بہ لحاظ جامعیت خواجہ کی شخصیت سب پر بھاری تھی وہ ایک جامع الصفات سردار تھے جو سخاوت میں حاتم، شجاوت میں رستم، شاعرادیب، انشاپرداز، مدبر، سیاستدان، بہادر جرنیل، علم وادب کا شیدائی، مصلح، رہبراور نہ جانے کتنے صفات اس کے پیکر خاکی میں جلوہ آراء تھے۔ بیدر کو عالم اسلام کے نقشے پر ایک عالمگیر شہرت کے حامل تعلیمی مرکز کی حیثیت سے ابھارنے میں محمود گاواں کا سب سے فزوں تر مقام رہا ہے۔

شہر بیدر کو یہ بھی فخر حاصل ہے کہ بہمنیہ عہد میں سب سے پہلی مثنوی بھی اسی شہر میں لکھی گئی جس کے لکھنے والے نظامی بیدری ہیں۔ نظامی بیدری احمد شاہ ثالث بہمنی کے دربار کا ملک الشعراء تھا اسکی مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' کئی حیثیتوں سے اولیت کا شرف حاصل ہے۔ یہ دکنی زبان کا پہلا خالص ادبی کارنامہ ہے۔ خالص ادبی موضوع پر مثنوی کی بنیاد نظامی نے ڈالی جسکو آگے چل کر بیجاپور، گولکنڈہ کے شاعروں نے بام عروج پر پہنچادیا۔

بہمنی سلطنت کے خاتمے کے بعد برید شاہی، عماد شاہی، قطب شاہی، عادل شاہی وغیرہ حکومتیں عالم وجود میں آئیں اور جوآخر میں سلطنت مغلیہ کا حصہ بھی رہیں۔ بعدازاں سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد خودمختار سلطنت حکومتِ آصفیہ قائم ہوئی اور حیدرآباد پایہ تخت قرار دیا گیا۔

شاہان آصفیہ نے اردو کی خوب سرپرستی کی ۔موجودہ ریاست کرناٹک کا ضلع بیدر سلطنت آصفیہ کا ایک ضلع تھا حکومت آصفیہ کے زمانے میں علمی وادبی اور تہذیبی سرگرمیوں کا مرکز بنا رہا۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد بیدر میں اردو ادب کی سرگرمیوں کیلئے یہاں کے نوجوانوں میں ادبی خدمات کا ذوق بڑھتا گیا اس کیلئے بیدر کی کئی شخصیتیں اردو ادب کی خدمات انجام دیتے رہے جن میں قابل ذکر حسب ذیل ہیں۔

پروفیسر محمد علی، محمد ظہیر الدین، حضرت شاہ معین الدین، حضرت شاہ خاموشؒ، حضرت غلام مصطفےٰ عشقیؔ، حضرت گنج نشین، حضرت سید حسین سیفی، حضرت سجاد پاشاہ ساد، حضرت یعقوب خاں اعجاز، حضرت حبیب اللہ وفا وغیرہ۔ بقول سید صغیر احمد

''ان نامور شعراء نے آج سے ۵۰ تا ۱۰۰ سال کے اندر اپنی شعر وسخن کی عظیم خدمات سے اردو داں عوام کی جس انداز میں خدمت کی ہے وہ ہمارا ایک ناقابل فراموش سرمایہ علم وادب ہے''۔

اس سرخ زمین کو یہ شرف حاصل ہے کہ یہاں سب سے پہلی مثنوی لکھی گئی اور حضرت عشقیؒ جیسا شاعر کا نام اس سرزمین سے وابستہ ہے۔آپ کے ذکر کے بغیر بیدر کی ادبی تاریخ ادھوری ہے۔حضرت غلام مصطفےٰ عشقیؒ کا نام اردو اور عربی شاعر کی حیثیت سے ہندوستان کی سرحدوں سے بھی آگے تک پہنچ گیا۔رسول اکرم ﷺ کی شان میں لکھا گیا (یا شفیع الوریٰ) سلام حضرت عشقیؒ ہی کا لکھا ہوا تھا۔ جو آج ملک کے کونے کونے میں ہی نہیں بلکہ ایران، عربستان، مصر اور دوسرے مسلم ممالک میں احترام وعقیدت کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ یہ سلام آپ نے جذب کی حالت میں لکھا تھا، اس کے علاوہ حضرت عشقیؒ نے بے نقط شاعری کی ہے۔غلام مصطفےٰ عشقی ؒ کے تین مجموعے کلام شائع ہو چکے ہیں ان کے آباواجداد مکہ سے پہلے حیدرآباد اور بعد بیدر تشریف لائے۔آپکی نعت کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیے:

مجھے عشق ان سے ہمیشہ ہے عشقیؔ   کہ محبوب حق مصطفےٰ ہیں محمدؐ

میرے مقالے کا موضوع ''ضلع بیدر میں اردو شعر و ادب (۱۹۵۶ء کے بعد)'' ہے میں نے چند شعراء کا انتخاب کرتے ہوئے ان کے فن کا مختصراً تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے ۱۹۵۶ء کے بعد جن شعراء کا نام شہرِ بیدر سے وابستہ رہا ہے ان میں حضرت رشید احمد رشید، عطا کلیانوی، محسن کمالؔ، ظہیر عظمتؔ، محمد باسط خاں صوفیؔ، عبد الغفور خاکؔ، ریحانہ بیگمؔ،، محمد فضل الرحمٰن ہادی، محمد غوث سحرؔ، قیصر رحمٰنؔ، سردار چرن سنگھ، ڈاکٹر عبد الوحید بہارؔ، صابر رشیدیؔ، علیم الدین چنداؔ، سید شفیع الدین سیفؔ، حکیم مرزا محمد بیگ، وغیرہ۔

شاعر حیات ''حضرت رشید احمد رشیدؔ'' جو شہر بیدر کے ہی نہیں بلکہ جامعہ عثمانیہ کے ان نامور ہستیوں میں شامل ہیں جن پر اس جامعہ کو ناز ہے، مخدومؔ، میکشؔ، حفیظ قتیلؔ، وجد وغیرہ جیسے نامور شعراء کے ہم جماعت اور ڈاکٹر زور، مولوی عبد الحق، ڈاکٹر سجاد، ڈاکٹر نظام الدینؒ، پروفیسر قاری حکیم اللہ اور پروفیسر عبد الحمید خان جیسے اساتذہ اکرام سے استفادہ سے آپ کے فن کو اعتبار ملا۔ آپ کو شاعری میں ابتدائی رہبری جناب حبیب اللہ وفا نے کی۔ آپ کا شمار ریاست کرناٹک ہی نہیں بلکہ ملک کے صف اول کے شعراء میں ہوتا ہے۔ پہلا مجموعہ کلام ۱۹۶۸ء میں ''خم آبروٗ'' کے نام سے چھپ کر منظر عام پر آیا۔ دوسرا مجموعہ ڈسمبر ۱۹۸۸ء میں ''الہام و یقین'' کے نام سے شائع ہوا۔ چند اشعار دیکھئے جو شاعر کے تخلیل کی پرواز اور گہرے مشاہدے کا ثمرہ کہہ سکتے ہیں۔

کہتے ہیں لوگ تھا کوئی بیدر میں بھی رشیدؔ   تھا فرد شعر گوئی میں فن میں یگانہ

ہر حرف میں اک دل دھڑکتا ہے پیہم   ہر شعر کو اک درد کی تصویر بنادے

رشید احمد رشیدؔ کی شاعری فطری اور الہامی جذبات کی آئینہ دار ہے۔ جس کا ثبوت آپکی لکھی ہوئی ''الہام و یقیں تصنیف'' میں شامل نعت شریف کے پہلے شعر سے ملتا ہے۔

نطق آراستہ ہے جذبۂ الہام کے ساتھ   طبع موزوں ہے گوہر بار کسی نام کے ساتھ

اس شعر میں شاعر نے اپنی شعری طبیعت کی موزونیت کو الہامی کیفیت اور جذبوں کے ساتھ وابستہ کر کے نہ صرف اپنی شخصیت اور فن کا بھرپور تعارف پیش کر دیا ہے بلکہ ہماری مطالعاتی

نظر پر تنقیدی فکر کو ایک سیدھا اور صاف راستہ فراہم کر دیا۔اسی ضمن میں چند اشعار ملاحظہ فرمایئے

نسرین والا سرو سمن دیکھتے رہے — حسرت سے تم کو اہل چمن دیکھتے رہے
اک وحشت جنوں کے عالم رفیق بار بار — مڑ مڑ کے ہم بہار چمن دیکھتے رہے
دادِ سخن کی فکر نہیں ہے مجھے رشید — فن چیز یک ہے مطلب فن دیکھتے رہے

ان اشعار میں شاعر نے چمن کا استعارہ دنیا سے کیا ہے،دنیا بھی چمن کی طرح پھولوں اور کانٹوں سے بھری ہوئی ہے۔بہار وخزاں کا سلسلہ یہاں بھی ہے وہاں بھی صبا و گلچیں کا خوف گل مرجھانے کیلئے کھلتے ہیں، غنچے کھلنے سے قبل مرجھا جاتے ہیں۔چمن دنیا کا استعارہ ہو یا وطن کا دونوں حالتوں میں اس کے ساتھ دلی وابستگی اور جذباتی لگاؤ کا عنصر شامل ہوتا ہے چمن چھوڑنے کی حسرت دنیا یا وطن چھوڑنے کی حسرت ہے چمن جو خزاں دیدہ ہے،چمن اُجڑ رہا ہے۔

حضرتِ رشید فطرتاً انتہائی پر گو اور قادر الکلام شاعر ہیں غزل اور نظم دونوں سے یکساں دلچسپی جن کے ہاں تصورات کا حسن زبان و بیان کی بے ساختہ روانی،احساس کی شدت اور جذبوں کی گہرائی و گیرائی اتنی بے پناہ قوت کے ساتھ ملتی ہے لگتا ہے وہ آپ کی اپنی ایک الگ ہی دنیا تھی وہ سب کے ساتھ رہتے ہوئے بھی تنہا نظر آتے تھے اور کبھی کبھی وہ تنہا ایک پوری محفل کا جواب بھی ہو جاتے تھے جسکی سچی تصویر ان اشعار کے ذریعہ پیش ہے۔

غم کا ہے غم نہ آج خوشی کی خوشی مجھے — لاتی ہے کس مقام پہ اب زندگی مجھے
ستم رسیدہ ہوں میں آرزو گزیدہ ہوں — حسین چاند کا بس انتظار کرتا ہوں
سحر کے ہونے میں کیا جانے کتنی دیر لگے — ستارو ڈوب نہ جاؤ کہ میں اکیلا ہوں

رشید احمد رشید کے یہاں تصوف کا رنگ اپنی اصلیت کے ساتھ نمایاں ہے۔باطنی قوتوں کی تہذیب سے روحانی مکاشفات کے مدارج طئے کرنا اور ایسی بصیرت پیدا کر لینا کہ تمام موجودات،وحدت کے رشتے میں نظر آنے لگتے ہیں۔زبان کی لطافتوں،شعر و حکمت کی نزاکتوں تلخ و شیرین صداقتوں کے ساتھ اظہار اور لب و لہجہ پر مکمل دسترس رکھتے ہیں۔یہی وہ بنیادی عناصر

ہیں جنھوں نے شاعر کو جہاں غزل کا ایک پرگو شاعر بنادیا ہے وہیں انہیں نظم کا بھی بانکا اور مکمل فنکار بناتا ہے۔ نظم کے اشعار ملاحظہ فرمائیں:

فکرونظر سے شعروادب بہرہ مند ہے
غالب کمال فطرتِ جدت پسند ہے (غالبؔ کے بارے میں)

جوزندگی نواز ہے جرأت پسند ہے
اقبال اور شاعر اقبال مند ہے (اقبالؔ کے بارے میں)

شہر بیدر میں اردو شاعری کی وہ شمع جو تقریباً پانچ سو برس قبل، فیروز بیدری، نظامی بیدری نے جلائی تھی مختلف حضرات کے ہاتھوں سے گذرتی ہوئی امانتاً رشید احمد رشیدؔ صاحب کے حصہ میں آئی تھی جنھوں نے فکروفن کا لہو دے کر آخری سانس تک جلائے رکھا اور آخری لمحہ تک اپنا سب کچھ اس مقدس فریضہ پر نچھاور کرتے رہے۔

ہر طرف بکھری ہوئی ہے جسکی رنگین داستاں ذرہ ذرہ سے عیاں ہیں ذرہ ذرہ میں نہاں

عطاء کلیانویؔ کا شمار ان نامور ہستیوں میں کیا جاتا ہے جن کو رباعی کے فن اور زبان پر دسترس حاصل تھی آپکے اشعار میں صوفیانہ خیالات ملتے ہیں، ان کی شعری زبان سادہ اور دلنشین ہے اسلوب میں شائستگی، لطافت، روانی اور برجستگی ملتی ہے جسکی مثال مندرجہ ذیل رباعی ہے۔

انسان کے دل و دیدہ ہیں دشمن دونوں ہیں باعث فتنہ یہ زرو زن دونوں
کیا راستہ دکھلائیں گے یہ روروں کو گمراہ ہیں خود شیخ و برہمن دونوں

شہر بیدر کے ایک اور قلم کار محسن کمالؔ اعلیٰ صفات کے مالک تھے آپ، صحافتی، سیاسی، سماجی اور تہذیبی دائروں کے ساتھ ساتھ تعلیمی اداروں سے وابستہ ہو کر جو خدمات انجام دیں ہیں وہ قابل ستائش ہے۔ بقول رزاق فاروقی

"محسن کمالؔ شہر بیدر کی ادبی و علمی زندگی کی آبرو ہیں" جسکی مثال ان اشعاروں سے واضح ہے۔

مدتوں کی بیکراں خاموشیوں کو توڑ کر ذہن کے زنداں سے نکلا ہے کوئی باغی خیال

چھین لواب وقت کے اندھے مورخ سے قلم   اک نئی تاریخ لکھنے آ گیا محسن کمال

محسن کمال کی شعری تخلیقات میں 'اندراج'' (۱۹۷۰ء) 'حرف حرف لہولہو' (۲۰۰۰ء) کے علاوہ ایک کتاب ''شہرغزل'' کے نام سے (بیدر کے شعراء کا تذکرہ) ۱۹۸۳ء میں تالیف کی ہے۔

محسن کمال نے خون جگر سے شاعری کے وہ چراغ جلائے ہیں جن کی روشنی دل آویز بھی ہے اور نظر افروز بھی محسن کمال بھی انہیں حوصلوں میں سے ہی ایک بے جگر مگر جاندار حوصلے کا نام ہے۔

مجھ اکیلے کو جلایا تو کوئی بات نہ تھی   اس کو معلوم تھا اک شہر بسا ہے مجھ میں

یاس امید، تڑپ، کرب، کراہیں آنسو   میں کہ تنہا ہوں یہ میلہ سا لگا ہے مجھ میں

تنہائیوں کے کرب میں جب ڈوب جائے دل   یہ زندگی کا شہر میں جنگل دکھائی دے

شاعر یقیناً آج کے عہد کا آدمی اور آج کے سماج کا انسان ہے، شعر کہنے کے ہنر کی اس انفرادیت نے ان کی قوت اظہار اور انداز بیان کو ایسی رعنائی عطا کر دی ہے، جنگل، صحرا، تنہائی، ویرانی کے سایے نظر آنے لگتے ہیں۔ ہم اسے امیجری کہہ سکتے ہیں، جسکے دامن میں زندگی کی شیریں اور تلخ تجربات کے پھول اور پتھر ہیں یہ سوز و گداز ان سماجی حالات کی پیداوار ہے جن سے اس زمانے کی زندگی دو چار تھی اسی درد نے شاعر کے تخیل کو جھنجوڑا تو کئی کئی علامات واستعارات تخلیق ہوئے جن سے اس دور کا سارا کرب آئینہ ہو گیا اس وقت قفس، فرابہ، ویرانہ، قاتل، خاک، خزاں جیسے کتنے ہی استعارے شاعروں کی زبانوں پر چڑھ گئے جو ان کے درد و کرب کے اظہار کا اہم وسیلہ تھے جس سے ان کے شکستہ دلوں کی تسکین ہوتی تھی۔

آپ کے مجموعے کلام میں یوں تو کئی نظمیں ہیں مگر ''خون ناحق'' کا ایک خاص تاثر ہے جولسانی فسادات سے متاثر ہو کر لکھا ہے۔ جو کہ یہ نظم مقصد اور موضوع کے لحاظ سے ایک اہم قومی تخلیق کا درجہ رکھتی ہے۔ دوسری مختصر نظم ''سونے کی چڑیا'' وہ اپنے اختصار پسندی کے باوجود پرکار اور معنی آفریں بھی جو محض ایک لفظ کی علامت اور شناخت کے باعث ایک پوری تاریخ پر حاوی نظر

آتی ہے۔ محسن کمال نے مئی ۱۹۷۶ء میں ''اندراج'' ایک طویل نظم لکھ کر محترمہ اندرا گاندھی وزیر اعظم ہند کی شخصیت اور کارناموں سے متعارف کروایا ہے۔

محسن کمال آج سے زیادہ آنے والے کل کا انسان اور فنکار ہے جنکا چونکا دینے والا فن اور ایک نیا لب ولہجہ اپنے خاموش قابل فخر کارناموں کی بدولت تاریخ کے مضمون میں روشن ستارہ بن کے چمک رہا ہے۔

بیدر کی نامور شاعرہ، ریحانہ بیگم موجودہ دور کی نمائندہ شاعرہ ہیں جن کے لب ولہجہ میں روزمرہ زندگی کے حالات ہیں۔ان کے تین شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔آجکل اس بحرانی دور میں جب کے شاعر اور شاعری مختلف طبقات اور درجوں میں بٹی ہوئی ہیں۔شاعرہ نے صنفِ غزل کو اپنا موضوع شاعری بنایا وہی جو اردو شاعری کی آبرو ہے۔بقول ڈاکٹر علی احمد جلیلی

''غزل میں حدیث دلبری کو بنیادی اہمیت جو کل حاصل تھی آج بھی ہے ریحانہ کی غزل میں تمام معاملات حسن وعشق موجود ہیں انہوں نے بڑی خوش اسلوبی سے اس روایت کو نبھایا ہے''۔

(پہلی کرن ص ۱۰)

چند اشعار ملاحظہ فرمایئے:

مجھ بندۂ ناچیز کی اوقات ہی کیا ہے   جو کچھ ہے مرے پاس مرے رب کی عطا ہے
معلوم نہیں کس کی دعاؤں کا اثر ہے   موسم تو ہے پت جھڑ کا مگر پھول کھلا ہے

ریحانہ بیگم کی شاعری میں انسانی دکھ درد کی کیفیات، زندگی کے نشیب وفراز گویا غم عشق اور غم زمانہ دونوں کی ان کے یہاں کارفرمائی ہے بلکہ ریحانہ بیگم کی شاعری میں مختلف النوع مشاہدات، محسوسات اور تجربات زندگی کی عکاسی وترجمانی بھی کرتی ہیں۔ان کی تشبیہوں، استعاروں اور لفظیات میں روایتی غزل کی آواز سنائی دیتی ہے۔لیکن ان میں انداز بیان کی قدرت اور تازگی کے اظہار کے نقوش نظر آتے ہیں۔

مجھے ڈر یہی ہے مرے موج دل پر	مرا نام لکھ کر مٹا تو نہ دو گے
ہم نے چراغ دل تجھے تحفے میں دے دیا	تا عمر زندگانی تری ضوفشاں ہے
خشک دامن ہے غم نہیں ہوتا	مجھ کو ہر شئے کا غم نہیں ہوتا
پھول لفظوں کے جب تلک نہ کھلیں	درد، نذرِ قلم نہیں ہوتا

ریحانہ بیگم کی زبان صاف سادہ سہل اور آسان ہے انہیں فن اور زبان پر پوری پوری دسترس حاصل ہے ان کی شاعری رواں اور مترنم ہے اور بے تکلفی کی فضاء بھی قائم ہے۔ان کی نظموں کی زبان بھی بالکل سادہ اور دلنشیں ہے اسلوب میں شائستگی، لطافت روانی اور برجستگی، متانت اور سنجیدگی پائی جاتی ہے۔

دیارِ بیدر کا ایک اور نام عبدالغفور تخلص خاک ہے۔خاکؔ کی غزلوں میں تجربے و مشاہدے کی جدت، فنی رچاؤ زبان و بیان کا وصف اور تشبیہہ و استعارے کی دلکشی ملتی ہے... کا انداز بیان دلکش، شعور پختہ اور لہجہ عام فہم ہے ان کی زبان، عام زندگی کی زبان ہے۔ جس میں ان کے جذبات و احساسات اور تصورات کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔آپ کا مجموعہ کلام ''تنویر خاک'' کے نام سے شائع ہوا، جس میں غزلیں اور نظمیں دونوں شامل ہیں۔

جب محو نظارہ ہیں نظریں وہ کیف تھا وہ جمال تھا	اے شام الم اتنا تو بتا وہ خواب تھا یا خیال تھا
تری بزم میں کوئی رو پڑا، کوئی چشم مے میں یوں کھو گیا	یہ تو اپنا اپنا ظرف تھا، یہ تو اپنا اپنا کمال تھا

شاعر دنیا کو جب اپنے جذب کے ساتھ وابستہ کر کے دیکھتا ہے تو اس میں گہرائی اور رنگینی پیدا ہو جاتی ہے بلکہ حقیقت کی نئی جھلکیاں اسے نظر آتی ہیں جن سے دوسروں کی نظریں محروم ہوتی ہیں یہاں شاعر ''محو نظارہ'' عشق حقیقی کا استعارہ ہے اسی کے سبب شاعری میں ابہام و اجمال کی خصوصیت پیدا ہوتی ہے جو اعلیٰ شاعری کی جان ہے۔ان کی نظمیں انتظار، آخری شب، جوانی، خون وغیرہ عمدہ نظمیں ہیں۔

محمد باسط خاں صوفیؔ بیدر کے ان نوجوان شعراء میں شامل کئے جاتے ہیں جنھوں نے

شعر و سخن کی دنیا میں روشن ستارے کی طرح چمکنے لگے ہیں۔ استاد شاعر رشید احمد رشید کی رہبری اور رہنمائی میں اپنے فن میں پختگی پیدا کی۔ آپ کا نعتیہ دیوان ۱۹۹۷ء میں منظر عام پر آیا۔ اپنے استاد محترم کی عقیدت میں بہ زبان صوفی سنیے۔

صوفیؔ یہ شعر گوئی عطائے رشید ہے　　　جو کچھ ملا ہے مجھ کو ہے صدقہ رشید کا

صوفی ایک منفرد لب و لہجہ کے شاعر ہیں ان کی شاعری دیگر شعراء سے مختلف رہی ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

دل کو قلم اور اشک کی سیاہی بنا کے لکھ　　　نعت نبیؐ جو لکھ تو خودی کو مٹا کے لکھ
وہ مدحتِ رسولؐ بھی آساں نہیں کوئی　　　آتش عشق میں تو من و تن جلا کے لکھ
صحرا میں بدل جاتا دنیا کا چمن سارا　　　ہوتی نہ اگر رنگت احمدؐ کی بہاروں میں

محمد باسط خاں صوفیؔ کی شاعری کا انداز کچھ زائد ہے وہ دربارِ مصطفوی میں حاضری کی تمنا لیئے ہوئے اپنے گھڑیاں گذار رہے ہیں۔ صوفیؔ کے اشعاروں میں فکر کی گہرائی و گیرائی ہے جو ایک مخصوص لطافت پیدا کرتی ہے۔ شاعر نے اپنے جذبات و احساسات کو بڑی فنکارانہ چابکدستی سے پیش کیا ہے۔

ظہیر عظمتؔ ، بگدل میں پیدا ہوئے ، ابتدائی تعلیم وہیں پائی۔ ثانوی تعلیم بیدر میں کرناٹک ہائی اسکول سے مکمل کی۔ اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ ظہیر عظمت ایک بلند پایہ فکر و فن کے شاعر ہیں

جینا بھی ہے دشوار تو آسان بھی ہوگا　　　پتھر تو نہیں سب کوئی انسان بھی ہوگا
گھر اپنا بھی جل جائے اگر نور کی خاطر　　　وہ باعث تسکین دل و جان بھی ہوگا
لکھتے ہیں گل و لالہ جہاں ہے وہی صحرا　　　کہتے ہیں چمن اس کو جو ویران بھی ہوگا
حالات بگڑ جانے کی تشہیر ہے عظمتؔ　　　حالات سنور جانے کا امکان بھی ہوگا

یہ درد و کرب ان حالات کی دین ہے جو اس وقت رونما تھے۔ دمن کے ایڈیٹر وشواناتھ

پاٹل نے ظہیر عظمت کی صلاحیتوں کو پہچانا اور کنڑ اخبار نکالنے کا مشورہ دیا۔ ''کنڑ رتن'' کے نام سے اخبار نکالنا شروع کیا۔ رات بھر کنڑ کتابت کرنا اور لیتھو پر چھپانا واقعی دل و جگر کا کام تھا، مالی مشکلات کا بہت سامنا کرنا پڑا۔ مشکل کے دنوں میں خواجہ مختار احمد گیلانی، معین الدین آبادی اور فیض رحمٰن صاحب نے بڑی مدد کی آخری دنوں میں ذہنی توازن متاثر ہوگیا تھا کسی کام سے گلبرگہ گئے تھے۔ بیمار ہوئے کسی نے ترس کھا کر بیدر جانے والی بس میں بٹھا دیا آتے ہوئے راستے میں وہیں انتقال ہوگیا اس وقت عمر ۴۰، ۴۵ سال بتائی جاتی ہے۔

بیدر کی آب و ہوا میں اعلیٰ و ارفع، بزرگان دین اور علوم و فنون کی بلند مرتبت شخصیتوں کی روح و خوشبو بسی ہوئی ہے۔ قابل شخصیتیں اس سرسبز و شاداب سرزمین کو اپنی مہک سے پرنور بنادیئے ہیں آج بھی بیدر کی سرزمین سے روشنی، خوشبو مہک کا اٹوٹ رشتہ ہے۔ ☐☐

گلبرگہ کی نثری تصانیف کا سرسری جائزہ

واجد اختر صدیقی
معلم، گورنمنٹ اسکول، الند، ضلع گلبرگہ و
ریسرچ اسکالر شعبہ اردو، یونیورسٹی آف میسور (فاصلاتی)، میسور

گلبرگہ عرصہ دراز سے روحانی وادبی حیثیت کا حامل رہا ہے۔ حضرت خواجہ بندہ نوازؒ اسی سرزمین پر آرام فرما ہیں، جنکے آستانے سے فیوض و برکات کے سرچشمے ابلتے رہے ہیں۔ گلبرگہ میں دکنی زبان وادب کا آغاز کا سہرا آپ ہی سے وابستہ ہے۔ آپ سے کئی مذہبی رسائل منسوب ہیں۔ ''معراج العاشقین'' ایک نثری نمونہ ہے۔ مولوی عبدالحق، خلیق انجم اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اس رسالے کو حضرت خواجہ بندہ نوازؒ سے منسوب کیا اور اپنے مقدموں کے ساتھ اس رسائل کو شائع بھی کیا۔ لیکن حسینی شاہد اور حفیظ قتیل نے جدید اور تازہ تحقیق کے ذریعہ یہ ثابت کیا ہیکہ معراج العاشقین ان کی تصنیف نہیں۔ دکنی ادب کے جدید محقق ڈاکٹر نسیم الدین فریس نے بھی اپنی کتاب ''دکنی ادب کے مطالعے کی جہتیں'' میں اس رسالے کو مخدوم شاہ حسینی کی تصنیف کہا ہے۔ بہر حال کوئی محقق حرف آخر نہیں۔ اس معاملے میں مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔

فیروز شاہ بہمنی کے بعد پایہ تخت گلبرگہ سے بیدر منتقل ہوگیا۔ بادشاہ کے ہمراہ شعراء و ادباء اور دانشوروں نے بھی ہجرت کی، اسی سبب گلبرگہ عرصہ دراز تک ادبی سرگرمیوں سے محروم رہا۔ تاہم حیدرآباد کے نظام نے جب گلبرگہ کو اپنی حکومت کا صوبہ بنایا تو یہاں پھر سے ادبی سرگرمیاں شروع ہوگئیں۔ جن نثر نگاروں نے گلبرگہ میں نثر کا آغاز کیا ان میں قابل ذکر ابراہیم جلیس، عصمت اللہ بیگ، امیر علی، عطاء حسین حافظ، تمکین کاظمی، جہانگیر علی قدسی، حامد صدیقی، فرحت اللہ بیگ،

مبارز الدین رفعت ، عبدالکریم وارثی ، معشوق حسین خان ، عاقل علی خان ، شاہد حسین فاروقی ، مرغوب الدین ، وزیر علی سہروردی ، علی الدین انصاری ، لئیق احمد نعمانی ، زینت ساجدہ ، حسینی شاہد اور محی الدین غیرت وغیرہ ہیں ۔

آزادی سے قبل گلبرگہ کلب کے قیام نے یہاں پر ترقی پسند افسانہ نگاروں کیلئے خوشگوار ماحول پیدا کیا ۔ اس دور میں محبوب حسین جگر ، ابراہیم جلیس تمکین کاظمی اور نیاز گلبرگوی نے متاثر کن افسانے تحریر کیئے ۔

ابراہیم جلیس نے نہ صرف صنف افسانے میں طبع آزمائی کی بلکہ ان کے نوک قلم سے صحافت اور ناول نگاری کے سرچشمے بھی پھوٹتے رہے ۔ موصوف نے کوئی 21 کتابیں تحریر کیں ۔ انہوں نے ایسے مضامین اور ناولوں میں طنزیہ پہلو کو اپنایا اور ان کی بعض کتابوں میں مزاح کی بھرپور کشش بھی ملتی ہے ۔ ان کی کتابوں کی طویل فہرست میں زرد چہرے ، ایک ملک دو کہانی ، تکونا دیس ، چالیس کروڑ بھکاری ، بھوکا ہے بنگال اور جیل کے دن جیل کی راتیں کافی شہرت رکھتی ہیں ۔ یہ بات بجا طور پر کہی جاسکتی ہے کہ انہوں نے صحیح معنوں میں گلبرگہ کے نام کو پوری ادبی دنیا سے متعارف کروایا ۔ ابراہیم جلیس کے بھائی محبوب حسین جگر نے اردو صحافت کو آسمان پر پہنچا دیا ۔ روز نامہ سیاست حیدرآباد کو سنوارنے میں انہوں نے خون پسینہ ایک کیا ۔

آزادی کے بعد پروفیسر مبارز الدین رفعت ، زینت ساجدہ ، پروفیسر ہاشم علی اور ثمینہ شوکت نے تحقیق کے ذریعہ ادب میں نام کمایا ۔ مبارز الدین رفعت تنقید ، تحقیق کے شہہ سوار ہیں ۔ انہوں نے تحقیق کی گلبرگہ میں بنیاد ڈالی اور حقیقی معنوں میں اسکا حق ادا کردیا ۔ ان کی مشہور کتابوں میں ابلیس نامہ ، مدح خواجہ دکن ، سالار جنگ میوزیم اور مقام غالب شامل ہیں ۔ موصوف کو ترجمے کے فن سے بھی شغف رہا ہے ۔ ادبیات ایران ، مختصر تاریخ تمدن ، عرب اور اسلام اور مقالات جمال الدین افغانی ان کے بہترین تراجم ہیں ۔ ان کے ترجموں میں بھی ایک طرح کی تخلیقیت در آئی ہے ۔

پروفیسر ہاشم علی بحیثیت محقق نمایاں حیثیت کے حامل ہیں مغز مرغوب و چہار شہادت، میراں جی شمس العشاق، آپکی تحقیق کتابیں ہیں۔ سرزمین گلبرگہ اگرچہ تحقیق کے معاملے میں زرخیز نہ سہی لیکن ہاشم علی نے مبارزالدین رفعت کے کام کو آگے بڑھایا اور تحقیق کو گلبرگہ میں زندہ جاوید کردیا۔

ثمینہ شوکت نے بھی تحقیق سے اپنا رشتہ استوار کیا۔ بندہ نواز اور ان کی ادبی خدمات جیسی کتاب پیش کرکے تحقیق کی توسیع کی، اسکے علاوہ مثنوی لطف، حیات لطف اور دیوان لطف کتابوں کے ذریعے ادب کی آبیاری کی۔

1960ء کے بعد کا دور گلبرگہ میں اردو نثر کیلئے کافی زرخیز ہے۔ اس دور سے وابستہ بھی نثر نگار اپنی حیثیت کو منوا چکے ہیں۔ ان نثر نگاروں میں سید مجیب الرحمن، مجتبیٰ حسین، طیب انصاری، شاہد فریدی، قیوم صادق، وہاب عندلیب، حکیم شاکر، اکرام باگ، عبدالقادر ادیب، ریاض قاصدار، بشیر باگ، حامد اکمل، جلیل تنویر، خالد سعید، حمید سہروردی، ملنسار اطہر احمد، منظور وقار، رؤف خوشتر، حلیمہ فردوس، وحید انجم، عبدالحمید اکبر، نجم باگ، حشمت فاتحہ خوانی، فاروق نشتر، کوثر پروین، ماجد داغی، انیس صدیقی، فوزیہ چودھری، امجد علی فیض، اطہر معز، منظور احمد دکنی اور غضنفر اقبال وغیرہ شامل ہیں۔

مجتبیٰ حسین ایک ایسا نام ہے جس نے پوری دنیا میں مزاح نگاری کے ذریعے دھوم مچائی۔ جنکا نام عالم اردو میں نہایت ادب و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ انہوں نے مزاح نگاری کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا ہے۔ ان کی یہ شہرت گلبرگہ والوں کیلئے باعث افتخار ہے۔ موصوف اپنی کتاب ''تکلف برطرف'' کے ذریعہ مزاح نگاری کی بنیاد ڈالی۔ تکلف برطرف 1968ء میں شائع ہوئی اس سے پہلے انہوں نے ''شیشہ و تیشہ'' کے ذریعے 1964ء سے روزنامہ سیاست کیلئے کالم لکھے۔ مجتبیٰ حسین سراپا مزاح نگاری کا نمونہ ہیں ان کو یہ کمال حاصل ہے کہ وہ الفاظ اور محاوروں کی جوڑ توڑ کے ذریعہ مزاح پیدا کرتے ہیں چابکدستی ان کی تحریروں کا وصفِ خاص ہے جو کسی بھی محفل

کوقہقہہ زار بناتی ہے۔جس سے ان کی ذہانت کا پتہ چلتا ہے۔یوں تو مجتبیٰ حسین نے متنوع مزاحیہ مضامین لکھے اسکے علاوہ ان کا قلم طنزیہ اور موضوعاتی مضامین کی طرف بھی دوڑنے لگا۔دنیائے ادب کوانہوں نے کئی کتابوں سے سرفراز کیا،جن میں تکلف برطرف، قطع کلام، قصہ مختصر، الغرض، آخرکار، میرا کالم اور آدمی نامہ شہرت حاصل ہیں، اسکے علاوہ انہوں نے سفر نامہ امریکہ، جاپان چلو جاپان چلو اور سفر لخت لخت وغیرہ کتابوں کے ذریعہ ہی اردو خاکہ نگاری کو مستحکم روایت سے مالا مال کیا۔صاحب موصوف کو ان کی بہترین خدمات کے عوض بے شمار اعزازات سے نوازا جاچکا ہے جس میں پدم شری کا اعزاز بھی شامل ہے۔ان کی اس کامیابی اور بلندی کے پیچھے یقیناً گلبرگہ کی مٹی کارفرما رہی ہے۔

طیب انصاری نے تحقیق اور تنقید کے ذریعہ اپنے وجود کا احساس دلایا۔داستان ادب گلبرگہ اور عہد آصفیہ میں اردو نثر کا ارتقاء ان کی شاہ کار کتابیں ہیں۔طیب انصاری ایک ہمہ پہلو اور ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔انہوں نے بحیثیت تنقید نگار اور خاکہ نگار اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔اس سے ہٹ کر انہوں نے گلبرگہ سے گلمرگ تک کے عنوان سے ایک سفر نامہ بھی تحریر کیا۔ تنقیدی کتابوں میں تحریر و تنقید، ادراک معنی، نصرتی کی شاعری، خیالات اقبال اور تبصرہ و تجزیہ ان کی قابل قدر کتابیں ہیں۔طیب انصاری ایک مذہبی انسان تھے اولیائے کرام کے معتقد بھی ۔ خانقاہی نظام سے ان کی دلچسپی تھی اسی سبب انہوں نے قطب دکن حضرت علاؤ الدین انصاری، خانقاہی نظام، حضرت چراغ دہلوی سوانح مبارک، حضرت راجو قتال حسینی جیسی کتابیں تحریر کیں۔

وہاب عندلیب اردو زبان و ادب کا ایک روشن ستارہ ہیں۔ بحیثیت خاکہ نگار آپ کی شہرت ادبی منظرنامے پر مسلم ہے۔قامت و قیمت کے عنوان سے 1981ء میں ان کے خاکوں کا مجموعہ شائع ہوا۔انہوں نے خاکہ نگاری کے ذریعہ فن کاروں کی حقیقی تصویریں پیش کردی۔غیاث صدیقی شخصیت اور فن 1978ء میں ان کی تالیف چھپی ہے۔گویا بحیثیت سوانح نگاری انہوں نے غیاث صدیقی سے اپنی دیرینہ وابستگی کا اظہار بھی کیا۔تحقیق و تجزیہ ان کی تیسری کتاب ہے جس

میں انہوں نے سترہویں صدی کی اردو ادبی تاریخ کو لکھا ہے، جو کہ جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔

سید مجیب الرحمٰن ایک ایسے دانشور ہیں، جنکی موجودگی نئے جہانوں کا پتہ دیتی ہے۔ ان کی پہلی تصنیف ماورائے شعور کے عنوان سے 1990ء کو شائع ہوئی۔ آپ کا طرزِ تحریر نہایت منفرد اور نیا ہے۔ اس میں شامل مضامین پڑھنے والا یہی سمجھے گا کہ ان کے یہ خیالات یا تو تصور سے پرے ہیں یا پھر آنے والے دنوں کی پیش گوئیاں ہیں۔

رزاق فاروقی ایک زود نویس فنکار ہیں۔ متنوع موضوعات پر لکھنے کے وہ نہ صرف عادی ہیں بلکہ لکھنے کے فن میں انہیں دسترس حاصل ہے۔ ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جیسے اردو طریقۂ تدریس اور اردو کے اساتذہ ماحول اور مسائل، ابوالکلام آزاد کے تعلیمی تصورات، اودھ پنچ کی ادبی خدمات، ڈاکٹر رادھا کرشنن کا ادبی فلسفہ اور چکبست حیات اور ادبی خدمات وغیرہ۔

مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری کی روایت کو گلبرگہ کے دیگر مزاح نگاروں میں عبدالقادر ادیب، رؤف خوشتر، فاروق نشتر، عابد مرزا، منظور وقار، حلیمہ فردوس، امجد علی فیض نے آگے بڑھایا۔

عبدالقادر ادیب کے یہاں مزاح کھل کر اپنے منظر نامے کا اعلان کرتا ہے ان کی دو کتابیں نقار خانے میں اور سن تو سہی شائع ہو چکی ہیں۔ عابد مرزا کی حال کی میں ایک کتاب ''ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں'' کو شائع ہو چکی ہے۔ رؤف خوشتر کی غبار حاضر اور فاروق نشتر کی دو کتابیں دراصل اور دم بخود شائع ہو چکی ہیں۔ منظور وقار نے ''ہنسنا منع ہے'' تحریر کی۔ حلیمہ فردوس کی دو کتابیں ماشاءاللہ اور بہر کیف شائع ہو چکی ہے۔ امجد علی فیض نے جستہ برجستہ کے عنوان سے ایک کتاب منظر عام پر لائی۔ ملنسار اطہر احمد اور فوزیہ چودھری کا تعلق بھی گلبرگہ سے ہے۔ فوزیہ چودھری کا ایک خاکوں کا مجموعہ مہربان کیسے کیسے حال ہی میں شائع ہو چکا ہے۔ ملنسار اطہر احمد کی دو کتابیں حرف اکتساب اور دکنی مثنویوں میں منظر نگاری شائع ہو چکی ہے۔ سید فضل الرحمٰن شعلہ کا

تعلق بھی شاہ پور ضلع گلبرگہ سے ہے ان کی علمی و ادبی اور سوانحی مضامین کا مجموعہ ''نقش ہائے رنگ رنگ'' 1988ء کو شائع ہو چکا ہے۔

قیوم صادق دکنی تنقید و تحقیق کے روح رواں تھے اردو ادب میں تنقید کی اہمیت۔ دکنی غالب ملاوجہی اور دکنی ادب آپکی مشہور کتابیں ہیں۔ اردو زبان کا مذہبی ورثہ اور بیجاپور کی اردو مثنویاں جیسی کتابیں بھی آپ نے تحریر کیں۔ دکن زندہ کروم کے نام سے حال ہی میں آپ کی ایک اور کتاب سامنے آئی ہے۔

بحثیت تنقید نگار خالد سعید کا نام نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ موصوف کی اب تک تین تنقیدی کتابیں، تعبیرات، پسِ تحریر اور بارہ مضامین شائع ہو چکی ہیں۔ آپ شاعر بھی ہیں افسانہ نگار بھی اس سبب آپ کی تنقید میں تخلیقی عناصر کے جوہر پائے جاتے ہیں۔ عبدالحمید اکبر نے مولانا انوار اللہ فاروقی شخصیت اور کارنامے پیش کر کے ان کی علمی و ادبی خدمات کا احاطہ کیا ہے

انیس صدیقی کی کتاب کرناٹک میں اردو صحافت معروف ہو چکی ہیں۔۔ حشمت فاتحہ خوانی نے ''مبارز الدین رفعت بحثیت مترجم'' تحریر کی۔ میدان تنقید میں ایک نیا نام منظور احمد دکنی کا ہے حال ہی میں آپکی تنقیدی کتاب جزیرے، بیدر اور گلبرگہ میں اردو شاعری کے عناوین سے شائع ہو چکی ہیں۔ امید قوی ہے کہ آنے والے دنوں میں تنقید کا باب ان کے قلم سے روشن رہے گا۔ نووارد غضنفر اقبال نے اردو افسانہ 1980ء کے بعد کے نام سے کتاب شائع کی۔ مذکورہ بالا کتابیں پی ایچ ڈی کے مقالوں کیلئے لکھی گئی تھیں مگر ان کتابوں کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔

1960ء کے بعد اردو میں افسانہ جدیدیت کی طرف مڑ گیا۔ افسانے میں تجرید اور ابہام کو فروغ حاصل ہوا۔ گلبرگہ کے افسانہ نگاروں پر بھی اسکا راست اثر پڑا اور بیانیہ افسانے کی جگہ علامتی افسانہ لکھا جانے لگا۔ اگرچہ ان افسانوں میں افہام و تفہیم کی مشکلات درپیش تھیں لیکن جدیدیت کی لہو کی وجہ سے اس دور میں ان افسانہ نگاروں کے افسانے پسند کیئے جانے لگے۔ جدیدیت کے اس دور میں اکرام باگ اور حمید سہروردی نے برصغیر میں اپنے منفرد اسلوب کے

ذریعہ ہلچل مچائی۔ اکرام باگ کے افسانوں کا مجموعہ ''کوچ'' شائع ہو چکا ہے ان کے افسانے رومانی ہونے کے باوجود گنجلک شکل اختیار کر جاتے ہیں ان کے ہاں ابہام پیچیدہ ہے جسکو سلجھانا ہر ایک کے بس کا رنگ نہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں جیومیٹری کے اشکال، فزکس اور کیمسٹری کی باتوں کو احساسات اور جذبات کا لبادہ اڑھادیا ہے۔

حمید سہروردی کے اب تک تین افسانوی مجموعے ریت ریت لفظ، عقب کا دروازہ اور بے منظری کا منظر نامہ شائع ہو چکے ہیں۔ بین السطور آپکا تنقیدی مجموعہ ہے اور شش جہت آگ کے عنوان سے ایک نثری نظم کا مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ حمید سہروردی کے افسانوں میں ابہام ہے لیکن تفہیم کی زیادہ مشکل دربیش نہیں گویا ان کے ہاں ابہام سیال قسم کا ہے جسکی تہیں دھیرے دھیرے کھلتی ہیں۔ موصوف نے اپنے افسانوں میں عصری جہت سے کام لیا ہے۔

بشیر باگ نے اگرچہ بہت کم افسانے لکھے لیکن جدید رجانات کی پاسداری کرنے والوں میں ان کا نام نمایاں ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں بہت زیادہ گنجلک خیالات کی عکاسی کی ہے۔ ابہام ان کی کہانیوں کی جان ہے۔ انہوں نے اسلوب کے اعتبار سے نئی تکنیک ایجاد کی۔ ان کی بعض کہانیاں آج بھی اپنے معنی ومفہوم کو تلاشنے میں ناکام نظر آتی ہیں۔ گویا انہوں نے ایسے افسانے تحریر کیئے جو آنے والی نسلوں تک ان کے مفاہیم شاید راز میں رہیں۔ شاہد فریدی کے افسانوں کا مجموعہ کانٹوں کا سفر شائع ہو چکا ہے ان کے افسانوں میں زندگی کی ترجمانی بھرپور انداز میں پائی جاتی ہے۔

جدیدیت کی اس لہر کے باوجود گلبرگہ میں کئی افسانہ نگار ابھرے جنہوں نے جدیدیت ،ترقی پسندی اور روایتی طرز تحریر اختیار کیا۔ اس دور میں ابھرنے والے افسانہ نگاروں میں خالد سعید، جلیل تنویر، وحید انجم، اسماعیل غازی، منظور وقار، ریاض قاصدار، نجم باگ، ،لطیف، ، حنیف قمر، امجد جاوید، مقیت احمد جامی، عبیداللہ اور صادق کرمانی وغیرہ شامل ہیں۔ خواتین افسانہ نگاروں میں کوثر پروین اور نفیس بانو وغیرہ نے بھی افسانہ نگاری میں نام کمایا۔

جلیل تنویر گلبرگہ کے نمائندہ افسانہ نگار ہیں۔ان کے افسانوں کا مجموعہ حصار 1983 کوشائع ہوا۔جلیل تنویر کے افسانوں میں آزادی کے بعد ہونے والے فسادات کی بربادی، آلام، سیاسی وسماجی اور معاشی بحران کے حالات و واقعات کی ترجمانی ملتی ہے۔فکرونظر کے عنوان سے 2003ءکوآپکا تنقیدی مجموعہ شائع ہو چکا ہے ان کی تنقید میانہ روی کی غماز ہے۔انہوں نے بہت پہلے طیب انصاری کی سوانح تحریر کی تھی جو کتابی صورت میں شائع ہوچکی ہے۔

ریاض قاصدار نے بھی علامتی اورتجریدی افسانے تحریر کئے۔تجریدی ہونے کے باوجود ان کے افسانوں میں معاشرتی عکاسی ملتی ہے۔حال ہی میں ان کا افسانوی مجموعہ ''عکسِ لرزاں'' کے عنوان سے چھپ چکا ہے۔

نجم باگ کے افسانوں میں بھی جدیدیت کا رجحان غالب ہے انہوں نے افسانہ نگاری کا آغاز 1980ءکے بعد کیا۔ان کے مشہور افسانے گنگ،انبوہ،اغلب اور ہجرت ہیں۔

1970ء کے بعد لکھنے والوں میں علیم احمد اور وحید انجم نے نثر نگاری میں نام کمایا۔ وحید انجم بیک وقت افسانہ نگار اور شاعر ہیں۔کبھی کبھار مزاح نگاری،تنقید اور خاکہ نگاری کو بھی انہوں ذریعہ اظہار بنایا ہے۔ان کی افسانوی کتاب ''کڑی دھوپ کا سفر'' 1986ءکوشائع ہوکر مقبول ہوچکی ہے۔ان کے افسانے بیانیہ طرزتحریر کی عمدہ مثال ہیں۔جدیدیت اور ابہام کوانہوں نے اپنے نزدیک آنے نہیں دیا۔ان کی کہانیاں دل کی آواز معلوم ہوتی ہیں۔وہ ایک البیلے افسانہ نگار ہیں۔انہوں نے رومانی افسانے بھی لکھے لیکن ان کے افسانوں کے زیادہ تر موضوعات یونیورسٹی کے کیمپس کے اندر ہونے والے واقعات، حالات اور مشاہدات کا پرتو ہیں۔انہوں نے پروفیسر کے معاشقے کی کہانی بھی لکھی اور اساتذہ کے درمیان ہونے والی رساکشی کا بھی ذکر کیا اور طلبہ کے درمیان چلنے والی ذہنی کشمکش اور اتاؤلے پن کی نشاندہی بھی ان کی کہانیوں کا خاصہ ہیں۔آفاق کے عنوان سے موصوف نے ایک دستاویزی کتاب بھی ترتیب دی جس میں ان کے تنقیدی جوہر ابھر کر سامنے آئے ہیں۔

1980ء کے بعد ابھرنے والے افسانہ نگاروں میں امجد جاوید اور کوثر پروین دو نمایاں نام ہیں۔ ''کالا ناگ'' امجد جاوید کا مشہور افسانہ ہے جس میں انہوں نے سماج میں ہونے والے خون خرابے کو ناگ سے تشبیہ دی ہے۔ ان کے شاہکار افسانوں میں شجر فنا کا گھنا ہے۔ گھر میں اجنبی اور تند ہوائیں اور تتلی قابل ذکر ہیں۔

کوثر پروین کی کہانیاں گھریلو زندگی کے حالات واقعات کے اردگرد گھومتی ہیں، ان کی کہانیوں میں جدیدیت کی ہلکی اور لطیف آمیزش بھی ملتی ہے اب تک ان کی دو افسانوی کتابیں 'بن باس' اور 'ہلچل سی کوئی' منظر عام پر آچکی ہیں ان کے مشہور افسانے ادراک، ذات اور ماسٹر پلان قابلِ ذکر ہیں۔

مختصر یہ کہ 1960ء کے بعد سے تا حال گلبرگہ ایک اہم ادبی مرکز رہا ہے۔ یہاں کے فن کاروں نے اردو ادب میں بین الاقوامی طور پر ہونے والی تبدیلیوں کو محسوس کیا اور ان تبدیلیوں کو من وعن قبول نہیں کیا بلکہ اپنی ذہنی فکر رسا سے بھی کام لیا۔ یہاں پر کئی فنکاروں نے ترقی پسند تحریک کو بھی اپنایا اور جدیدیت کے بھی اسیر ہیں اور جدیدیت کی اندھی تقلید میں روایتی طرز تخاطب کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ کئی ازم آئے اور اپنی جولانیاں بکھیر کر لوٹ گئے لیکن یہاں کے فنکار زندہ ہیں اور ہمیشہ زندہ رہینگے۔ گلبرگہ کی سرزمین اردو ادب کیلئے ہمیشہ سے زرخیز رہی ہے۔ یہاں کے ادیبوں کے فن پاروں میں اس کی کھنک موجود ہے جسکی گونج عالمی ادبی منظر نامے پر صاف سنائی دیتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آنے والے دنوں میں بھی یہاں کے ادیبوں میں ایسے خیالات پیدا ہونگے جن کی روشنی میں سارا عالم اپنا سویرا دیکھے گا۔ ☐☐

حیدر آباد کرناٹک میں اردو نعت گوئی

ریشماں بیگم

ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو و فارسی، گلبرگہ یونیورسٹی، گلبرگہ

جس طرح دیگر اصناف سخن جیسے قصیدہ، غزل، مرثیہ، مثنوی اپنا ایک منفرد مقام اور اصول وضوابط رکھتے ہیں، اسی طرح نعت بھی اپنا ایک منفرد معیار اور اصول وضوابط کی پابند ہے۔ عربی لفظ ''نعت'' کے لغوی معنی، ''تعریف وتوصیف کرنا'' ہے لیکن اصطلاح میں نعت سے مراد وہ کلمات ہیں جن میں خاص طور پر سرور دو عالم، نور مجسم، رسول کریم ﷺ کی توصیف و مدحت سرائی کی گئی ہو۔ نعت گوئی کو اردو میں ایک مستحکم اور مستقل موضوع شاعری کی حیثیت حاصل ہے۔ نعت گوئی کا فن پل صراط کا سفر ہے۔ صنف نعت کا دائرہ عظمتِ رسول کی طرح کافی وسیع ہے کیونکہ اس صنف میں نبی کریم ﷺ کی خدمتِ باوقار، فضیلت کردار، سوانح اور معجزات وغزوات وغیرہ شامل ہیں۔

اردو کی نعتیہ شاعری میں جذبے کی صداقت اظہار خیال میں سلیقہ اور انتہائی احتیاط کا ہونا بہت ضروری ہے۔ عشق رسول ﷺ کے بغیر نعت گوئی ممکن نہیں۔ عشق نبی ﷺ کا لازمی نتیجہ اتباع نبی ﷺ ہے۔ دونوں لازم وملزوم ہیں۔ ۔امام احمد رضا خاں، علامہ اقبال، محمد علی جوہر، ظفر علی خاں، حسرت موہانی، جوش ملیح آبادی اور حفیظ جالندھری نے حالی کے پیش کردہ نعتیہ اسلوب کو ایک جدید روایت کے ساتھ تخلیق کیا کہ نعت کو پوری توانائی کے ساتھ آگے بڑھنے کا حوصلہ ملا۔ نعت عموماً غزل کی ہیئت اور اسی کے اسلوب میں کہی جاتی ہے لیکن مختلف اصناف سخن میں بھی نعتیہ کلام کی روایت ملتی ہے جیسے مثنوی، مرثیہ، غزل، رباعی، مسدس، قصیدہ، آزاد نظم اور نثری نظم وغیرہ۔ صدیوں گذرنے کے باوجود روایتِ نعت آج بھی زندہ وتابندہ ہے اور انشاء اللہ حب نبوی میں خراج تحسین کا یہ سلسلہ تاقیامت جاری رہیگا۔

ضلع گلبرگہ، بیدر اور رائچور، کو حیدرآباد کرناٹک اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ تینوں کنڑی زبان کے اضلاع سابقہ ریاست حیدآباد کے حصہ تھے۔علاقہ حیدرآباد کرناٹک اردو شعر و ادب کا گہوارا رہا ہے اس علاقے کے شعراء و ادباء نے اپنی شعری و نثری صلاحیتوں سے اردو و شعروادب میں اضافہ کررہے ہیں اور اردو کے فروغ میں ترقی بھی ہورہی ہے۔

علاقہ حیدرآباد کرناٹک کے مشہور و معروف نعت گو شعراء جنکے نعتیہ مجموعے کلام شائع ہو چکے ہیں۔مخدوم علی سہروردی تاب صابر شاہ آبادی، ،سرور مرزائی ،ڈاکٹر رزاق اثر شاہ آبادی، ،ڈاکٹر صغریٰ عالم ،سید شاہ خسرو حسینی، ڈاکٹر سید شاہ تاج الدین احمد قادری نوردریا، صبیح حیدر ،وحید انجم وغیرہ شامل ہیں۔

جس طرح لفظ حمد خالق کائنات کیلئے مختص ہے۔لفظ نعت بھی سرور کائنات کیلئے مخصوص ہے چاہے نظم کی صورت میں ہو یا نثر کی صورت میں ،نعت کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ جس صنف سخن میں بھی کہی جائے نعت ہے اس کا کوئی فارم مخصوص نہیں۔غزل کے فارم میں رباعی کے فارم میں قطعات کے فارم میں مخمس ،مسدس کے فارم میں غرض ہر فارم میں یہ صنف اپنا انفرادی مقام و شناخت رکھتی ہے۔اس دور مادیت میں جبکہ دینی اور روحانی ارتقاء کا فقدان ہے اور عصر حاضر کا انسان جس بحران اور پریشانی میں مبتلا ہے اس کے تمام مسائل کا حل اور دکھ درد کا علاج رحمت عالم سے تعلق ہے۔انسان کو روحانی سکون، حقیقی امن اور دلی اطمینان ذکر رسول پاک ﷺ سے ملتا ہے۔اس اعتبار سے تاب سہروردی کا حمدیہ و نعتیہ مجموعہ کلام ''طاب تاب'' صابر شاہ آبادی کے نعتیہ رحمت تمام ،تہذیب منورہ ،رزاق اثر شاہ آبادی کا مجموعہ کلام ''بیاض ثناء''، ڈاکٹر صغریٰ عالم کا حمدیہ و نعتیہ مجموعہ کلام ''محراب دعا'' سید شاہ خسرو حسینی کا نعتیہ مجموعہ کلام ''ورفعنا لک ذکرک'' مولانا ڈاکٹر سید شاہ تاج الدین احمد قادری نوردریا کے دو نعتیہ مجموعے کلام ''انوار مدینہ'' اور ''انوار حرم'' وغیرہ قابل داد ہیں، جنکے مطالعہ سے روحانی سکون و دلی اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

نعت گوئی کی اولین شرط خیالات اور فکرو ذہن کی پاکیزگی ہے جوان شعراء کی نعت گوئی

میں پائی جاتی ہے ان شعراء نے تخلیق نعت گوئی میں اپنی عقیدت مندی کا لہو وصف کر دیا ہے۔ بعض شعراء نے صنف نعت کو کہیں نظم کی ہیئت میں تو کہیں غزل کی اور کہیں قطعات کی ہیئت میں تو کہیں قدیم طرز سخن میں کہی ہیں۔ نعت ان کے جذبات کی آئینہ دار ہے جنھوں نے عشق حقیقی میں ڈوب کر نعتیں کہی ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو، جن میں ان کے عشق حقیقی رسول پاک ﷺ سے والہانہ عشق وعقیدت مندی کا پتہ چلتا ہے۔

محمد مصطفیٰ ﷺ سا کوئی پیدا ہو نہیں سکتا   وہ پیکر قدسی کہ ایسا ہو نہیں سکتا
(مخدوم علی سہروردی تاب)

ترا نام راحتِ قلب و جاں، تری شان جل جلالہ   تری ذات حاصل دو جہاں، تری شان جل جلالہ
(صابر شاہ آبادی)

وہ ایک نام محمد ﷺ وہ ایک اسم رسول ﷺ   ہر ایک غم کا مداوا دکھائی دیتا ہے
(ڈاکٹر رزاق اثر شاہ آبادی)

آقا کی دید چشم تمنا کی عید ہے   نعلین ہیں کہ تخت سلیمان نظر میں ہے
(سرور مرزائی)

میرے تصورات نے ایسا صلہ دیا   دل نے درِ حضور ﷺ پہ لا کے بٹھا دیا
(ڈاکٹر صغریٰ عالم)

جگہ دے دیجئے قدموں میں اپنے ہم غلاموں کو   نہیں ہے اور کوئی بھی ہمارا یا رسول اللہ
(ڈاکٹر سید شاہ خسرو حسینی)

مومنو! سن لو ہماری ایک ہی للکار ہے   حبِ احمد ﷺ ہی نہیں تو زندگی بے کار ہے
(ڈاکٹر سید شاہ نوردریا)

جذبہ عشق بلالی، تو حسینی ہو تڑپ   سرخرو پھر ہو مسلمان مدینے والے
(ڈاکٹر حید انجم)

علاقہ حیدرآباد کرناٹک کے جن شعراء نے غزل، رباعی، نظم، منقبت اور قطعات میں طبع

آزمائی کرکے اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے وہیں روایتاً صنف نعت گوئی میں بھی طبع آزمائی کی ہے اس میں مولوی عبدالرزاق چاق گلبرگوی، حافظ عبدالرشید، سید منہاج الدین شوکت، سلیمان خطیب، ڈاکٹر کے مدنا منظر، پرویز دھمڑی، محبّ کوثر، اعظم اثر، سید شاہ قاسم القادری، فیض الرحمٰن فیض، ماجد داغی، شیدا رومانی، مقبول احمد مقبول وغیرہ بھی اس مقدس کارواں میں شامل ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

جشن میلاد مصطفٰے ﷺ ہے آج — عرش اعظم پہ خوش خدا ہے آج

(چاق گلبرگوی)

حسن آئینہ دار تم سے ہے — عشق دیوانہ وار تم سے ہے

(حافظ عبدالرشید)

نگاہ فیض و کرم کرم رسول ﷺ ہو جائے — جو خار دل میں کھٹکتا ہے پھول ہو جائے

(منہاج الدین شوکت)

دل ہے میرا مدینہ — دل میں تجھے بسائیوں

(سلیمان خطیب)

تمہارے عشق میں جینا، تمہارے عشق میں مرنا — اسے ہم دین کہتے ہیں، اسے ایمان کہتے ہیں

(ڈاکٹر کے مدنا منظر)

کرم کی ایک نظر مجھ پر میرے سرکار ہو جائے — تصور کرتے کرتے آپ ﷺ کا دیدار ہو جائے

(پرویز دھمڑی)

ایماں کی حرارت نے بخش ہے توانائی — جلنے سے نہیں ڈرتا پروانہ محمد ﷺ کا

(محبّ کوثر)

اے نبی میرا وطن ہند ہے جس کے حق میں — آپ ﷺ کہتے تھے مجھے ٹھنڈی ہوا آتی ہے

(ڈاکٹر ماجد داغی)

غرض علاقہ حیدرآباد کرناٹک کے شعراء نے جہاں اصناف سخن غزل، نظم، رباعی، قطعات میں طبع آزمائی کی وہیں ان شعراء نے اس مقدس صنف نعت میں بھی طبع آزمائی کی ہے جس کی بدولت صنف نعت کی سمت ورفتار میں تیز گامی رہی ہے۔□□

حیدر آباد کرناٹک کی خواتین قلم کار

بی بی رضا خاتون
ریسرچ اسکالر شعبہ اردو و فارسی، گلبرگہ یونیورسٹی، گلبرگہ
و لیکچرر۔ شعبہ اُردو، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدر آباد

حیدر آباد کرناٹک کے علاقے کی ادبی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے۔ جتنی کے خود اُردو ادب کی تاریخ لیکن خواتین قلم کاروں کے نام ہمیں بہت بعد میں ملتے ہیں۔ شاعری کے پس منظر پر نظر دوڑائیں تو گلبرگہ کلب کے زمانے کی ایک شاعرہ کا نام ہمیں ملتا ہے طاہرہ یا حمیدہ بانو اور مخفی ان کا تخلص تھا۔ مشہور دکنی شاعر سلیمان خطیب نے اپنے ایک مضمون شور عابدی ''گلبرگہ کلب کا ایک شاعر'' میں ان کا تذکرہ کیا ہے کہ وہ ایک کشمیری ڈاکٹر اور شاعر...... کی اہلیہ تھیں اور پردہ کے پیچھے سے اپنا کلام سنایا کرتی تھیں، لیکن ان کا نمونہ کلام عدم دستیاب ہے۔

آزادی کے بعد ایک اور نام راحت النساء راحت کا ملتا ہے۔ ان کے بارے میں معلومات بہت کم دستیاب ہیں۔ اصلاحی موضوعات پر لکھتی تھیں۔ چند برس پہلے انتقال فرما گئیں۔ اس کے بعد حیدر آباد کرناٹک کی شاعری میں سب سے مقبول و معروف نام صغریٰ عالم کا ہے۔ ان کا شمار ہندوستان کے نمائندہ شاعرات میں ہوتا ہے۔ ان کے چھ شعری مجموعہ شائع ہو چکے ہیں۔ جوحیطۂ صدف، بیت الحروف، حنائے غزل، صفِ ریحان اور محرابِ دعا ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ کفِ میزان بھی منظرِ عام پر آچکا ہے۔ جس سے ان کی تنقیدی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ انہوں نے نظم نگاری بھی کی ہے لیکن بحثیت غزل گو انہیں شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کی پہلی ہی غزل کا شعر ان کے اعلیٰ ادبی ذوق کا پتہ دیتا ہے۔

میں نے پائی ہی نہیں ہجر کے لمحوں کی سزا   میرا محبوب مجھے اپنی کتابوں میں ملا

وہ غزل کی عشقیہ رسومیات کی روایت کی پاسداری کرتی ہوئی نظر آتی ہیں حسن وعشق کے معاملات اور واردات قلبی کا بیان نرم وسبک الفاظ میں ایک گہرا اور دیرپا اثر چھوڑتے ہیں۔

جان جائیں گے کبھی دل کے سلگنے کا سبب   دل کی دہلیز پہ اک دیپ جلائے رکھنا

وہ چھوٹی چھوٹی بحروں میں بڑی خوبصورت غزلیں لکھتی ہیں۔ جس میں بے حد خوبصورت تشبیہات واستعارات کلام میں انگشتری میں نگینے کا سا حسن پیدا کرتے ہیں۔

زندگی کی وہ بات کیا کہئے   کچی نیندوں کے خواب جیسی ہے
کوئی خوشبو تلاش کیا کرتی   گھر کی مٹی گلاب جیسی ہے

ان کی شاعری کے اہم موضوعات، سماجی، تہذیبی سیاسی مسائل ہیں۔ ہندوستان میں فرقہ پرستی اور علاقائیت۔ آج اس مشترکہ تہذیب کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ یہ آپسی بھائی چارہ اور قومی یکجہتی کو دھیرے دھیرے ختم کر رہے ہیں۔ اس طرح کے موضوعات سے شاعرہ کی عصری حسیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

مسجد کی شہادت پہ جو تعمیر کئے ہو   کیا رام کو اس بات پہ تیار کئے ہو

اتنی تلخیوں کے باوجود وہ ہندوستان کا مستقبل روشن دیکھتی ہیں۔

نہ کھیل خون کا، نہ خون کی ہوں ہولیاں   نہ انحراف آدمی، نہ منحرف ہوں بولیاں
نہ آپسی لڑائیاں نہ چل پڑیں گی گولیاں   نہ ہوں گے ہم جدا کبھی نہ بن سکیں گی ٹولیاں
وفا شناس دور کا دلوں میں اہتمام ہو   ملیں گے ہم جہاں جہاں وہ پیار کا مقام ہو

تہذیبی روایات کی زوال پذیری، اخلاقی اقدار کی شکست وریخت اور مادہ پرستی کی وجہ سے انسان کی فطری معصومیت گم ہوتی جا رہی ہے۔ شاعرہ کو شدت سے اس بات کا احساس ہے آج کا انسان دوہری زندگی جی رہا ہے۔ اور وہ اس احساس کا اظہار اپنی شاعری میں کرتی ہیں۔

مٹی کے تھے گھروندے تھے کاغذ کی کشتیاں   معصوم بچے کی ادا کون لے گیا

صغریٰ عالم نے نظموں میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اور چند بہت خوبصورت اور معنی خیز

نظمیں لکھی ہیں۔جن میں کچے رنگوں کی تتلی، تیری ممنون ہوں، تیرا خط ملا، مدرٹریسا خوابِ جمہور، اور قومی یکجہتی اور ہم قابل ذکر ہیں۔نظموں میں انہوں نے ہیئت کے تجربے کئے ہیں۔ایک طرف جہاں کامیاب پابند نظمیں لکھی ہیں وہیں آزاد نظمیں بھی لکھی ہیں۔آزاد نظموں میں بھی قافیہ کے التزام سے نغمگی پیدا کرتی ہیں۔

تیرا خط جو ملا / مجھ کو ایسا لگا / روشنی سے دھلے / عید آئی ہوئی / رنگ لائی ہوئی / چاندنی کی طرح / روشنی کی طرح / رات رنگین ہوئی / آنکھ غم گیں ہوئی

(تیرا خط جو ملا)

اپنے نعتیہ کلام کے ذریعے صغریٰ عالم نے اپنے عشقِ رسول ﷺ اور رسول اللہ ﷺ سے اپنی عقیدت کا پُر اثر اظہار شاعری میں کیا ہے۔

ثنائے محمد لکھی جب بھی ہم نے   تقدس قلم کے قلم دیکھتے ہیں

صغریٰ عالم ادب میں کسی ایک نظرئے کی قائل نہیں ہیں۔انہوں نے خود اپنے تجربے، احساس اور اپنے اِدراک سے زندگی کی ماہیت اور حقیقت کو دریافت کیا ہے اور اسے شعری پیکر میں ڈھالا۔

کبھی نہ ختم ہوں شیریں بیانیاں صغریٰ   حنا کا پھول نہ جانے چبھن کے بارے میں

سمیرا حیدر:

سمیرا حیدر حیدرآباد کرناٹک کی ممتاز خاتون افسانہ نگار ہے۔جن کا تعلق ضلع رائچور سے ہے۔ان کے دو افسانوی مجموعے، گہن خواب اور کلیاں اور قرمزی رشتے، منظر عام پر آچکے ہیں۔اس کے علاوہ ناول، اور چراغ جل اٹھے، زیر تکمیل ہے۔

سمیرا حیدر کا پہلا افسانوی مجموعہ گہن خواب اور کلیاں، 1998ء میں شائع ہوا۔اس میں کل 15 افسانے ہیں۔جن میں، گہن خواب اور کلیاں، دھوپ کے سائباں الاؤ، کشمیری سوئیٹر،

درد کے پودے، ہمراہی، لمحہ لمحہ چراغ، دل رہ گزر پر اک دیا، وہ اک بادل کا ذرا سا ٹکڑا، پلاسٹک کے پھول، رکا ہوا لمحہ، کونپل کونپل، اور کچھ دیر کی آہٹ شامل ہیں۔

اور دوسرا مجموعہ ،قرمزی رشتے ، 2004ء میں منظر عام پر آیا۔ یہ مجموعہ 12 افسانوں پر مشتمل ہے۔ جس میں قرمزی رشتے ،مرادوں والی ، وہ جو کچھ نہ تھا، وہ اک دن، آخری چائے کی پیالی، ٹوٹتی طنابیں، پہیئے کا گھاؤ، دو بیل، سورج کی زنبیل، روز میری، کچھ ہوا نہیں ہے، خود آشنا شامل ہیں۔

سمیرا حیدر کے افسانوی میں رومانیت غالب ہے۔ وہ افسانوں کی دنیا میں کرشن چندر سے بہت متاثر ہیں۔ گہن خواب اور کلیاں ، کے پیش لفظ میں یوں رقمطراز ہیں۔

''اُردو ادب کی مشہور بوقلموں دنیا میں مجھے جس ادیب نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ کرشن جی تھے ان کا کوئی بھی افسانہ میں پڑھتی تو لگتا جیسے مجھ پر ایک سحر سا طاری ہو گیا ہو۔''

یہ اثر ان کے افسانوں میں بھی صاف نظر آتا ہے۔ کرشن چندر کی ہی طرح ان کے افسانوں میں رومانیت غالب ہے۔ جس کا اعتراف خود مصنفہ نے کیا ہے۔ لیکن وہ صرف رومانیت کے حد تک ہی کرشن چندر سے متاثر نہیں ہیں بلکہ زبان میں شعریت بھی کرشن چندر کی تحریروں کا ہی اثر ہے۔ وہ تشبیہاتی اور استعاراتی زبان لکھتی ہیں۔ جس سے ان کی زبان میں شعریت پیدا ہو گئی ہے۔ چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

''باہر اندھیرا لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا تھا۔ مگر دل کی شاہ راہ کسی کی یادوں سے منور تھی''۔

(قید خانوں کے معمار ص 85 گہن خواب اور کلیاں)

''میں ڈرتا تھا کہ کہیں میرے تصورات کی پھولوں بھری وادیاں جو لی کی ایک نا سے صحرا کی طرح ویران نہ ہو جائیں۔

(لمحہ لمحہ چراغ ص۵۹ گہن خواب اور کلیاں)

''کتنی پیاری دیدی، جیسے چمپا کی مہک، جیسے جگنو کی چمک، جیسے کوئل کی لہک''

(دیدی ص۹۱ گہن خواب اور کلیاں)

ثمیرا حیدر کے افسانوں میں خواتین کرداروں کو مرکزیت حاصل ہے۔ان کے زیادہ تر کردار متوسط طبقہ سے تعلق رکھنے والے نوجوان،نوکری پیشہ شہری ہوتے ہیں۔خاص کر خواتین کے کردار بڑے جاندار ہیں۔اپنی تمام تر خوبیوں،خامیوں جذبات و احساسات کے ساتھ زندگی گذارتے ہیں۔کہیں'دیدی' جیسی ممتا اور ایثار و قربانی کی مورت،اپنے وجود اور اپنی خوشیوں کی تلاش میں سرگرداں فرحین اور انجلی رائے،اکیلے پن کے کرب سے جوجھتی سدھا اور مہر بانو،ممتا کے احساس سے سرشار چھوٹی دلہن سب ہی حقیقی معلوم ہوتے ہیں۔

مصنفہ چونکہ خود ایک خاتون ہیں اس لئے وہ خواتین کے جذبات،احساسات اور خوابوں کو افسانے کے کینوس پر خوبصورتی سے اتارتی ہیں۔ان کے پہلے افسانوی مجموعہ''گہن خواب اور کلیاں'' کے مقابلے میں دوسرے افسانوی مجموعے،''قرمزی رشتے'' میں ان کی فکر اور فن دونوں میں بتدریج ارتقاء نظر آتا ہے۔انسانی رشتوں کی کشمکش،فسادات کی آگ میں جھلسے لوگوں کی ذہنی کیفیات، بے نام رشتوں کی صدائیں، ماضی کی یادیں،شہری زندگی کے بدنما پہلو، جنگوں کی تباہ کاریاں اور خود کی شناخت بنانے اور خود اختیاری کی راہ پر گامزن خواتین،مصنفہ کی فکری و ذہنی پختگی کا ثبوت دیتے ہیں۔انہوں نے دوسرے مجموعے میں روایتی انداز کے علاوہ علامتی طرز کے افسانے بھی لکھے جن میں آخری چائے کی پیالی اور سورج کی زنبیل،اہم ہیں۔

کوثر پروین:

کوثر پروین حیدرآباد کرناٹک کی اہم خاتون افسانہ نگار ہیں جن کا تعلق شہر گلبرگہ سے ہے۔اب تک ان کے دو افسانوی مجموعے ہلچل سی کوئی،بن باس شائع ہو چکے ہیں اور ایک افسانہ ''رحل'' ناول ''کسک'' زیر طبع ہے۔

ہلچل سی کوئی، ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 1984ء میں شائع ہوا۔ جس میں بارہ افسانے سفر چاندنی کا زخم، دوڑتے دوڑتے، تفاوت، احساس کی ہلچل، راکھ تلے، وہ دیکھو جارہا ہے کوئی، حامی، روح کے چھالے، دوسری کروٹ، بارِصدف دھوئیں ہی دھوئیں میں شامل ہیں۔

دوسرا افسانوی مجموعہ 'بن باس' 1988ء میں منظرِعام پر آیا۔ اس میں 16 افسانے، آنکھیں، ادراک، اُف، بن باس، براوقت، پاگل، پہیہ، تمغہ، خلیفہ خدا، خون، ذات، زرد پتے، کھڑکی، گمان، دار پر، میلہ اور وجود شامل ہیں دونوں افسانوی مجموعوں کے مطالعے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کا فن تغیر پذیر ہے۔ انہوں نے روایتی انداز میں خالص بیانیہ افسانے بھی لکھے ہیں اور جدید افسانے کے پیرایہ اظہار کو اپناتے ہوئے علامتی افسانے بھی تخلیق کئے ہیں۔

ان کی زبان سادہ اور اسلوب دلکش ہے۔ اختصار ان کے افسانوں کی خصوصیت ہے۔ اختصار کے باوجود ان کے افسانوں میں جامعیت اور وحدتِ تاثر پایا جاتا ہے۔ وہ لفظوں کی کفایت شعار ہیں کم الفاظ سے زیادہ سے زیادہ معنی پیدا کرنے کے ہنر سے بخوبی واقف ہیں۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں موجود گہرائی وگیرائی مصنفہ کی انسانی زندگی کے گہرے مطالعے وہ مشاہدے کا ثبوت دیتی ہے۔ اور طنز کی ہلکی سی چبھن ایک حساس اور باشعور انسان کا ذہنی ردِعمل ہے جو حالات کے بدلاؤ کا متقاضی ہے۔ کچھ مثالیں پیش ہیں۔

''واقعی اگر موت سحر ہے تو زندگی کو رات بھر ہر رنگ میں جلتے رہنا پڑے گا''

''نہیں بیٹے کھیتی باڑی میں ہم خون سینچ کر فصل اگاتے ہیں۔ مگر پیٹ بھر کر کھا نہیں سکتے۔''

''اس لئے کہ جذبات کی دنیا اور حقیقت کی دنیا میں ہمیشہ کا بیر ہے''

کوثر پروین کی تخلیقی زبان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اشعار کا نثر میں بخوبی استعمال کرتی ہیں۔ خوبصورت استعاروں اور تشبیہات سے زبان میں دہری معنویت پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کی کچھ مثالیں پیش ہیں۔

''اور آنکھوں میں درد کا سمندر تھا۔ جس میں کرب کی لہریں تھیں اور جبر کے ساحل سے ٹکرا کر واپس ہو رہی تھیں''

''باجی کے سرخ سرخ گال مائل بہ سیاہ ہو گئے کلی پھول بنتے ہی مرجھا گئی تھی''

''وہ اس ساکت جھیل کی مانند تھا جس میں نہ بے چین لہریں تھیں نہ ٹھاٹھیں مارتا پانی''۔

موضوعات کی سطح پر کوثر پروین کے افسانوں میں تنوع ہے۔ ایک طرف جہاں انہوں نے ہلکے پھلکے رومانی افسانے لکھے ہیں۔ وہیں بے روزگاری، عدم تحفظ، فرقہ وارانہ فسادات، جنگ کی تباہ کاریاں، دہشت گردی، ہتھیاروں کی دوڑ، جرائم، تہذیب کی زوال پذیری اخلاقی اقدار کی شکست و ریخت وغیرہ جیسے، موضوعات مصنفہ کی عصری حسیت اور گہرے مشاہدے کا بین ثبوت ہیں۔

ان کے رومانی افسانوں کی خصوصیت یہ ہیکہ ان کا انجام Tragic ہوتا ہے۔ ہیرو اور ہیروئن مل نہیں پاتے ہیں۔ ایک دوسرے سے بچھڑنے کے بعد دلوں میں درد و کسک کے لے زندگی گذارتے نظر آتے ہیں۔

کوثر پروین نے علامتی اور تمثیلی انداز کے افسانے لکھے ہیں جن میں آنکھیں دوڑتے دوڑتے 'میلہ' تفاوت اور خون وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان کا افسانہ آنکھیں کرشن چندر کے افسانے مہالکشمی کا پل کی یاد دلاتا ہے۔ جس میں کرشن چندر نے مختلف رنگوں کی لٹکتی ہوئی ساڑیوں کے ذریعے انہیں پہننے والی خواتین کی زندگیوں کی بے رنگی کو بیان کیا ہے جو کہ ایک انوکھا اور دلکش اسلوب ہے۔

رخسانہ نازنین:

رخسانہ نازنین کا تعلق بیدر سے ہے۔ بتایا گیا ہے کہ ان کے سو (100) سے زیادہ افسانے رسائل اور اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں کئی قومی رسائل بھی شامل ہیں۔ وہ 1992ء سے افسانے لکھ رہی ہیں۔ ان کے اہم افسانوں میں ''مسکرا اٹھی حیات''

مسیحا مل گیا، زندگی لے کے تو کہاں آئی اور شمع عزم وغیرہ ہیں۔

رخسانہ نازنین نے بھی سماجی مسائل کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا ہے۔ جیسے جہیز۔ فسادت، دولت اور محبت کی کشمکش وغیرہ ان کے اہم موضوعات ہیں۔ اپنے قلم کے ذریعے سماج میں ہونے والی برائیوں کے خلاف آواز اٹھانا چاہتی ہیں۔ ان کے افسانوں کی تعداد تو زیادہ ہے لیکن اب تک ان کا کوئی افسانوی مجموعہ منظرِ عام پر نہیں آیا۔

ریحانہ تبسم تاج::

ریحانہ تبسم کا تعلق بھی بیدر سے ہی ہے۔ انہوں نے 50 سے زائد افسانے لکھے ہیں جو مختلف رسائل واخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن تا حال ان کا کوئی مجموعہ منظر عام پر نہیں آیا۔ ان کے افسانوں میں تریاق، طمانچہ، جواب نیرنگیٔ تقدیر فنکار، امانت وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کے افسانوں کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تانیثی Feminist نظریات کی قائل ہیں۔ خواتین کے حقوق مساوات ظلم وزیادتی، بیٹیوں کو بوجھ سمجھا جانا، اُن کے پسندیدہ موضوعات ہیں یہ ادب کو اصلاح معاشرہ کا ایک موثر ذریعہ سمجھتی ہیں۔

رعنا متین:

رعنا متین گلبرگہ کی افسانہ نگار ہیں۔ انہوں نے اپنی افسانہ نگاری کا آغاز 1990ء سے کیا۔ ادب میں افسانوں کے علاوہ شاعری کا بھی شغف رکھتی ہیں'' درد کی چھاؤں تلے'' پنکھ تم پرواز ہم'' گرہن کا چاند، پرائی کرن، چارہ گر وغیرہ ان کے قابل ذکر افسانے ہیں۔ تا حال ان کا کوئی افسانوی مجموعہ تو منظر عام پر نہیں آیا لیکن یہ ملک کے مختلف رسائل واخبارات میں چھپتی رہتی ہیں۔ جہاں ایک طرف رومانیت ان کے افسانوں پر چھائی ہوئی ہے تو دوسری طرف چھوٹے چھوٹے گھریلو مسائل کو وہ اپنا موضوع بناتی ہیں۔

نفیس بانو:

نفیس بانو کا تعلق بھی گلبرگہ سے ہے 1983ء سے ان کے ادبی سفر کا آغاز ہوتا ہے۔

اور تقریباً دو دہائیوں تک وہ افسانہ نگاری میں مصروف رہیں افسانوں کے علاوہ انہوں شاعری میں بھی طبع آزمائی کی اور تنقیدی مضامین بھی لکھے۔

نفیس بانو کے افسانوں کے موضوعات میں خواتین کے مسائل سب سے اہم ہیں علاوہ ازیں سماجی مسائل، انسانی نفسیات بھی ان ے پسندیدہ موضوعات ہیں۔ ان کے افسانوں میں ادھورا خواب، شکستہ آرزو، اور پچھتاوا، اہم ہیں۔ وہ کہانی کہنے کے فن سے، بخوبی واقف ہیں۔ وہ اپنی کہانیوں میں قاری کی دلچسپی کو آخر تک بنائے رکھتی ہیں۔

ان کے علاوہ شمیم ثریا، زبیدہ بیگم، نجمہ شاہین، صبیحہ خانم، قدسیہ نکہت، زینت ساجدہ، شہناز سلطانہ، خدیجہ ناز، ہاجرہ پروین اور نور جہاں نور صبا، روبینہ تسنیم وغیرہ شامل ہیں۔

آخر میں میں یہ کہوں گی کہ ادبی سرمایہ کسی بھی قوم کا بہترین سرمایہ ہوتا ہے اسی سرمائے کو محفوظ کر کے اگلی نسلوں تک پہنچانا ہمارا اخلاقی فریضہ ہے۔ حیدرآباد کرناٹک کی خواتین قلم کاروں کے باب میں اپنی بات اقبال کے اُس مصرعے پر ختم کروں گی کہ" ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی"۔ ☐☐

حیدر آباد کرناٹک میں
الیکٹرانک میڈیا اور اردو

سید عبدالحکیم ساغر
ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو وفارسی، گلبرگہ یونیورسٹی گلبرگہ

میڈیا دراصل انگریزی لفظ میڈیم کی جمع ہے۔ جس کے معنی ذرائع کے ہیں۔ جہاں تک الکٹرانک میڈیا کا معاملہ ہے اسکے بغیر آج کا سماج ایسا ہی ہے جیسے بغیر روح کے جسم۔ میڈیا کو ہم دو خانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ اول پرنٹ میڈیا اور دوم الیکٹرانک میڈیا' پرنٹ میڈیا دراصل کاغذ پر شائع ہونے یا پرنٹ ہونے کے ذرائع کا نام ہے۔ مثلاً روزنامے' ہفتہ وار' ماہ نامے' سالانہ رسالے اور درسی کتب وغیرہ۔ اسی طرح الیکٹرانک میڈیا کے زمرے میں وہ مشینی آلات ہیں جو نہ صرف برقی توانائی سے کام کرتے ہیں۔ بلکہ بیک وقت زمین کے کئی خطوں تک اطلاعات یا معلومات کو فراہم کرتے ہیں۔ مثلاً فیچر فلمیں، ریڈیو' ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ وغیرہ۔

میرے مقالے کا موضوع چونکہ ''حیدر آباد کرناٹک میں الیکٹرانک میڈیا اور اردو'' ہے موضوع کی مناسبت سے الیکٹرانک میڈیا کے آغاز وارتقاء کا اختصار کے ساتھ جائزہ لینا مناسب سمجھتا ہوں۔

سنیما جب پاؤں پاؤں چل رہا تھا تبھی سے اس نے اردو کو اپنا ذریعۂ اظہار بنایا۔ متکلم سنیما پارسی تھیٹر کی دین ہے۔ جبکہ پارسی تھیٹر میں اردو کا چلن رہا ہے اور اس طرح بنیادی طور پر سنیما کا اردو کے ساتھ ایک ازلی رشتہ قائم ہو گیا ہندوستان میں پہلی خاموش فلم پیش کرنے کا سہرا دادا صاحب پالکی کو جاتا ہے۔ جنہیں ہندوستانی فلموں کا باوائے آدم کہا جاتا ہے۔ جنہوں نے 5 ہزار فٹ

لمبی فلم راجہ ہریش 1913ء میں بنائی تھی۔

جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے ہندوستان میں سنیما کو مقبولیت کا تاج پہنانے میں اردو کا کردار اہم رہا ہے ہندوستانی سنیما نے خاموش دور کی زنجیریں توڑ کر متکلم عہد میں قدم رکھا اور ہماری اولین فلم ''عالم آرا'' 14/مارچ 1931ء کو پردہ سیمیں کی زینت بنی تو اسکے جسم میں سب سے پہلے اردو زبان نے روح پھونکی اور عوام نے اس فلم کی تہہ دل سے پذیرائی کی۔فلم عالم آرا کے خالق اردشیر ایرانی اور فلم ساز ادارہ امپریل فلم کمپنی تھا۔یہ ''عالم آرا'' پرمبنی تھی جبکہ اسکے مکالمے منشی ظہیر نے تحریر کئے تھے۔

فلم عالم آرا سے لیکر آج تک قومی اور علاقائی زبانوں میں لاکھوں فلمیں تیار کی گئی جن میں اکثر فلمیں سماج کی سچی آئینہ دار ہوا کرتی ہیں۔فیچر فلمیں شاید اسی بناپر الیکٹرانک میڈیا کا اہم وسیلہ ثابت ہوئیں۔حیدرآباد کرناٹک میں اردو کے حوالے سے کیا کسی نے اس الیکٹرانک میڈیا کے ذریعہ سے اردو کی نمائندگی کی ہے۔

راقم الحروف کو چند سال قبل دکنی ادب کے معروف شاعر محمد سلیمان خطیب مرحوم کے حالات زندگی پر ڈاکیومنٹری فلم بنانے کا اتفاق ہوا۔اسکرپٹ لکھنے کے دوران میرے علم میں یہ بات آئی کہ محمد سلیمان خطیب حیدرآباد کرناٹک کے وہ واحد شاعر ہیں جنہوں نے کرن جوہر کی فیچر فلم ''مزے لے لو'' میں ایک مزاحیہ مشاعرے میں اپنا کلام سنایا تھا۔آپکے بعد سے کسی فنکار نے فیچر فلموں میں یہاں سے اردو کی نمائندگی نہیں کی ہے۔

بعد ازاں ریڈیو الیکٹرانک میڈیا کا سب سے زیادہ طاقتور وسیلہ بن کر وجود میں آیا۔ ریڈیو بیسویں صدی کی وہ اہم ایجاد ہے جس نے انسانی ذہن پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔یہ ماس میڈیا کا ایک ناگزیر حصہ ہے جسکے ذریعہ ہم سکنڈوں میں سامعین کے درمیان پہنچ جاتے ہیں۔ اس میڈیم کے ذریعہ ہم عوام کے سبھی طبقوں سے مختلف پروگراموں کے ذریعہ مخاطب ہوتے ہیں۔ جس میں ان کی دلچسپی اور معیار کا خیال رکھا جاتا ہے۔خبروں' تفریحی اور معلوماتی پروگراموں کے

ذریعے ہم سامعین تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔

ہندوستان میں نشریات کی ابتداء سے اردو کو یہ شرف حاصل رہا ہے کہ اسے ترسیل کی زبان کے طور پر استعمال کیا گیا۔ خواہ اسے اس زمانے میں ہندوستانی ہی کیوں نہ کہا جاتا تھا لیکن ہندوستانی اردو ہی کا دوسرا نام ہے۔ دوسری طرف اس خوش قسمتی سے اس نئے ماس میڈیم کے آغاز میں پطرس بخاری اور ان کے احباب کے علاوہ اردو زبان و ادب کے ایسے درخشاں ستارے ملے جنہوں نے اس نئے میڈیم کے تقاضوں کو تابانی بخشی یہ اردو کا وہ دور ہے جس میں بڑے بڑے ادیب شاعر اور ناقد پیدا ہوئے۔

جہاں تک حیدر آباد کرناٹک علاقے کا معاملہ ہے اس کے حدود میں تین شہر رائچور، بیدر اور گلبرگہ آتے ہیں۔ شہر رائچور اور بیدر میں کوئی ریڈیو اسٹیشن ابھی تک قائم نہیں ہو سکا البتہ شہر گلبرگہ میں 1973ء سے آل انڈیا ریڈیو کے ذریعہ اردو سروس کا آغاز ہوا۔ شروعات میں پروگرام تو یہاں سے بنتے تھے مگر نشر آل انڈیا ریڈیو دھارواڑ سے ہوا کرتے تھے۔ گلبرگہ میں آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن صرف ریلے اسٹیشن کا کام کیا کرتا تھا بعد میں ہفتہ میں دو پروگرام گلبرگہ میں نہ صرف تیار کئے جانے لگے بلکہ باقائدہ طور پر آل انڈیا ریڈیو گلبرگہ سے پروگرام نشر بھی ہونے لگے اور مہینے میں دو پروگرام آل انڈیا ریڈیو دھارواڑ سے نشر ہونے لگے اس طرح مہینے میں چار بار حیدر آباد کرناٹک علاقے میں یہاں کے سامعین کو اردو پرگراموں کو سن کر لطف اندوز ہونے کا شرف حاصل ہوتا آرہا ہے آل انڈیا ریڈیو کا قدیم پروگرام ''شیراز گل'' ہے جو ہر اتوار رات 9:30 سے 10:00 بجے نشر ہوا کرتا ہے جس میں مشاعرے، افسانے، خاکے، ریڈیو ٹاک، انٹرویوز کے علاوہ ادبی و مذہبی پروگراموں کو پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ''میرا مقصد حیات'' نامی پروگرام میں ایسے متحرک نوجوانوں کو پروگرام میں شامل کیا جاتا ہے جو اپنے روشن مستقبل کی تلاش میں ہیں۔

آل انڈیا ریڈیو گلبرگہ کے اردو پروگراموں میں شرکت کرنے والے یوں تو حیدر آباد کرناٹک علاقے کے کئی ایک قلمکار ہیں جنہوں نے ادب کے کئی اصناف پر اپنے گراں قدر خدمات انجام

دیتے آئے ہیں جن میں شہر گلبرگہ سے ابراہیم ماموں، سلیمان خطیب، مجتبیٰ حسین، وہاب عندلیب، راہی قریشی، خمار قریشی، حمید سہروردی، جلیل تنویر، اکرم نقاش، وحید انجم، شمیم ثریا، خالد سعید، حمید الماس، فہیم پیرزادہ، صغریٰ عالم، محبّ کوثر، صبیح حیدر صبیحؔ، حکیم شاکر، عبدالحمید اکبرؔ، حامد اکمل، خلیل مجاہد، طیب یعقوبی، کوثر پروین، ماجد داغی، منظور احمد دکنی، وغیرہ نے ریڈیو جیسے الیکٹرانک میڈیم پر اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ جہاں تک نظامت کا معاملہ ہے وہ کسی بھی پروگرام کی کامیابی کی ضمانت ہوتی ہے۔ آل انڈیا ریڈیو گلبرگہ پر کم وبیش ایک دہے تک فہیم پیرزادہ، حکیم شاکر اور محبّ کوثرؔ نے اپنی جادو بھری آواز کے ذریعہ نظامت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ انکے بعد تقریباً دو دہوں سے محترمہ نصرت جہاں صاحبہ اپنے مخصوص لب ولہجہ میں نہایت کامیابی کے ساتھ آل انڈیا ریڈیو گلبرگہ پر نظامت کے فرائض بحسن خوبی انجام دیتی آرہی ہیں۔ شہر گلبرگہ سے ہٹ کر اس کے تعلقہ جات میں بھی اردو کے کئی فنکار موجود ہیں جنہوں نے آل انڈیا ریڈیو گلبرگہ میں اپنی صلاحیتوں کا مظاہر کیا ہے۔

شاہ آباد سے صابر شاہ آبادی جواہر تماپوری، الیاس صابری، محمد عبدالرزاق اثر، تسکین شاہ آبادی، پرویز دھمڑی وغیرہ ہیں۔ موضع واڑی سے AH ثنا بھنڈاری، ماجد داغی، تعلقہ چیتاپور سے ظہیرالدین بابر، تعلقہ یادگیر سے فضل افضلؔ، رفیق سوداگرؔ، صابر فخرالدین وغیرہ، تعلقہ شوراپور سے قاضی انورؔ، تنہا تماپوری وغیرہ، تعلقہ شاہ پور سے اعظم اثرؔ، فضل الرحمٰن شعلہ وغیرہ اور النڈ سے ڈاکٹر وحید انجم اور واجد اختر صدیقی وغیرہ نے AIR گلبرگہ کے اردو پروگراموں میں حصہ لیا ہے۔

شہر رائچور کے فنکاروں میں سید قاسم القادری، ناظم خلیلی، ظہیر بابا یار، شیدا رومانی، افتخار شکیل، ہمیرا حیدر وغیرہ ہیں۔ ضلع بیدر سے اکرام باگ، خالد سعید، محسن کمالؔ، ابراہیم خلیلؔ، ظہیر احمد خاںؔ، حشمت فاتحہ خوانی وغیرہ نے اردو کے ذریعہ اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔

ٹیلی ویژن الیکٹرانک میڈیم کا سب سے زیادہ طاقت ور ذریعہ کہلایا جاتا ہے اس کا

جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ کرناٹک کے صدر مقام بنگلور میں 1984ء میں سابق وزیر اعظم ہند آنجہانی اندرا گاندھی نے بنگلور دوردرشن کا افتتاح کیا۔ اور اسی وقت سے اردو پروگراموں کی نشریات کا آغاز ہوا تو حیدر آباد کرناٹک کے نامور ادباء و شعراء نے بھی اس میڈیم کے ذریعہ اپنے فن کا لوہا منوایا بالخصوص راقم الحروف کی اردو دستاویزی فلم ''گلبرگہ ایک تاریخی شہر'' کے نام سے دوردرشن بنگلور کی پہلی اردو دستاویزی فلم ہے جو بالترتیب 8 اور 17 ستمبر 1998ء کو ٹیلی کاسٹ کی گئی جو 29 منٹ کے دو Episode پر مشتمل تھی اس کے بعد اکتوبر 1999ء میں سیرت باشاہ قادری بلکٹہ شریف کے حالات زندگی پر اردو دستاویزی فلم پیش کی گئی اکتوبر 2003ء عیسوی میں دکنی کے عظیم شاعر سلیمان خطیب مرحوم کے حالاتِ زندگی پر مبنی اردو ڈاکیومنٹری فلم ''کیوڑے کا بن'' بھی بنگلور دوردرشن سے ٹیلی کاسٹ کیا گیا۔ اس کے علاوہ راقم الحروف نے مولانا آزاد اردو یونیورسٹی کے زیر اہتمام شہر گلبرگہ کی تاریخ اردو کے حوالے سے ایک اردو دستاویزی فلم تیار کی ہے۔ جس کا موضوع ہے ''شہر گلبرگہ علم و ادب کا گہوارہ'' عنقریب اردو دوردرشن پر ٹیلی کاسٹ کی جائے گی۔ شہر گلبرگہ میں خود ایک ٹی وی اسٹیشن ہے جو روز 6 سے 6:30 بجے تک آدھے گھنٹے کا پروگرام کنڑ زبان میں ٹیلی کاسٹ کرتا ہے مگر اس کا رینج صرف 40 کلومیٹر تک محدود ہے لیکن باوجود کنڑا چینل ہونے کے خصوصی پروگرامس اردو میں یہاں سے ٹیلی کاسٹ کئے جاتے ہیں جن میں عیدوں اور تہواروں کے موقعوں پر پروگرامس پیش کیے جاتے ہیں اس کے علاوہ 2000ء میں شہر گلبرگہ میں سٹی چینل کا قیام عمل میں آیا تب سے آج تک راقم الحروف اردو ہندی پروگرام ڈائرکٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے آرہا ہے جن میں ادبی، مذہبی، معلوماتی، سیر و تفریحی کے علاوہ انٹرویوز وغیرہ شامل ہے جن کی مجموعی تعداد 100 سے تجاوز کر جاتی ہے جہاں تک انٹرنیٹ میڈیم کی بات ہے اس کے ذریعہ گلبرگہ شہر کے دو اردو اخبارات روزنامہ ''انقلاب دکن'' اور روزنامہ ''کے بی این ٹائمز نے اپنی اردو صحافتی خدمات کو اپنے مخصوص ویب سائٹس کے ذریعہ انٹرنیٹ پر ساری دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ ▢▢

صغریٰ عالم کی شاعری تانیثیت کے تناظر میں

فریدہ بیگم

ریسرچ اسکالر،شعبۂ اردو وفارسی،گلبرگہ یونیورسٹی،گلبرگہ

تانیثیت femenism مغرب کی دین ہے لیکن اسکے گہرے اثرات مشرق پر بھی پڑے۔ جس کے نتیجہ میں حقوق نسواں کی آوازیں بلند ہونے لگیں اور یہ رجحان اپنے حق اور جائز مطالبات کی جدوجہد کرنے لگا۔ اسطرح یہ ادب میں شامل ہو گیا۔ تانیثیت کے معنٰی ومفہوم کی وضاحت بھی ضروری ہے جہاں تک تانیثیت کی اصطلاح جو مغرب میں اٹھارویں صدی میں وجود میں آچکی تھی۔ 1779ء انقلاب فرانس کونسوانی تحریک کا نقطۂ آغاز کہا جاسکتا ہے۔ تانیثی رجحان کے تعلق سے دو رویئے کام کرتے ہیں ایک وہ رویّہ ہے جو مرد تخلیق کاروں نے خواتین کے مسائل اور ان کے حق کیلئے لکھتے رہے۔ دوسرا وہ رویہ ہے جو خالص خواتین کے مسائل خواتین کے جذبات واحساسات اور ان کی نفسیات خاتون ہی کے ذریعہ تخلیق کیا گیا ادب ہو۔ تانثیت کے زمرہ میں تصور کیا گیا ہے۔

تانیثی ادب کا بغور مطالعہ کریں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ مرد اساس معاشرہ میں جو ادب تخلیق کیا گیا وہ مرد ہی کے نقطۂ نظر سے پیش کیا۔ جبکہ خواتین کے بعض مسائل ایسے ہیں جو مرد تخلیق کار انصاف نہیں کر سکتے۔ جیسے ممتا کا جذبہ' سوت کو برداشت کرنا' بابل سے جدائی' بچپن کی یادیں' شوہر کی بے وفائی وغیرہ وغیرہ۔ چونکہ خواتین کے نقطۂ نظر کی بازیافت اور اسکی تلاش تانیثیت یا نسائیت کہلائی۔

مغرب میں دونوں رویے یکساں کام کرتے رہے ہیں دراصل مغربی ماحول اور معاشرہ میں خواتین کو آزادی خیال کے پورے مواقع فراہم تھے۔ لیکن مشرق میں مرد حضرات کی بالا دستی نے اپنا ڈیرہ جمایا ہوا تھا اور اسی لئے خواتین کو آزادئ خیال کے پورے مواقع فراہم نہیں تھے۔ مشرق میں شروع ہی سے مرد غالب معاشرہ رہا ہے۔ اور مرد قلم کار ہی خواتین پر لکھتے رہے۔ اور یہ سلسلہ بیسویں صدی تک چلتا رہا۔ اسکے بعد خواتین بھی اس میدان مین باضابطہ طور پر حصہ لینے لگیں اور اپنی حیثیت کو منوانے لگیں۔ یوں تو جس وقت سے خواتین نے لکھنا شروع کیا تانیثی جذبات شعوری ولاشعوری طور پر خواتین ادب میں شامل ہوتے رہے ہیں لیکن انہیں کسی نام سے موسوم نہیں کیا گیا۔ جب تانیثیت کی اصطلاح باضابطہ طور پر مغرب سے سفر کرتے ہوئے۔ بیسویں صدی میں 1960ء کے بعد مشرق میں داخل ہوگئی تو مشرقی ادب میں خواتین کے نقطۂ نظر کی تلاش اور اسکی بازیافت ہونے لگی۔ بیسویں صدی تک اردو ادب میں جتنا بھی ادب خواتین پر لکھا گیا وہ مرد ہی کے نقطۂ نظر سے لکھا گیا تھا خواتین صرف تماشائی یا قاری کی حیثیت سے شامل تھیں جو تانیثی پہلا رویہ رہا۔ جبکہ مغرب میں اٹھارویں صدی ہی سے دونوں رویۂ کام کر رہے تھے۔ مشرقی خواتین نے جب محسوس کیا کہ مرد تخلیق کاروں نے جو کچھ لکھا ان میں چونکہ مرد ادیب عورتوں کے مسائل پر مردانہ فہم وشعور وادراک۔ جنسی وسماجی فوقیت اور شخصی طبعی عوامل اپنی انا و بہادری وغیرہ کے پس منظر میں سوچتے اور اپنے نظریات کو حاوی رکھ کر ان کے حل بتاتے رہے۔ بسا اوقات کہیں کہیں انصاف کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ اسکے باوجود تانیثی ادب کے صحیح قد و خال خواتین ادب میں نمایاں نظر آنے لگے جو دوسرا رویہ ہے۔

مذکورہ بالا رویوں میں دوسرا رویہ جو خواتین ہی کیلئے مخصوص ہے دراصل میرا مقصد بھی اسی رویہ پر روشنی ڈالنا ہے جو خواتین کے نقطۂ نظر سے پیش کیا گیا ہے۔ دراصل میرے مقالہ کا عنوان اسی روشنی میں ترتیب دیا گیا ہے کہ صغریٰ عالم کی شاعری میں نسائیت اور تانیثیت' کا جذبہ کارفرما ہے۔

چونکہ خواتین کے تانیثی ادب میں دو قسم کے جذبات پائے گئے ایک وہ جذبہ ہے جو لطیف، نازک، جمالیاتی حسن لئے ہوئے عشق وحسن اور وارداتِ قلبیہ پر منحصر ہے جسے نسائیت کا نام دیا گیا۔ایک وہ جذبہ جس میں مرد اساس معاشرہ کے خلاف سماجی عدم مساوات اور ازدواجی نا انصافیوں کیخلاف احتجاجی صورت میں عیاں ہوئے ہیں ان جذبات کو تانیثیت کہا گیا۔

جب خواتین کو شعورِ ذات اور اپنی انفرادیت کا احساس ستانے لگا تو انہوں نے اپنے قلم کو اپنا ہتھیار بنایا اور اپنے خیالات احساسات وجذبات کو ڈھال بنا کر اپنے حق کا مطالبہ کیا۔تو ہر طرف مخالفت کی آوازیں اٹھنے لگیں۔ان آوازوں شور وغل کے درمیاں چند خواتین نے اپنی ہمت کا مظاہرہ دیدہ دلیری کے ساتھ کرتے ہوئے اپنے قلم کو ہاتھوں سے گرنے نہیں دیا۔جن میں اے ار خاتون، سروجنی نائیڈو، امریتا پریتم، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی۔شکیلہ اختر، جمیلہ ہاشمی، خدیجہ مستور، ممتاز شیریں اور شاعری میں ادا جعفری، پروین شاکر، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، سارا شگفتہ، زاہدہ زیدی، ساجدہ زیدی، شفیق فاطمہ وغیرہ خواتین اپنی تخلیقات اپنے ادب کے ذریعہ اپنے جذبات وخیالات اور اپنی بات کو منوانے کی سعی کرتی رہیں۔ان باہمت عظیم خواتین میں ایک نام حیدرآباد کرناٹک کی شاعرہ صغریٰ عالم کا بھی ہے جو منفرد لب ولہجہ کی مالک ہیں۔سرزمین گلبرگہ کی بلند پایہ شاعرہ اور ادیبہ ہیں۔آپ کو شعر وادب سے بچپن ہی سے دلچسپی رہی ہے۔اور آپ غزلوں، نظموں، نعتوں، منقبتوں میں اپنا منفرد مقام بنا چکی ہیں۔اور انہیں عروض پر بھی دست رس حاصل ہے۔انہوں نے اپنے فکر وفن اور منفرد انداز شاعری کے میدان میں اپنے قدم جمائے۔کسی شاعر نے سچ ہی کہا ہے

جن سے ہو جشنِ چراغانِ فکروفن　　　لوحِ زماں پہ ایسے خیالوں کے نام لکھ

صغریٰ عالم تہذیب وتاریخ کے شعور وادراک سے پوری طرح بہرہ ور جو ہماری ماضی کی عظمتوں کی رمز آشنا تو حال کی کیفیتوں کی رازداں اور مستقبل کی امکانی رفعتوں آرزومند اپنی

شاعری کے ذریعے مختلف النوع موضوعات کو پیش کر کے اپنی انفرادیت کو منوایا ہے۔ جس میں خیال وفکر کی خوشبو بھی ہے اور تابنا کی بھی جس میں عمل وکردار کی حرارت بھی ہے اور توانائی بھی خواتین کے ارادوں کو مستحکم بنانے کی ان کی دورس فکر اور ان کے مسائل کو حل کرنے کی سعی پیہم جستجو بھی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

بادبانوں میں ہے آنچل کو مہک پاکیزہ	خود ہی کشتی میں اتر آئے ہواؤں والے
سراب دیکھنے آئیں گے اب سمندر بھی	سنہری ریت کو اپنا بنا کے آئی ہوں
خوش بخت خوش خصال وخوش رنگ خوش گوار	گھر کی مری بہشت کا رضوان مجھ میں ہے
چنے گی برگ حنا سرخ روسی وہ لڑکی	چبھن کو خار کی دل سے نکال آئے گی

ان اشعار میں صغریٰ عالم خواتین کو جینے کا ہنر دیتی ہیں اور انکی ہمت کو بڑھاتی ہیں۔اور امید کا دامن تھامے ہوئے ہیں۔ زندگی؛ کی کشتی میں بادبانوں کو آنچل تصور کرنا۔ اس آنچل میں مہک کا پاکیزہ ہونا جذبات کی شدت کو بیان کرتے ہیں جب جذبات پاکیزہ ہونگے اور ان میں سچائی اور مہک باقی ہوگی تو یقیناً جواب تک اپنی انا سے غرور میں تھے یعنی ہواؤں والے اب زندگی کی کشتی میں اتر آئے ہیں اسی طرح اگلے اشعار میں سنہری ریت یعنی سنہرے خواب اور گھر کو بہشت بنائے رکھنے کی پرزور کوشش اور زندگی کے خارزار دکھ درد کو اپنے دل سے نکال کر ایک نازک لڑکی پھر سے گلشن حیات میں برگ حنا (یعنی امید اور خوشی کی طرف اشارہ ہے) چنے گی یعنی سب کچھ بھلا کر زندگی خوشی سے گذارے گی۔ حنا غزل کے پیش لفظ (سرخ رو) میں لکھتی ہیں:

> ''سچ تو یہ ہے کہ پیار درد اور احساس کے عکس کو جذب کرنے کی تمنا ہو جائے تو دل ودماغ میں ایک شعور پھیل جاتا ہے اور زبان سے شعور کی بوندیں گرنے لگتی ہیں۔ یہی شعور شعر سے لہجے کی صداقت بن جاتا ہے''۔

ایسے ہی شعور کو عشق سے تعبیر کیا گیا ہے جب شاعری قوتِ عشق سے لبریز ہو جاتی ہے تو انسانی تجربات سے حاصل شدہ کیفیات کی آماجگاہ بن جاتی ہے اور وہ اپنا موضوع سخن محبوب کو بناتی

ہے۔ جہاں اسکا محبوب ہی ان کا سب کچھ ہوتا ہے۔اپنے محبوب کو صغریٰ عالم نے کچھ اس طرح تراشا ہے۔

تیری ہی بندگی میں سدا بھٹکتی رہی	اب تو غم جہاں کے وہ بادل بھی چھٹ گئے
سجالوں آ میں تجھے قلب و جاں میں اپنی	کہ انتہائے بہاراں بھی بانکپن میں رہے
ہر طرف پھول کھلے جاتے ہیں صغریٰ اب کے	اب کے گلشن میں تیرا نام کھلا ہو جیسے
خواہش تو نہیں مجھ کو کسی تاج محل کی	یادوں کے گھروندے ہی بنانے کے لئے آ

ان اشعار میں فطرت خواتین ان کے تجربات و مشاہدات کی بہترین عکاسی ملتی ہے۔ جیسے تیری ہی بندگی، یعنی محبوب کی وفا اور اسکی یاد ہی میں اسقدر ڈوبتی رہی کہ دنیا کے غم درد و دکھ بھی ہلکے ہو گئے ۔ وہ اپنے محبوب کو اپنے قلب و جگر میں اسطرح بسانا چاہتی ہیں خوشی کی انتہا یعنی انتہائے بہاراں میں بھی محبوب کی خصوصیت اسکا بانکپن موجود رہے۔ خواتین اکثر اپنے محبوب کو سرخرو اور بلندی پر دیکھنا چاہتی ہیں۔ اور اسکی یاد کو اسقدر سینے سے لگائے ہوتی ہیں کہ جب بھی نطق زبان پر محبوب کا نام آئے تو سارا گلشن پھولوں سے لدا نظر آتا ہے۔ محبوب کے ساتھ گذارے ہوئے ان لمحوں کی اچھی یادیں بنانے کی خواہش میں انہیں نہ تاج محل کی خواہش اور نہ کسی اور چیز کی بس محبوب کی یادوں کے گھروندے بنانا چاہتی ہیں ۔ یہ مخصوص جذبات جو خواتین کے یہاں زیادہ دیکھنے کو ملتے ہیں اور اس شعر کی لطافت دیکھئے محبوب کے وصل کیلئے کوئی لازمی شرط نہیں جس طرح پھول کا کھلنا فطری ہے اسی طرح محبوب کا ملنا بھی فطری ہے

روز کھلتے ہیں کسی وعدۂ جاناں کے بغیر	پھول موسم سے نہیں کرتے ہیں پیماں جانم

صغریٰ عالم کی شاعری میں خواتین کے مسائل اور انکے جذبات واحساسات اور انکی نفسیات انکے عشقیہ پہلو پر بھی گہری نظر ہے۔ان کی شاعری میں نسائی حسیت اور خواتین کے مختلف النوع مسائل کی دھنک نظر آتی ہے۔ اور جذبات کی مہک بھی متاثر کرتی ہے۔ جس میں لڑکیوں، دوشیزاؤں اور خواتین کے جذبات کی بہترین عکاسی ملتی ہے۔

دل ہی دل میں رولوں میں	بھید نہ اپنا کھولوں میں
خنجر برجھی تر شولا ں	میٹھی بولی بولوں میں
چاند گگن سے لائے جو	اسکو ساجن بولوں میں
میرے دن میں تو ہی تو	تیری شب میں سولوں میں

صغریٰ عالم کی شاعری میں ماں کی محبت اور بے پناہ عقیدت اور اسکی عظمت کے پھولوں کی مہک تازہ ہے۔ انکی عقیدت کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنی ماں کی باتوں کو آیت خوش بیانی کو تلاوت تصور کرتی ہیں اور اپنی ماں کو مکہ اور مدینہ جیسی مقدس پاکیزہ سمجھتی ہیں:

آتی ہے یاد ذے / سچ ہی کہا تھا میں / فردوس ہے زمیں پر / مکہ کہوں جسے میں یہ کہہ لوں میں مدینہ / بھلایا ہی نہیں جاتا' سے / مدینہ ماں کا آنچل تھا / شفقت طفل ناداں پر / طواف زندگی جیسی / بھلایا ہی نہیں جاتا ماں کا تصور ذے / ہر ایک بات ہے جس کی بصورت آیت / وہ صبح وشام تلاوت ہے خوش بیاں جیسی / بہت ملیں گے یہاں غم گسار و چارہ گر / نہیں مثال کوئی اس کی مہرباں جیسی / ام الکتاب میری ذے /

ماں کی ممتا اور اسکی عظمت جو عورت کو عظیم تر بناتی ہے اور اس قسم کے جذبات عورت ہی کا خاصہ ہے جس میں شدت سے محبت اور ممتا نظر آتی ہے۔ یعنی جس کی مستحسن عورت ایک ماں ہے۔ یوں تو ماں کی عظمت اور اسکا تصور پہلے سے ہی شاعری میں ہوتا رہا ہے لیکن صغریٰ عالم کا انداز منفرد ہے جس میں ان کے پاکیزہ جذبات اور عقیدت بلندی پر نظر آتے ہیں۔ کبھی وہ اپنی ماں کیلئے صحیفہ کا لفظ استعمال کرتی ہیں تو کبھی آیت تو کبھی مکہ اور مدینہ تو کبھی فردوس کہتی ہیں کیونکہ وہ اس جذبہ سے گذر چکی ہیں اور بہتر انداز میں پیش کرانے کا ہنر رکھتی ہیں اور یہی نقطہ نظر تانیثت میں شمار کیا جاتا ہے۔

اکثر ہم یہی سوچتے ہیں کہ عموماً حیدرآباد کرناٹک کا ادب برصغیر کے ادب سے بہت دور یا پچھڑا ہوا ہے۔ دو ایک کو چھوڑ کر بہت سارے ادیب وشعراء پس پردہ ہیں انہیں ظاہر کرنے کی ضرورت ہے یعنی وہ شہرت انہیں نصیب نہیں ہوئی جس کے وہ مستحق ہیں۔ دراصل ہمارے

یہاں تنقیدی شعور کی کمی ہے اس سرزمین کو اگر سچے اور اچھے نقاد مل جائیں تو بعید نہیں کہ بہت سارے شاعر و ادیب برصغیر بلکہ دنیا میں مشہور و مقبول ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح اگر ہم صغریٰ عالم کی شاعری کا بغور مطالعہ کریں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شاعری بھی کشور ناہید اور پروین شاکر سے کسی حد تک کم نہیں بلکہ ان کے یہاں پروین شاکر کا اثر گہرا نظر آتا ہے۔

اچھے فنکار کے یہاں اپنے تجربات و مشاہدات کی دولت تو ہوتی ہے جو جذبات ان کے ہوتے ہوئے دوسروں کے خیالات کی ترجمانی کرنے لگتے ہیں۔ صغریٰ عالم خواتین کی نفسیات کے تاروں کو اسطرح چھیڑتی ہیں کہ کسی جلترنگ کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جیسے

تمہیں ہم چھپا کے دل آرزو میں   حجابوں میں اے محترم دیکھتے ہیں

رات یادوں کی تلاوت میں بھی مصروف رہی   رحل ہاتھوں کی بنا کر ہی یہ چہرا رکھا

اشکوں کی ہر اک رسم نبھانے کے لئے   صندل کے کٹوروں میں انہیں گھول رہے ہیں

رنگ حنا کتاب تبسم کی روشنی   رنگینیٔ مزاج مرے ہم سفر میں ہے

ہم نے پازیب کی گرداب بنا ڈالی ہے   ہاتھ کنگن میں بھی گردشِ دورانِ جانم

کبھی کبھی نئی تہذیب نئے معاشرہ اور حالات کے تجربات متحرک بھی ہوتے ہیں اور تلخ بھی ایسے میں تخلیق کار فنکار یا شاعر کے جذبات و احساسات کا اظہارِ بیان تیکھے انداز اور طنزیہ تیور لیے قاری تک پہنچتے ہیں اور احتجاجی صورت اختیار کر کے اپنی بات منوانے کی کوشش کرتے ہیں اور یہی جذبے مخصوص خواتین کے مسائل اور ان کے جذبات کی عکاسی کریں تو تانیثت کہلاتے ہیں ایسے جذبات بھی صغریٰ عالم کی شاعری میں واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ ◻◻

سمینار رپورٹ

اطہر معز

(ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو و فارسی، گلبرگہ یونیورسٹی گلبرگہ)

حلیم اطہر

(متعلم ایم۔اے سالِ آخر، شعبہ اردو و فارسی، گلبرگہ یونیورسٹی گلبرگہ)

شعبہ اُردو و فارسی گلبرگہ یونیورسٹی گلبرگہ کی جانب سے دو روزہ ادبی کانفرنس بعنوان ''حیدرآباد کرناٹک کا ادب'' بمقام بسوادی شرن ساہتیہ ہال کنٹرابلڈنگ، گلبرگہ یونیورسٹی میں 13 اور 14 نومبر 2008 منعقد کیا گیا۔ پروفیسر پرتاپ سنگھ تیواری رجسٹرار گلبرگہ یونیورسٹی کی صدارت میں افتتاحی جلسہ منعقد ہوا۔ اس جلسہ میں جناب خلیل مامون (صدر نشین کرناٹک اردو اکیڈمی بنگلور)، جناب وہاب عندلیب (ڈائریکٹر خواجہ ایجوکیشن سوسائٹی، گلبرگہ) ڈاکٹر سید مجیب الرحمٰن (سابق صدر انجمن ترقی اردو گلبرگہ)، پروفیسر بسوارج سبرد (ڈین فکلٹی آف آرٹس، گلبرگہ یونیورسٹی، گلبرگہ) اور ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ انعامدار (ڈپٹی کمشنر کمرشیل ٹیکس، گلبرگہ) بحیثیت مہمانانِ خصوصی شرکت فرمائی۔ عبدالرحیم (متعلم ایم۔ اے۔ سالِ آخر) کی قرات کلام پاک اور طیب یعقوبی (موظف، ڈپٹی ڈائریکٹر محکمہ اغذیات) کے نذرانہ نعت سے جلسہ کا آغاز ہوا۔ پروفیسر عبدالحمید اکبر (صدر شعبہ اردو و فارسی، گلبرگہ یونیورسٹی، گلبرگہ) نے افتتاحیہ، تعارفی و خیر مقدمی خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ادبی لحاظ سے حیدرآباد کرناٹک کا علاقہ نہایت زرخیز رہا ہے اور اسی لئے ادبی دنیا میں اس کی اہمیت مسلم ہے۔ جس کے پیش نظر بہت دنوں سے یہ ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ حیدرآباد کرناٹک کے اُردو ادب پر اس طرح کی کوئی کانفرنس منعقد کی جائے اور آج یہ خواب شرمندہ تعبیر ہونے جارہا ہے۔ اس دو روزہ کانفرنس میں پڑھے جانے والے تمام

مقالات کو کتابی شکل دی جائیگی جو ایم۔اے۔ کے نصاب میں شامل حیدر آباد کرناٹک کے ادب
کے مضمون کے لئے کافی معاون ثابت ہوگا۔ پروفیسر عبدالحمید اکبر نے صدر جلسہ، مہمانان خصوصی
اور مہمانان کا تعارف کروایا اور اسکے بعد گلپوشی و شال پوشی کا مرحلہ طئے پایا۔ بعد ازاں شمع روشن
کر کے جلسہ کا باقاعدہ آغاز عمل میں آیا۔ وہاب عندلیب نے اپنے کلیدی خطبہ میں کہا کہ علاقہ
حیدرآباد کرناٹک کی ایک ادبی تاریخ ہے۔ یہ علاقہ ادب کا زرخیز علاقہ ہے۔ انہوں نے مزید کہا
کہ اُردو کو عام کرنا ہی اس کو زندہ رکھنے کا واحد راستہ ہے۔ مہمان خصوصی جناب خلیل مامون نے کہا
کہ ایسی کانفرنس کے ذریعہ ادبی سرمایہ یکجا کیا جا سکتا ہے اس کے ساتھ ہی ثقافتی وتمدنی سرمایہ جو
کھوگیا ہے اس کا احیاء بھی کیا جا سکتا ہے ایسی کوششوں میں مزید تیزی لانی ہوگی۔ انہوں نے
حیدرآباد کرناٹک کے اُردو ادب کے تعلق سے مختلف ادبا، شعراء سے مواد جمع کر کے محفوظ کئے
جانے کے اس عمل کو سراہا اور کہا کہ اس سے نئی نسل اس علاقہ کے ادبی نمائندوں اور ان کی خدمات
سے واقف ہوگی۔ انہوں نے اُردو زبان کو معاشی سطح سے جوڑنے کی ضرورت پر بھی زور دیا۔
ڈاکٹر مجیب الرحمن، ڈاکٹر ایس۔ایم۔انعامدار اور پروفیسر بسوراج سبر دنے بھی اس موقع پر اظہار
خیال کیا اور صدر شعبہ کو مبارکباد پیش کی۔، پرتاپ سنگھ تیواری رجسٹرار گلبرگہ یونیورسٹی نے بھی
صدارتی خطاب میں دوروزہ کانفرنس کے انعقاد پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے ذمہ داران کو
مبارکباد پیش کی اور اُردو کی آفاقیت کا ذکر کرتے ہوئے زبان کو کسی خاص قوم و مذہب سے جوڑنے
کی مخالفت کی اور اُردو ادب کا دوسری زبانوں میں ترجمہ اور دوسری زبانوں کے ادب کا اُردو زبان
میں ترجمہ پر زور دیا۔ افتتاحی جلسہ کی نظامت کا فریضہ قاضی شکیل الدین (ریسرچ اسکالر) نے ادا
کیا اور جناب عبدالرب اُستاد (لیکچرار، شعبہ اردو و فارسی) کے شکریہ پر افتتاحی جلسہ کا اختتام عمل
میں آیا۔

سمینار کا اولین اجلاس جناب وہاب عندلیب اور ڈاکٹر حشمت فاتحہ خوانی (صدر شعبہ
اردو، کرناٹک کالج بیدر) کی صدارت میں شروع ہوا۔ فریدہ بیگم (ریسرچ اسکالر) نے

بعنوان ''صغریٰ عالم کی شاعری تانیثیت کے تناظر میں''، بی بی رضا خاتون (لیکچرار شعبہ اردو مولانا آزاد اردو یونیورسٹی) نے بعنوان ''حیدرآباد کرناٹک کی خواتین قلمکار''، کوثر فاطمہ (لیکچرار، گورنمنٹ کالج، گلبرگہ) نے بعنوان ''حیدرآباد کرناٹک اُردو ادب میں تحریکات ور جحانات، ڈاکٹر کوثر پروین (رکن انجمن ترقی اردو، گلبرگہ) نے بعنوان ''حیدرآباد کرناٹک میں اُردو افسانہ (ترسیل و تفہیم)'' اور ڈاکٹر جلیل تنویر (موظف صدر شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج، گلبرگہ) نے بعنوان ''حیدرآباد کرناٹک کے اُردو ادب میں ترقی پسند تحریک کے اثرات'' پر مقالے پیش کئے۔ وقت کی کمی کے سبب ہر مقالہ نگار نے مقالے کا مختصر خلاصہ ہی پیش کیا جبکہ مکمل مقالہ تحریری شکل میں محفوظ کرادیا جس کو کانفرنس کے بعد کتابی شکل دی جائیگی۔ مقالے پیش کئے جانے کے بعد صدور جلسہ نے بھی اظہار خیال کیا۔ اجلاس اول میں قاضی شکیل الدین (ریسرچ اسکالر) نے نظامت کے فرائض انجام دئے۔

سہ پہر تین بجے اجلاس دوم کا آغاز ڈاکٹر اکرام باگ (موظف صدر شعبہ اردو، یس۔یس۔کے۔بی، کالج بسواکلیان) اور انجنیئر اکرم نقاش (رکن، انجمن ترقی اردو، گلبرگہ) کی صدارت میں شروع ہوا۔ اس اجلاس میں جناب افتخار الدین اختر (لیکچرار، یس۔بی۔سی آرٹس، کالج ہمنا آباد) نے نظامت کی ذمہ داری نبھائی۔ اجلاس دوم میں ڈاکٹر انجم آراء (جز وقتی لیکچرار، پی۔جی۔سنٹر۔بیدر) نے بعنوان ''ضلع بیدر میں شعر وادب 1956ء کے بعد'' ڈاکٹر پیرزادہ فہیم الدین (لیکچرار، وی۔ین کالج، ہاسپیٹ) نے بعنوان ''حیدرآباد کرناٹک کے طنز و مزاح نگار''، ڈاکٹر خلیل مجاہد (لیکچرار، ڈاکٹر بی۔آر امبیڈکر کالج، ہلی کھیڑ) نے بعنوان ''حیدرآباد کرناٹک میں اُردو زبان و تعلیم''، ڈاکٹر حشمت فاتحہ خوانی (صدر شعبہ اردو، کرناٹک کالج بیدر) نے بعنوان ''ضلع بیدر میں شعر و ادب اور صحافت اور جناب عبدالرب اُستاد (لیکچرار، شعبہ اردو و فارسی) نے بعنوان ''حیدرآباد کرناٹک میں اُردو تنقید (منتخب تنقید نگار) پر مقالے پیش کئے۔ مقالوں کی پیش کشی کے بعد صدور جلسہ نے اظہار خیال کیا اور دوروزہ کانفرنس کے پہلے دن

کی کاروائی اختتام کو پہنچی۔

دوسرے دن کا اجلاس اول 14 نومبر کو قدرے تاخیر سے شروع ہوا جس میں 5 مقالہ نگاران نے اپنے مقالے پڑھے۔ڈاکٹر جلیل تنویر (سابق صدر شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج، گلبرگہ) اور ڈاکٹر وحید انجم (صدر شعبہ اردو، الند، پی۔یو کالج الند) کی صدارت میں منعقدہ اس اجلاس میں ڈاکٹر ہاجرہ پروین (لیکچرار، سی۔کیاب ڈگری کالج، بیجاپور) نے بعنوان ''حیدرآباد کرناٹک میں اُردو افسانہ''، ڈاکٹر منظور احمد دکنی (گیسٹ لکچرر شعبہ اُردو و فارسی، گلبرگہ یونیورسٹی) نے بعنوان ''اُردو رباعیات کی روایت حیدرآباد کرناٹک کے حوالے سے''، جناب شمس الدین حکیم (ریسرچ اسکالر، حیدرآباد یونیورسٹی) نے بعنوان ''ضلع بیدر میں اردو افسانہ نگاری'' اور ڈاکٹر فوزیہ چودھری (لیکچرار مہارانی کالج، بنگلور) نے بعنوان ''حیدرآباد کرناٹک کی خاکہ نگاری'' پر اپنے مقالے پیش کئے۔ان مقالہ نگاروں نے بھی اختصار سے کام لیا اور اپنے اپنے موضوعات سے خوب انصاف کیا۔صدر جلسہ ڈاکٹر وحید انجم نے مقالہ نگاروں کو موضوع کو پوری طرح مطالعہ کرتے ہوئے لکھنے کا مشورہ دیا۔انہوں نے بالواسطہ طور پر خود کو بعض مقالہ نگاروں کی جانب سے نظر انداز کرنے پر برسخت تنقید کی۔دوسرے صدر ڈاکٹر جلیل تنویر نے مقالہ نگاروں کو مبارکباد پیش کی اور انہیں مزید مطالعہ کرنے کا مشورہ دیا۔عبدالحکیم ساغر (ریسرچ اسکالر) نے اجلاس کی کارروائی بحسن وخوبی چلائی۔

چوتھا اجلاس 5 منٹ کے مختصر سے وقفہ کے بعد شروع ہوا۔اس اجلاس کی صدارت محترمہ ڈاکٹر شمیم ثریا (موظف پرنسپال بی۔بی۔رضا ڈگری کالج، گلبرگہ) اور جناب امجد جاوید (لیکچرار، نیشنل پی یو کالج، گلبرگہ) نے کی۔اس اجلاس میں۔جناب ناظم خلیلی (رائچور) نے بعنوان ''ضلع رائچور کا ادب''، جناب واجد اختر صدیقی (ریسرچ اسکالر میسور یونیورسٹی) نے بعنوان ''گلبرگہ میں اُردو نثر''، جناب عبدالحکیم ساغر (ریسرچ اسکالر) نے بعنوان ''حیدرآباد کرناٹک کے ادب میں الیکٹرانک میڈیا کا رول'' اور محترمہ ریشما بیگم (ریسرچ اسکالر) نے

بعنوان ''حیدرآباد کرناٹک میں اُردو نعت گوئی پر مقالے پڑھے۔ جناب امجد جاوید نے سمینار کے انعقاد پر شعبہ اُردو و فارسی کو مبارکباد دی اور اس سلسلے کو مزید جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔ انہوں نے مقالہ نگاروں کو مشورہ دیا کہ وہ ادب لکھتے وقت تکلفات کو بالائے طاق رکھیں۔ ڈاکٹر شمیم ثریا نے تیسرے اجلاس میں سامعین کی جانب سے ہو رہی مسلسل رخنہ اندازی پر سرزنش کرتے ہوئے کہا کہ سمیناروں میں اس طرح کا عمل ٹھیک نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ 1949 کے بعد گلبرگہ کا ادب مفقود ہے اسے ڈھونڈ نکالنا محققین کا کام ہے۔ اطہر معز (ریسرچ اسکالر) نے اجلاس کی کارروائی چلائی اور مہمانوں کا تعارف و خیر مقدم اور شکریہ ادا کیا۔

دوروزہ سمینار کا اختتامی اجلاس سہ پہر تین بجے شروع ہوا۔ اس اجلاس کے مہمانان خصوصی جناب عبدالرحیم آرزو (ایڈوکیٹ و سابق سنڈیکیٹ رکن، گلبرگہ یونیورسٹی، گلبرگہ) و جناب عبدالحمید (صدر نشین فاران ایجوکیشن سوسائٹی، گلبرگہ) اور جلسہ کی صدارت ملیکارجن مٹھ (رجسٹرار امتحانات، گلبرگہ یونیورسٹی، گلبرگہ) نے فرمائی۔ جناب عبدالرحیم آرزو نے شعبہ اُردو و فارسی کے ساتھ اپنی دیرینہ رفاقت کا ذکر کیا اور مختلف صدور کے ساتھ اپنے مراسم تذکرہ کرتے ہوئے ماضی کی یادیں تازہ کردیں۔ جناب عبدالحمید فاران نے شعبہ اُردو و فارسی اور صدر شعبہ کو ریاستی سطح پر یہ سمینار منعقد کرنے پر مبارکباد دی اور توقع ظاہر کی کہ مستقبل میں بھی اس قسم کے سمینار منعقد کئے جائیں گے۔ صدر اجلاس جناب ملیکارجن مٹھ رجسٹرار شعبہ امتحانات گلبرگہ یونیورسٹی نے اپنے صدارتی خطبہ میں کہا کہ اُردو ایک نہایت شیریں و میٹھی زبان ہے جو ایک مرتبہ اس کو سنتا ہے وہ اس کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے ملک کی تہذیب و تمدن کو اس زبان نے بہت کچھ دیا ہے۔ انہوں نے مغلوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ انہوں نے ہندوستان کو اُردو زبان، غالب اور تاج محل جیسی لافانی نعمتیں دی ہیں۔ تمام ریسرچ اسکالرز اور مقالہ نگاران میں سرٹی فیکٹ تقسیم کئے گئے۔ قبل ازیں صدر شعبہ اُردو و فارسی پروفیسر عبدالحمید اکبر نے اپنے افتتاحی کلمات میں اس سمینار اور موضوع کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ حیدرآباد

کرناٹک علاقہ میں لکھا گیا ادب عالمی سطح پر اپنی شناخت بنا چکا ہے۔ آپ نے کانفرنس میں شریک تمام افراد کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا اور کانفرنس کی کامیابی پر بارگاہ الٰہی میں بھی تشکرانہ جذبات کا نذرانہ پیش کیا۔ جناب افتخار الدین اختر (ریسرچ اسکالر) نے نظامت کے فرائض انجام دئے۔ بعدازاں معروف غزل خواں جناب طیب یعقوبی نے ساز پر غزلیں سنائیں اور شعبہ کے طلبہ نے بھی اپنی غزلیں پیش کیں۔ جناب عبدالرب اُستاد کے شکریہ پر اس کانفرنس کا اختتام عمل میں آیا۔ ☐☐

The Academic , Cultural & Literary Magazine

GESU-E-URDU

(Hyderabad Karnatak Ka Adab: Seminar Number)

Cheif Editor

Prof. M.A Hameed Akber

Dean Faculty of Arts & Chairman
Dept. of Urdu & Persian,GUG

Editor

Dr. Manzoor Ahmed Deccani

G.- Faculty, Dept. of Urdu & Persian,GUG

Department of Urdu & Persian , Gulbarga University, Gulbarga

2011

تصاویر
محمد ایاز احمد بن عقیل، ایاز آرٹس، گلبرگہ
عقابی

شمع روشن کرتے ہوئے جناب خلیل مامون ساتھ میں وہاب وعندلیب، پروفیسر پرتاب سنگھ تیواری
اور سید مجیب الرحمٰن

پروفیسر پرتاب سنگھ تیواری شمع روشن کرتے ہوئے دائیں جناب سید مجیب الرحمٰن
اور بائیں جناب خلیل مامون

کانفرنس ''حیدرآباد کرناٹک کا ادب'' میں پروفیسر عبدالحمید اکبر (صدر شعبۂ اردو)
پروفیسر پرتاب سنگھ تیواری (رجسٹرار) کی گلپوشی و شال پوشی کرتے ہوئے

کانفرنس کے افتتاحی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے جناب خلیل مامون

کانفرنس کے افتتاحی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر سید مجیب الرحمٰن، شہ نشین پر بائیں سے
جناب عبدالرب استاد، ڈاکٹر ایس یم انعامدار، جناب وہاب عندلیب، جناب خلیل مامون

کانفرنس کا ایک منظر: جناب خلیل مامون، ڈاکٹر ایس ایم انعامدار اور جناب طیب یعقوبی محو گفتگو

شرکائے کانفرنس: انجینئر اکرم نقاش، ڈاکٹر فہیم الدین، جناب امجد جاوید، جناب عبدالحمید فاران
ڈاکٹر حشمت علی، ڈاکٹر اکرام باگ اور ڈاکٹر جلیل تنویر وغیرہ

پروفیسر عبدالحمید اکبر مائک پر، بائیں سے پروفیسر جلیل تنویر، ڈاکٹر وحید انجم اور
جناب شمس الدین حکیم

مقالہ خوانی کرتے ہوئے ڈاکٹر منظور احمد دکنی، بائیں سے جناب شمس الدین حکیم، ڈاکٹر وحید انجم
اور ڈاکٹر جلیل تنویر

سیمینار کا ایک اجلاس: دائیں سے ریشمہ بیگم، ڈاکٹر شمیم ثریا، جناب امجد جاوید، جناب ناظم خلیلی
جناب واجد اختر صدیقی، جناب حکیم ساغر، مائک پر جناب افتخار الدین اختر

ڈاکٹر پیرزادہ فہیم الدین خطاب کرتے ہوئے دائیں سے افتخار الدین اختر، جناب عبدالرحیم آرزو
جناب ملیکا ارجن مٹھ (رجسٹرار ایوالویشن)، جناب عبدالحمید فاران، پروفیسر عبدالحمید اکبر وغیرہ

جناب عبدالرب استاد شکریہ ادا کرتے ہوئے دائیں سے قاضی شکیل، پروفیسر عبدالحمید اکبر،
سید مجیب الرحمٰن، پروفیسر پرتاب سنگھ تیواری، جناب خلیل مامون اور جناب وہاب عندلیب

ڈاکٹر وحید انجم خطاب کرتے ہوئے دائیں سے جناب شمس الدین حکیم اور ڈاکٹر منظور احمد دکنی

مقالہ خوانی کرتے ہوئے جناب ناظم خلیلی، دائیں سے جناب امجد جاوید، جناب واجد اختر صدیقی
اور جناب حکیم ساغر

گروپ فوٹو: دائیں سے ڈاکٹر منظور احمد دکنی، جناب عبدالرب استاد، پروفیسر عبدالحمید اکبر
اور بسوراج پرٹ (کلرک)، ایستادہ طالبات شعبۂ اردو و فارسی گلبرگہ یونیورسٹی گلبرگہ

اساتذہ، ریسرچ اسکالرس اور طلبہ و طالبات (گروپ فوٹو)
شعبۂ اردو و فارسی گلبرگہ یونیورسٹی گلبرگہ

کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے پروفیسر عبدالحمید اکبر، صدر شعبۂ اردو و فارسی گلبرگہ یونیورسٹی گلبرگہ

مجتبیٰ حسین کو اعزازی ڈاکٹریٹ تفویض ہونے پر شعبۂ اردو کی جانب سے تہنیتی تقریب
مائک پر ڈاکٹر ماجد داغی، دائیں سے سید مجیب الرحمٰن، جناب وہاب عندلیب، جناب مجتبیٰ حسین
اور پروفیسر عبدالحمید اکبر

بائیں سے پروفیسر ایس ایل ہیرے مٹھ (رجسٹرار)، پروفیسر مولی منی (سابق وائس چانسلر)
پروفیسر ای ٹیپا واہلیہ (وائس چانسلر)

رجسٹرار (ایوالویشن) گلبرگہ یونیورسٹی گلبرگہ خطاب کرتے ہوئے

بائیں سے: پروفیسر عبدالحمید اکبر، ڈاکٹر پریملا امبیکر (شعبۂ ہندی)، پروفیسر راجنالکر
(فائنانس آفیسر) اور پروفیسر خالد سعید (مانو، حیدرآباد)